مایہ ناز ترک ادیبہ کا ناول
انجامِ بہاراں
عدالت آعولو
مترجم: ہما انور

مایہ ناز ترک ادیبہ کا ناول

انجامِ بہاراں

عدالت آعولو

مترجم: ہما انور

جمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

• نام کتاب: انجام بہاراں • مصنفہ: عدالت آغولو

• مترجم: ہما انور • سرورق: ریحان انور

• اشاعت: جنوری 2013ء • ناشر: جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-9739-43-9

قیمت -/450 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

JUMHOORI PUBLICATIONS

2Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan.
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail: jumhoori@yahoo.com
www.jumhooripublications.com

Adalet Ağaoğlu

Summer's End

(Yazsonu-1980)

This book is published with the arrangements of ONK Agency Ltd.

Urdu Translation "Anjaam-e-Baharan"
By: Huma Anwar

Published by Jumhoori Publications - Pakistan
January 2013

Publisher : Farrukh Sohail Goindi

عدالت آ غولو

عدالت آ غولو (Adalet Agaoğlu) (پیدائش 1929ء) ترک ناول نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ وہ انقرہ صوبے کے ایک دیہی شہر نلی حان (Nallıhan) میں پیدا ہوئیں۔ ادیب، ڈرامہ نگار اور انسانی حقوق کی علم بردار عدالت آ غولو، ترکی کے معروف ترین ناول نگاروں میں سے ہیں۔ کئی ادبی انعامات کے علاوہ، انہیں اعزازی پی ایچ ڈی ڈگریاں اور دیگر اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ان کے اب تک آٹھ ناول، افسانوں کے مجموعے، مضامین کے چھے مجموعے اور یادداشتیں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ریڈیو اور تھیٹر کے لیے 10 سے زائد ڈرامے بھی تحریر کر چکی ہیں۔ ان کی تحریروں کے دنیا کی بیشتر زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ انہیں ترکی کا اعلیٰ اعزاز ''ری پبلکس گرینڈ پرائز فار کلچر اینڈ آرٹس'' بھی مل چکا ہے۔

عدالت آ غولو نے فرنچ لینگویج اور لٹریچر میں انقرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی اور ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھ کر ادب کی دنیا میں قدم رکھا۔ بعد میں وہ خالص فکشن کی تخلیق کے لیے ناول نگاری کی طرف آ گئیں۔ اپنے ناولوں میں عدالت نے سماجی تبدیلی کے عمل کے دوران انٹی لیکچوئل کو درپیش مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس تبدیلی کے عمل میں متوسط طبقے کا رویہ کیسے بدلتا ہے۔ انہوں نے 1970ء کی دہائی کے معاشی مشکلات اور سیاسی انتشار کا شکار ترکی کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ منفرد اسلوبِ تحریر کی حامل ہیں جوان کے ڈرامہ نگاری کے ہنر کی بھی دین ہے۔ ان کی تحریر کردہ فکشن میں ان کے تخلیق کیے گئے کردار وقت میں آگے اور پیچھے جاتے ہیں۔ وہ کہانی کے بیان کے لیے عموماً شعور کی رَو کا سہارا لیتی ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں سماجی پریشر، صنفی تعصب اور جدیدیت کی جانب سفر پر سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی طاقتوں کے اثرات کو بھی موضوع بناتی ہیں۔

زیر نظر کتاب، ان کے 1980ء میں شائع شدہ ناول "Yazsonu" کا اردو ترجمہ ہے۔

I

بے چینی سے وہ تند و تیز طوفان کی تلاش میں ہے
یوں جیسے طوفان اسے چین بخش ہی سکے گا۔

---Lermontov

ہر شے کو وہی ملتا ہے جس کی وہ حق دار ہے یا جو اُس کے لیے صحیح ہے، جو اس کے لیے سچ ہے۔
ایک آواز میرے اندر دہراتی ہے: ہر شے کو وہ ملتا ہے جس کی وہ حق دار ہے۔ ہر شے کو وہ مل ہی جاتا ہے جس کی وہ حق دار ہے......

یہ کس قسم کا سچ ہے، اس قدر پیچیدہ، یہاں وہاں بَل کھاتا ہوا، پیچ دار، ہر سمت میں اَن گنت راستے بناتا ہوا؟

کوئی جھیل میں مچھلی کی بنسی لٹکا کر کیوں بیٹھے جب کہ اسے علم ہے کہ وہاں کوئی مچھلی نہیں ہے؟
کتابیں، دستاویزات اور دریافتیں ثابت کرتی ہیں کہ کبھی ایسے لوگ ہوا کرتے تھے۔ آج بھی ایسے لوگ ضرور موجود ہوں گے۔ لیکن چوں کہ وہ اپنی زندگیاں بسر کر چکے ہیں، اس لیے ان کی زندگیاں اب تجزیہ کرنے کے قابل ہیں نہ ہی وہ ایسا کرنے کے لیے کوئی زور دیتے ہیں۔
جہاں تک میرا تعلق ہے، کسی بے مچھلی جھیل میں بنسی ڈالنا در کنار، میں تو اس کے کنارے

کنارے گھومنے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوں۔ میں اپنے سارے منصوبے پیچھے چھوڑ چکی تھی حتیٰ کہ ایک ناول کا پوری طرح تیار مسوّدہ بھی۔ ایک خاموش ساحل پر خالص چھٹیاں۔ درخت کے کسی پتے، دریا کی لہر یا کیچوے کی طرح، فطرت کا ایک حصہ بننے کے لیے۔ یہ تحفہ جو میں اپنے آپ کو دینا چاہتی تھی...... اگر میں ریت میں چہرہ چھپا کر لیٹ جاتی اور اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیتی، یوں جیسے اپنی معمول کی موجودگی کے خلاف ایک بڑا سا سفید پرچم اٹھائے ہوئے...... یہ تقریباً ایک حاصل شدہ حق تھا۔ جہاں تک میرے جواز کی بات ہے، یہ یوں ہے:

''ایک روز اس سب کی وجہ سمجھ میں آجائے گی۔ راز کا پردہ جو تمام مصائب اور ناممکنات کو چھپالیتا ہے، چاک کر دیا جائے گا۔ لیکن تب تک زندگی جاری رہنی چاہیے...... وقت گزر جائے گا۔ ہم ابدیت میں ضم ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ ہمارے چہروں کے خطوط، ہماری آوازوں کا لہجہ بھی انسانی یادداشت سے مٹ جائیں گے۔ اُن کے لیے ہماری ذرّہ برابر یاد بھی باقی نہ رہ جائے گی۔ اس زمین پر ہماری نشانیاں بھی فراموش کر دی جائیں گی۔ لیکن ہمارے مصائب ہمارے بعد آنے والوں کو خوشی دلائیں گے۔ زمین پر محبت، خوشی، بربادی کا راج ہوگا۔ صرف تب ہی، آپ دیکھتے ہیں، کیا وہ جو آج زندہ ہیں، محبت، مہربانی و نوازش سے یاد کیے جائیں گے۔'' (موسیقی!......) ''کیا آپ نے سنا کہ موسیقی زندگی اور خوشی سے کس قدر بھرپور ہے؟'' (ہم غائب ہونا نہیں چاہتے۔ چاہے مستقبل کے انسان ہمارے مصائب کے بارے میں نرم خُو سوچ رکھیں، وہ جن کو وہ بالکل سمجھ نہیں سکتے، چاہے ہم اس کا خواب دیکھتے ہوں، چاہے ہم اس پر یقین رکھتے ہوں......) ''اگر ہم اس موسیقی کی آواز کچھ اور دیر سن سکیں، اگر یہ مزید کچھ دیر اسی طرح جاری رہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم بھی اپنی زندگیوں اور مصائب کا سبب جان لیں گے۔ آہ، کاش کہ ہم جان سکتے! کاش کہ ہم جان سکتے!''

سو آپ نے دیکھا، اپنے ساتھ چیخوف لیے، "Three Sisters" کی نبضیں میرے ہاتھوں میں فاختہ کے پروں کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی، میں کہتی ہوں: جہاں ہم نے اپنی عمریں بسر کی ہوں ہم ان جگہوں کو بھی غائب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے۔ اپنی خاطر بھی اُسی قدر جس قدر اُن رستوں کی خاطر جو ہم نے طے کیے، جغرافیہ جس کا ہم حصہ رہے ہیں: آہ کاش کہ ہم جان سکتے! کاش کہ ہم جان سکتے!

حال اور مستقبل میرے سامنے زندگی کے اُس حصے کے عکس کے طور پر واضح ہیں جس کا

تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اُن دنوں میں، صرف یہ ہے جو آپ دیکھتے ہیں: ہم زندہ رہیں گے۔ مزید کچھ وقت کے لیے (موسیقی!......) وہ موسیقی ہمیشہ غیر محسوس طور پر سنی جائے گی۔ یہ ہمارے قریب سے قریب تر آئے گی۔ بالکل تب جس، اس کے الگ الگ سُروں میں امتیاز کرنے کے قریب ہوں گے، ہمارے کان کچھ بھی اور سننے کے قابل نہ ہوں گے۔ ہم جاننے کے قابل ہوئے بغیر غائب ہو جائیں گے کہ ہم زندہ رہنے کا صرف ڈھونگ کر رہے تھے۔ لیکن کاش کہ ہم جان پائے ہوتے، صرف اُسی لمحے، آہ کاش کہ ہم جان پائے ہوتے!

موسیقی قریب آ رہی ہے۔ ہمارا انجام بھی......

میں نے اس موسیقی کو اتنا آسان ترین خطاب دیا ہے جو کوئی تصور کر سکتا ہو، جس کے زندہ دل سُر میں لاشعوری طور پر سن سکتی تھی اور اپنے ٹرپ کا آغاز کیا تھا۔

کوئی مچھلی پکڑنے کی بنسی ایسی جھیل میں کیوں ڈالتا، جہاں اسے علم ہے کہ کوئی مچھلی موجود نہیں اور گھنٹوں تک جھیل کنارے بیٹھ کر انتظار کرتا؟

ناول کے مسوّدے کی طرح، پیشگی کیے گئے فیصلے...... چاہے وہ ضروری ہوں یا غیر ضروری، اچھے ہوں یا برے...... یہ بھی تلاش کرو کہ خود ان کے لیے درست کیا ہے۔ وہ جگہ جہاں میں اپنی چھٹیاں منانے گئی تھی، کوئی آئے اور کہے گا:

''سب کچھ ویسے ہوتا ہے جیسے اسے ہونا چاہیے میم۔''

سمندر ہمیں پکارتے ہیں۔ ہم: وہ جو یوں جیسے زندگیاں بسر کر چکے ہیں اور وہ جو جینے کا ڈھونگ کرتے ہیں، کیا ہم شکار ہیں یا شکاری؟ میں نے اتنے یقین سے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان دونوں کے درمیان واضح رکاوٹ کھڑی کرنا یا فرق دکھانا ممکن نہیں ہے، یہ کہ اس سوال کا کوئی واحد جواب نہیں ہو سکتا، کم سے کم وقتی وقفے میں۔ یہ تصور خواب اور حقیقت، کے درمیان آتا جاتا ہے، لیکن یہ ابھی بھی قابلِ محسوس ہے۔ لمحے بھر کو۔ ہمیشہ وہ چھوٹے لمحات جو کسی بھی پیمائش میں پورے نہیں بیٹھتے، Gauge......ان لمحات میں اچانک روشنی کوندتی ہے۔ روشنی تبدیل ہوتی ہے، جس جگہ، چیز، وقت پر وہ پڑتی ہے، اسے تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ ہر اس چیز کے رنگ، شکل اور گہرائی کو مسخ کر دیتی ہے، جسے آپ جانتے ہیں، سوچتے یا تصور کرتے ہیں اور جسے روشنی کی اس فلیش سے پہلے آپ نے محسوس کیا تھا۔ یہ

آپ کے منصوبوں کو روکتی، ڈھانپتی اور مٹاتی ہے جو اس قدر واضح تھے کہ تقریباً انہیں چھوا جا سکتا تھا۔ وہ لمحہ اس طرح آتا ہے کہ اس کا اپنا وجود اس کی اپنی روشنی تلے آ جاتا ہے۔ کسی بڑی لہر کی طرح، ساحل پر موجود ہر چیز کو دھوتے ہوئے آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی ہوئی، جب یہ بالکل نئی اَن چھوئی سطح کو عقب میں چھوڑتے ہوئے پیچھے ہٹتی ہے، پہلی کسی کے برعکس۔ وہ نئی سطح کسی کے ہاتھوں یا پیروں نے ابھی چھوئی نہیں ہوتی، دوسری لہر تک ویسی ہی رہتی ہے...... روشنی کا ایک اور لمحاتی یا وقتی کوندا...... بالکل خالص اور بے داغ، اس بچے کی نگاہ کی طرح جو پہلی مرتبہ دنیا میں اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ لمحے بھر کو۔ ہماری آنکھیں اتنا کچھ دیکھ چکی ہے، اور چوں کہ وہ اتنا کچھ دیکھ چکی ہیں، وہ اب اس لامحدود خالص پن کو محسوس کرنے کی قابلیت سے محروم ہیں، اس لیے وہ مختصر ترین کوندوں میں حقیقتوں کا ادراک کرتی ہیں...... حقیقتوں میں سادہ ترین...... ایک فریب خیال کی طرح۔

ایک لمحہ۔ یہ وہی لمحہ تھا جو آپ نے دیکھا۔ کون جانتا ہے کہ پچھلے چند دنوں مین، مَیں کتنی مرتبہ موٹل کے ساتھ موجود ایک چھوٹا پرانا خالی گھر دیکھ چکی ہوں۔ تبھی لوگ اس سنسان جگہ کے ٹیرس پر گھومنا پھرنا شروع ہوئے۔ دروازے کھلتے، بند ہوتے تھے۔ کوئی پتھر کی سیڑھیوں کے ذریعے ٹیرس سے اتر کر سمندر کی جانب جاتا تھا۔ یوں تھا جیسے میں ہلکی سی ہنسی سنی ہو۔ کسی دوسرے نے گھر کے قریب بجری والی جگہ پر آگ جلانی شروع کی۔ پھر میں نے دیکھا کہ پھول، جنہیں لوگ Witch's Brooms کہتے ہیں، اچانک کھلنے لگے۔ خوشبودار، تازہ، موٹے دبیز پتّوں کے درمیان، ہلکے کاسنی اور زرد پھول، اپنی تقریباً شفاف پالش شدہ پتیوں کو موڑتے ہوئے جن پر صبح کی شبنم چمکتی تھی، آہستگی سے سورج کی جانب رخ کرتے...... باغ میں کسی نے آؤٹ ڈور شاور کا عمودی پائپ سیدھا کیا، جو ٹوٹے ہوئے نلکے کے قریب جھک گیا تھا اور اسے دوبارہ اس کی جگہ پر لگا دیا...... ہمیشہ روشنی کے اس کوندے پر۔ شاور ہیڈ سے پانی نکلنے لگا۔ بارش کے بھاری پردے تلے، میں نے ایک عورت کا خوب صورت متناسب وجود دیکھا۔ اس کی بازوؤں کو دیکھتے ہوئے، جو نہ بہت مضبوط تھیں نہ بھری ہوئی، وہ اب نوجوان نہ سمجھی جا سکتی تھی۔ وہ سبز، نیلا، نیوی اور کچھ زرد رنگ کا نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سورج کی روشنی سے سنولائی ہوئی کسی قدر کھردری اور جھریوں بھری جلد پر پانی کے قطرے بہ رہے تھے۔ اُس نے گردن تک آتے اپنے بالوں کو اونچا کر کے باندھ لیا۔ چوں کہ وہ گیلے تھے، اس لیے میں نہیں

بتا سکتی کہ وہ ہلکے بھورے رنگ کے تھے یا سنہری اور...... ہمیشہ روشنی کا وہی ایک کوندا......اس کی گردن پر دوبارہ پڑا۔اس کی پشت کا خط گہرا تھا......

آپ کیسے بتا سکتے ہیں کہ کوئی عورت، اگر وہ پانی کے پردے یا بارش سے دھلے ہوئے شیشے کے عقب میں کھڑی ہو، مسکرا رہی ہے یا کسی دکھ یا تکلیف پر آنسوؤں سے بھری ہوئی ہے؟ کیا وہ عورت مسکرا رہی تھی یا رو رہی تھی؟

ہمیشہ ایک ہی لمحہ جوں ہی میں اسے جان لینے کے جذبے میں مقید ہوئی، سب کچھ کھو چکا تھا۔ گھر میں سرگرمی ختم ہو گئی۔ باغ کے پھولوں کی طرح، شاور تلے موجود عورت، ٹیرس پر موجود لوگ، سب ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے......

بلاشبہ وہ ایک تخیل تھا۔لیکن مختلف طریقوں سے، ہر بار مختلف پوزیشنز میں ایک ہی تصویر کو بار بار ذہن میں لانے کی طرح، وہ تصویریں بھی میرے نگاہوں کے سامنے لمحہ بہ لمحہ گھومنے لگیں۔ میں فرار نہ ہو سکتی تھی اس سے۔اس کے باوجود گرد و نواح اپنی حقیقت کے ساتھ میرے سامنے ہیں، اپنی تمام تر سادگی کے ساتھ۔ یہ یہاں ہے: موٹل سے اگلا مکان، پرانا چھوٹا سا اجاڑ گھر۔ یہاں اس کا ٹیرس ہے، ڈھلان سے اترتی اس کی پتھریلی سیڑھیاں، جو ناہموار اور اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھیں۔ آؤٹ ڈور شاور کا عمودی پائپ جو جھک چکا تھا، اس کا باغ اداسی آور راکھ کے رنگ کے بے پھول Witch's Brooms سے بھرا ہوا۔شاور تلے یا ٹیرس پر بھی کوئی موجود نہیں ہے۔پتھر کی سیڑھیاں اتر کر سمندر کی جانب جاتا شخص بھی وہاں نہیں ہے، نہ ہی براؤن اور سفید نہانے کا لباس پہنے بجری والی جگہ پر آگ جلاتا شخص۔ یہ پھر صرف تخیل نہ ہو سکتا تھا۔ لمحے بھر کو مکان پر کہیں سے روشنی پڑی، ٹیرس پر، باغ پر، جہاں روشنی پڑی تھی وہاں میں بعض چیزوں کی شبیہیں دیکھ چکی تھی۔ایک فریب خیال؟

یہاں کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو اس موٹل سے جہاں میں ٹھہری ہوئی تھی، گھر کی اس جانب جاتا۔اس لیے کہ موسم کے آخری مہینے کے آخری ہفتے میں، میں واحد تھی یا ہوں جو اس موٹل میں مقیم ہے۔ وقتاً فوقتاً یہاں ایک رات کو ٹھہرنے کے لیے لوگ آتے ہیں، وہ سورج ڈھلے آتے ہیں اور دن نکلنے پر چلے جاتے ہیں......

میرا خیال ہے کہ میں پہلے مختصراً ذکر کر چکی ہوں، میں اس ساحل سمندر پر ایک سادہ سی وجہ

کے باعث آتی تھی۔ ایک خالص مکمل چھٹی۔ گوشے میں پانی کے فوارے کے سامنے جہاں مرکزی سڑک، کنیر اور پام کے درختوں کی قطاروں والی اُس سڑک سے ملتی ہے، جو موٹل کو جاتی ہے، میں نے سوچا کہ میں ٹیپ کے اُس مصرے کو پیچھے چھوڑ آئی تھی، ''کاش کہ ہم جان سکتے، کاش کہ ہم جان سکتے!''...... جو اُس وقت لوٹ آیا جب میں ریت پر غسل آفتابی کر رہی تھی، میرے باطن کا وہ ٹیپ کا بار بار استعمال ہونے والا مصرع۔ مجھے ضرورت اس بات کی تھی کہ اس ناول کو جس کا پہلے سے مسودہ لکھ رکھا تھا آگے بڑھاؤں نہ ہی ایک یا دوسری قسم کے جواب سے ''کاش ہم جان سکتے، کاش کہ ہم جان سکتے!'' کی چبھن کو کم یا ٹھنڈا کروں۔ مجھے موسم گرما کے بچ رہنے والے پُرسکون منور دنوں کی، سمندر اور خاموشی کی ضرورت ہے...... (آپ نے دیکھا، یہ کچھ کہنے والی آواز بھی میری آواز نہیں ہے۔ یہ مسلسل خود کو دہراتی ہوئی کوئی دوسری آواز ہے)۔ میرے مقصد کے لیے موزوں اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں لیے ایک چھوٹا سا سفری بیگ: نہانے کے دولباس، ایک تولیہ، میرے ٹخنوں تک پہنچتی ایک سکرٹ، ایک کنگھی، ٹوتھ برش اور دوسری چیزیں......یعنی چاہے میں پانی کے فوارے کے سامنے اپنی تمام فکریں جھاڑ چکی ہوں...... میں یقیناً یہ جانتی ہوں کہ میں، چاہے یا اَن چاہے، بیگ کے علاوہ یہاں اور کیا لائی ہوں۔ آپ اپنے جسم کے خلیے اس جگہ پر چھوڑ کر نہیں آسکتے جہاں سے آپ آئے ہیں......آپ اسے کسی گوشے میں، کہہ لیجئے کہ پانی کے کسی فوارے کے سامنے بھی نہیں جھاڑ سکتے ہیں۔ آپ ان بہت سی چیزوں کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں جواب، ایک طرزِ زندگی سے بڑھ کر، خود آپ (یا آپ کا حصہ) بن چکی ہیں اور آپ کے ماضی کے ان تمام جواہرات کو اپنے گھر پر یا اُن جگہوں پر جہاں سے آپ آئے یا گزرے ہیں، نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ چیزیں......خود آپ...... اردگرد گھومتے ہیں یا آوارہ گردی کرتے ہیں، آپ کے ساتھ ہر جگہ آتے اور جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر میری والی چیزیں تو بالکل بھی خوش گوار نہیں ہیں۔ وہ ایسے جواہرات یا زیورات ہیں جنہوں نے کبھی میرے دل کو خوش کیا نہ ہی دوسروں کی نگاہوں میں کشش حاصل کی۔ فکریں، سوالات، سوچیں...... ہوسکتا ہے جان کو آتے ہوئے......جیسا کہ لوگ کہتے ہیں۔ افسوس، صدیوں بعد جب ہمارے کھنڈرات کھود کر نکالے جائیں گے، ماہرینِ آثارِ قدیمہ ہماری صداقت کا پتا نہ لگا پائیں گے...... میں اور میری قسم، جو اُن زیورات سے مزین ہیں جس کا میں ذکر کر چکی ہوں......ہم سے پہلے موجود لوگوں کی طرف سے چھوڑی گئی پتھر،

کانسی، لوہے، تانبے، سونے، چاندی وغیرہ جیسی چیزوں کے ذریعے سے، اور ان کے لیے ہماری زندگی کی واحد نشانی یہ ہوگی کہ ہماری زندگیوں کی صداقت کو جانچا نہیں جا سکتا۔

اچھا، اگر مجھے مختصر کر کے بتانا ہو، میرا خیال تھا کہ میں کر سکوں گی...... لیکن پانی کے فوارے کے سامنے میں خود کو اپنے سوالات اور فکروں سے آزاد کر پائی تھی نہ ہی میں اپنے ناول کے بوجھ کو ترک کر پائی تھی جس کا مسوّدہ میں پہلے ہی تحریر کر چکی تھی۔

مسوّدہ کسی گرداب کی طرح میرے دماغ میں بغیر رکے چکراتا رہتا ہے، کسی وقت جھاگ اڑاتے اور کنٹرول کھوتے ہوئے اور کبھی کچھ سکڑتے پیچھے ہٹتے اور تیزی سے مجھ میں سے گزر کر غائب ہوتے...... جیسا کہ مثال کے طور پر، جب میں نے ٹیرس پر لوگوں کو دیکھا...... پھر دوبارہ میپل کے پتے سے مشابہ دوبارہ سطح پر آتے ہوئے جو بھنور یا گرداب کے بیچ گر جاتا ہے۔ یوں ہے جیسے میں اس جدوجہد میں پتے کے ساتھ ہوں، ایک لمحے کو بھنور میں گم، جب میں نے سمجھا کہ وہ ختم ہو چکا ہے، دوبارہ سطح پر آتے، مسلسل متواتر ظاہر ہوتے ہوئے۔ کبھی میں ایسا کس قدر چاہتی تھی کہ اسے اپنے ہاتھوں میں لوں، ایک ایک کر کے اس کی رگوں اور ریشوں کو الگ کروں، اور وہ جسے میں نے الگ الگ کیا ہو اُس سے پتے سے بہتر کوئی چیز بناؤں یا بُنوں...... آہ، تمنا! اور پھر وہ پتا جس کے لیے میں کسل مندی سے، حتیٰ کہ کہیں زیادہ بے معنویت کے احساس سے منتظر رہی تھی کہ بھنور کی تہ میں غائب ہو جائے، ہٹیلے پن سے غوطہ لگا کر میری طویل حسین سیروں کو برباد کرتے ہوئے میرے روشن خاموش دنوں میں واپس آ رہا تھا۔ میں نے مرضی و آمادگی سے قطعی طور پر کوشش جاری رکھی، پرانے چہروں، نئے چہروں، وقت، جگہوں، احساسات، سوچوں، رنگوں اور آوازوں کو پیچھے دھکیلنے کی جو بار بار مجھے یاد آتے یا خوف زدہ کرتے تھے۔ یہ سمندر کے قدرتی مدوجزر کی طرح نہیں تھا۔ پتا تو اضطراری طور پر آیا تھا، یہ ناگزیر تھا۔ اس کا جانا بلکہ اس کا یوں لگنا کہ جا رہا ہے، میری پُر جوش کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ پہلے ایک یا دو روز اس مسلسل جذباتی جدوجہد میں گزر گئے جو دوسروں کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں پوری طرح اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی نہ ہی ایک یا دوسری طرح ہاری۔ صرف اس ایک لمحے میں، روشنی کے پہلے کوندے پر...... وہ لمحہ جب میں نے موٹل کے ساتھ والے گھر میں کچھ لوگوں کو دیکھا تھا، کہ جب میں نے آوازیں حتیٰ کہ سسکیاں سنی تھیں...... کیا میرا پرانا

مسودہ پورے کا پورا غائب ہو گیا تھا۔ جبر کا عالم......لیکن کیا میں اس پر جبر کر رہی تھی؟ خیر، اگر میں اُس پتے کو واپس پسپا ہونے یا لوٹنے پر مجبور کر دیتی، جس کے ریشے میں نے اپنی انگلیوں میں اُلجھا رکھے تھے، تب مجھے آخر ایک گہری سکون کی سانس لینی چاہیے تھی۔ لیکن سچ اس کے برعکس ہے اور اس مرتبہ میں زیادہ شدت سے چہروں، آوازوں، ترکیبوں اور جنگی حربوں کے محاصرے میں تھی، جس سے میں مانوس نہ تھی، محبت، آرزو، آزادی......ایک حقیقی ملاپ یا اتصال۔

ہاں، ہاں، سب کچھ اپنی فطرت کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ آرزو بھی، اپنی جگہ اور ترتیب میں، اپنے وقت کے لیے درست یا بجا آرزو کی فطرت کی مطابقت میں، درست ہے۔ ہر وہ چیز جو آپ کی سوچوں کو بھرتی ہے، تقریباً مدفون رہتی ہے، تقریباً مٹی ہوئی یا محو دکھائی دیتی ہے، لیکن صرف تب جب ان خیالات کی جگہ نئے خیالات یا سوچیں لے لیں۔ اور یہ صرف کچھ دیر کے لیے ہے۔

ریزورٹ جہاں میں آئی تھی، ایک موٹل ہے جو اسی گرما کے آغاز میں بزنس کے لیے کھولا گیا تھا۔ یہ آٹھ سے دس چھوٹی چھوٹی صاف ستھری معقول عمارتوں پر مشتمل ہے۔

دیواروں، جرینیم کے پھولوں والی بالکنیوں والی یہ سرخ اینٹوں کی عمارتیں، گھاس اور پھولوں بھری اُن ڈھلانوں پر بنی ہیں جو وسیع ساحل سمندر تک جاتی ہیں۔

میں نے ڈھلان کی چوٹی پر موجود عمارت میں ایک کمرا بک کروایا تھا۔ یہاں سے ایک رنگا رنگ منظر دکھائی دیتا ہے۔ میری نگاہیں، صرف بالکل ہموار، حد نظر تک پھیلا پانی اور اس کے گرد گندم کی پکی ہوئی بالیوں کے رنگ کا ساحل ہی نہیں دیکھتی ہیں۔ میں پہاڑی چوٹیاں، صنوبر کے کہر آلود جنگلات، دُور دراز کے پہاڑ، افق میں تحلیل ہوتا پہاڑی سلسلہ، گاؤں میں موجود مینار اور کیلے کے جھنڈ بھی دیکھ سکتی ہوں۔ ایک چھوٹے سے پرانے اجاڑ گھر سے یہ بہت قریب تھا...... یا یہ بے حد قریب ہے......خاندانی البم کے آخری صفحے پر گوند سے چپکائی گئی کسی دھندلی تصویر کی طرح، میری بالکنی میں دو محرابیں، ایک بڑی اور ایک چھوٹی بنی تھیں یا بنی ہیں، درحقیقت وہ جگہ جہاں میں ٹھہری تھی، اُسے ایک کمرا کہنا ہی درست ہوگا بلکہ یہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ (دراصل مجھ پر کچھ لمحات گزرتے ہیں جب میں کل کو آج اور آج کو آنے والے کل سے اُلجھا دیتی ہوں۔ اس صورت میں وہ چیز جو وقت کی جانب اشارہ کرتی ہے کسی آلے کی سوئی کی طرح کام کرتی ہے جو زلزلہ پیما کی سوئی کی طرح نبض، دل کی

دھڑکن کے آگے پیچھے ہونے کی پیائش کرتی ہے۔ جسے ہم وقت کہتے ہیں، وہ زندہ ہے۔ اسے کسی ٹھوس شے کی طرح منجمد کر دینا، اس کی جانب اشارہ کرنے والے یا اس کی پیائش کرنے والے کو کسی ایک صیغے تک محدود کر دینے کا مطلب ہوگا خواب، حقیقت، ماضی اور مستقبل کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دینا۔ خصوصاً اب، اس لیے جب موسیقی آفاقی ہے، جب سُروں کو تقریباً میز کیا جا سکتا ہے، اُس انڈی کیٹر کو ایک واحد وقت میں رکھنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ مطالبہ کرنا کہ ہم ایسا کرتے ہیں، ہمیں دہرے مصنوعی پن میں دھکیلتا ہے۔ دوسری جانب ہم ہمیشہ ایک سے زائد صحیفوں والے وقت میں زندگی گزارتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں......) بیڈروم کو لونگ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور اس میں حتیٰ کہ ایک اچھا خاصا کچن بھی تھا۔ یقیناً ایک شاور بھی۔ میں موٹل کے سوئٹس میں سے ایک میں ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ ''میں ٹھہری ہوئی ہوں۔'' میں پہلے ہی ایسا کہہ چکی ہوں۔

میرے ایک دوست، جسے موٹل کا مالک بھی جانتا تھا، نے مجھے اس جگہ کا مشورہ دیا تھا۔ اُس نے موٹل خصوصاً ان سوئٹس کی بے حد تعریف کی تھی۔ اس نے مجھے یہ یقین بھی دلایا تھا کہ موسم کے آخری مہینے کے آخری دنوں میں ہر کوئی چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ (آہ! بتاؤں!......)

سکول شروع ہو چکے تھے۔ میرے اردگرد بچوں کا شور، تختہ نرد پر پاسہ پھینکنے کی آوازیں، ساحل سے موٹل تک چیختے چلاتے لوگ نہیں ہونے تھے، ''میری گاگلز لے آؤ اور یہاں آ جاؤ!''

میں جو واقعتاً برداشت نہیں کر سکتی وہ شور نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کو ایسا شور مستقل کرنا ہوتا ہے، یہ اونچی اونچی چیخیں مارنا، خود اپنی آوازیں سننا، اندھیرے میں تنہا رہ جانے والے بچوں کی طرح، خصوصاً حالیہ برسوں میں، میں ہر ہنسی کو ایک سسکی کے طور پر سمجھتی یا محسوس کرتی ہوں۔ اور یہ مسلسل مجھے یہ احساس دلاتی ہے کہ مجھے مدد کے لیے کسی چیز کو بچانے کے لیے بھاگنا ہوگا۔ اگرچہ میں اُس سمت میں جہاں سے ہنسی...... میرا مطلب ہے کہ سسکیوں کی آواز...... آتی ہے بھاگتی نہیں ہوں، میں بڑھتے ہوئے اختلاج کے ساتھ تکان کی تکلیف دہ حالت میں رہتی ہوں، جیسے کوئی میرے اندر، ہر جانب سے ٹھوکے دیتے ہوئے مسلسل پکار رہا ہو، ''بھاگو، بھاگو!......'' میں ہمیشہ چوکنی، تناؤ میں ہوتی ہوں، مجھے ایک Cocktail Shaker کا بڑھتا ہوا احساس ہوتا ہے۔ تینوں ڈاکٹروں نے، یوں جیسے انہوں نے باہم اتفاق کیا ہوا تھا، مجھے کہا: ریلیکس! ساحل سمندر پر ایک مکمل چھٹی (تعطیل)...... ان کی

ریلیکس! ریلیکس...... کی سسکیوں کی جانب بھاگتے ہوئے، میں نے کہا، ہاں، ہاں۔

میرا دوست ٹھیک کہتا تھا۔ صرف یہاں کی منفرد خاموشی یا فطرت کا دلکش نظارہ ہی اچھا اور خوب صورت نہیں تھا بلکہ موسم بھی، حلق سے نیچے اترتی اچھی کونیاک کی طرح، بے حد خوب صورت تھا، (کہتے ہیں کہ یہ ایام ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں)۔ جھلساتا سورج، مرطوب شدید گرمی اب سے ماضی کا حصہ ہیں۔

اس کمرے کی طرح جو میں نے بک کروایا تھا، پورا موٹل ہی اس خاصیت کا ہے جو نہ صرف میرے احساسِ حسن کے موافق ہے بلکہ آرام دہ ہونے کی میری مطلوبہ سطح کے بھی۔ تھا۔ (یہ لیجیے، داستان کہنے کے وقت ایک سفید جھنڈا لہرایا جا رہا ہے۔ نہ لہرانا بھی یقیناً ممکن نہیں۔ لیکن یہ آرام کو ترجیح دینے سے آگے جاتا ہے، یہ تعیش کے شوق میں داخل ہو جاتا ہے)۔

میں اب اس عمر میں ہوں جب میں نے ہر طرف آرام کی ایک خاص سطح اور ان چیزوں کی تلاش شروع کر دی ہے، جن کی میں عادی ہوں۔ غیریت لیے، باتکلف، بے کیف اور نہ اچھے اور نہ ہی زیادہ برے ہوٹلوں کے ایک بیڈ اور ایک آرام کرسی والے کمرے طویل عرصے سے مجھے داخل ہوتے ہی وہاں سے نکلنے پر اُکساتے ہیں۔ بے مزہ، سرد، بے حد تلخ یا بے حد بے رنگ، بے بُو چائے جو قیاساً نمائشی لیکن بے حد غیر عملی سے برتنوں میں، ٹرے میں اوپری منزل پر لائی جاتی ہے، پچھلے کچھ برسوں سے جیسے ہی میں بیدار ہوں میرا سکون برباد کرنے کے لیے کافی رہی ہے۔ بیڈ کے ساتھ نائٹ لیمپ ہوتے ہی نہیں یا پھر موجود لیمپس کی روشنی آپ کی آنکھوں میں گھسی چلی آتی ہے۔ (وہ جسے آپ روشنی کہتے ہیں، اُسے اس سے مشابہ ہونا چاہیے جو ساحل پر یا پرانی پینٹنگز پر پڑتی ہے!) بیڈ سے میری کمر میں درد ہو جاتا ہے۔ دوسری جانب وہ موٹل جو ضرورت سے زیادہ پرتکلف ہوتے ہیں، وہاں پر دروازے کی ہر درز سے ایک آنکھ آپ کو دیکھ رہی ہے۔ آپ کو مسلسل آبزرو کیا جا رہا ہے۔ (ہوسکتا ہے یہ میرا مغالطہ ہو: میری سوچ کہ وہ جو ساحل پر ہنستے ہیں، تختہ نرد کھیلتے ہوئے شور مچاتے ہیں، درحقیقت رو رہے ہیں، سسکیاں بھر رہے ہیں، یہ ایک مغالطہ ہے......) بدتر موٹلوں میں کمرے، کھانے، ٹوائلٹس کی بُو سے بھرے ہوئے ہیں۔ ٹوائلٹس بے حد گیلے ہوتے ہیں۔ آپ کو صبح کے اخبار ملنا ممکن نہیں اور مل بھی جائیں تو وقت پر نہیں ملتے۔ پھر بھی جیسے ہی آپ جاگتے ہیں، صبح کے اخبارات پر ایک

سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے آپ کو یقین ہوسکتا ہے کہ آپ ایک شہری کے طور پر اپنے فرائض کا ایک بڑا حصہ تیزی سے پورا کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جیسے آپ کسی غیر ملک میں ہوں اور آپ کو رائے دہی یا ووٹ کا حق نہ ملا ہو۔ آپ ہر کسی چیز میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ بعض شکایت کرتے ہیں کہ جب وہ صبح کے اخبار پڑھتے ہیں تو وہ ڈیپریس محسوس کرتے ہیں۔ اچھا تو کیا یہی بات نہیں ہے؟ اگر آپ صبح کو ڈیپریس محسوس نہ کریں تو آپ یہ کیسے محسوس کر سکتے ہیں کہ آپ اپنے روزمرہ فرائض حتیٰ کہ آنے والے کل کی ذمے داری کا ایک بڑا حصہ پورا کر چکے ہیں۔

بہر حال اس جیسے ایک موٹل میں جہاں اخبارات کی دیر سے آمد آپ کو ڈیپریس ہونے سے روکتی ہے، دوسرے موٹلوں کی طرح کوئی بھی آپ کے چہرے کو نہیں تکتا رہتا۔ کمرے بے حد سرد ہوتے ہیں یا پھر آپ کو بے پناہ پسینہ آنے لگتا ہے یوں جیسے آپ سوانا (Sauna) میں ہوں۔ اگر یہ سرد ہو تو آپ کو اضافی کمبل نہیں مل سکتے۔ اگر یہ گرم ہے تو آپ کھڑکیاں بالکل نہیں کھول سکتے...... میں لوگوں کے کھڑکیوں سے چھلانگ لگا دینے کا سن چکی ہوں...... اور وہاں استعمال کے لیے پانی بھی نہیں ملتا۔ وہ آپ کو ایک تکیہ دیتے ہیں اور وہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ آپ اپنے دل اور گردن کے درمیانی جگہ کو سپورٹ نہیں کر سکتے ہیں۔ اور اس لیے آپ کبھی محسوس ہی نہیں کر پاتے کہ آپ اضافی ذمے داریوں سے فرار ہو آئے ہیں (جب کہ موٹل کے کمروں کا سب سے بڑا کام یا فائدہ یہی ہونا چاہیے، ہے ناں؟) برے موٹلوں میں صوفے گندے اور قابل مرمت حالت میں یا ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں۔ اور اچھے موٹلوں میں، یوں ہے جیسے ان پر وارننگ کا نشان ہوتا ہے: یہاں مت بیٹھیں، اس سے یہ گندا، پُرشکن ہو جائے گا اور ٹوٹ جائے گا۔ اگر آپ ٹھنڈے جوس کے ایک کپ کی خواہش کریں تو وہ برف کے ڈھیر سے بھرا ایک برا سا سوڈا آپ کے لیے لے آئیں گے، جس میں برف کے سوا کبھی اور کچھ نہ ہوگا۔ اگر آپ گرم سوپ کا کہیں تو وہ گرم پانی میں گھلے ہوئے نمک والا نصف پیکج آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔ وہ سلاد پر لیموں کبھی نہیں چھڑکتے۔ Meat Balls بے حد خشک ہوتے ہیں۔ وہ بہت کم تولیے رکھتے ہیں یا پھر کوئی نہیں، یا اتنے زیادہ کہ آپ الجھ جائیں کہ کون سا استعمال کرنا ہے اور کس مقصد کے لیے۔ ماضی میں آپ بستر پر جانے سے پہلے اپنے گرد آلود، کیچڑ بھرے جوتے دروازے کے سامنے چھوڑ دیتے تھے۔ اب وہ آپ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ راہداریوں میں یہ پیغام لٹکا دیتے ہیں: ہمارا

موٹل چوری شدہ اشیا کا ذمے دار نہیں ہے۔ (میں نے بالکل ایسے ہی سائن بورڈ سڑکوں پر دیکھے تھے: ہماری حکومت ان زندگیوں کے لیے ذمے دار نہیں جو ضائع ہو چکی ہیں!) اس کی باوجود وہ کمروں میں آپ کے جوتے صاف کرنے اور Slacks صاف کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں چھوڑتے ہیں یا وہ صرف ایک برش چھوڑ دیتے ہیں اور آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ جوتوں کے لیے ہے، Slacks کے لیے یا کوٹ کے لیے۔ آپ اُس برش کے استعمال میں با آسانی غلطی کر سکتے ہیں...... جس سے آپ سے پچھلا مہمان تھوک سے بھرے ستے کی بُو والے جوتے برش کرتا رہا تھا۔ اسے آپ اپنے بالکل نئے بوٹ یا جیکٹ پر جسے آپ نے ٹرپ کے لیے خریدا ہو، استعمال کر سکتے ہیں۔

میں جانتی ہوں کہ میں موٹلوں کے کمروں کے بارے میں خاصی شکایات کر چکی ہوں۔ ایک روز ہماری نسل بھی اپنی بہت ساری شکایات کے ساتھ معدوم ہو جائے گی۔ ''وہ جو ہمارے بعد آئیں گے وہ ہمارے چہروں کے خطوط، ہماری آوازوں کے لہجوں کو بھی مزید یاد نہ رکھ پائیں گے۔ اور ایک روز اس سب کی وجہ سمجھ میں آجائے گی۔ اسرار کا پردہ جو تمام مصائب، ناممکنات کو چھپا لیتا ہے، ابھر آئے گا۔ لیکن ابھی ہم زندہ ہیں۔'' (آپ کیا کر سکتے ہیں۔ آپ کو زندہ رہنا ہے جب تک کہ آپ مرتے نہیں! موسیقی!......) مجھے اس بات میں اضافہ کرنا ہوگا کہ میرے لیے ریزرو موٹل کا کمرا جہاں میں تعطیلات کے لیے گئی تھی۔ اس کا اس ناخوشی سے کم ہی کچھ لینا دینا تھا، جس کا میں نے اظہار کیا ہے اور جب آپ کے ساتھ کچھ اچھا ہوتا ہے، آپ اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ ان تمام بری باتوں کو کہہ دیں جن سے آپ ماضی قریب میں گزر چکے ہیں، جو ابھی زیادہ پرانی نہیں ہوئی ہیں۔ (لوگ کہتے ہیں، انسان ناشکرا ہے۔ کس قدر غلط ہے! اُن کے پاس تو موٹل کے کمروں، گلیوں، گھروں کی اندرونی سجاوٹ اور حصوں کی بس سادہ سی یادیں ہوتی ہیں......)

اگرچہ موٹل میں کوئی بھی ٹھہرا ہوا نہیں تھا، بار اور ریسٹورنٹ کھلے تھے، کھانا اچھا تھا اور ہمیشہ تازہ۔ آپ کو اس پر یقین کرنا ہوگا۔ وہ جو موٹل چلاتے ہیں، جو وہاں کام کرتے ہیں...... والٹ جو آپ کی گاڑی پارکنگ لاٹ تک لے جاتا ہے، ملازمہ جو آپ کے کمرے کی انچارج ہے، کلرک جو استقبالیہ پر آپ کا اندراج کرتا ہے اور آپ کے سوالات کا واضح طور پر جواب دیتا ہے (ہاں، ہاں، میرا یقین کریں)، گارڈ بھی، باورچی، دو ویٹر، مالی...... یہ ملا جلا کر زیادہ لوگ نہیں بنتے لیکن جس طرح

یہ اپنا کام تقسیم کرتے ہیں، وہ موثر ہے۔ کوئی بھی کس پولیس مین کی طرح آپ کو مسلسل نہیں دیکھ رہا یا یوں دکھاوا نہیں کر رہا کہ اس نے آپ کو نہیں دیکھا۔ مختصراً یہ کہ سب کچھ بہترین ہے۔

جیسے ہی میں ذرا اسیٹل ہوگئی، میں نے اپنے کمرے سے پورے منظر کا جائزہ لیا: اپنا چہرہ شمال کی جانب موڑتے ہوئے مجھے دُور فاصلے پر دھند میں پہاڑ دکھائی دیتے ہیں، پہاڑوں کے سلسلے سے آگے کیلے اور ترنج یا ترشاوہ کے درختوں سے بھری پہاڑیاں، میدان میں کسانوں کے جھونپڑے اور پہاڑیوں کے کناروں پر بھی جو سمندر کنارے تک چلی جاتی ہیں۔ اگر میں مشرق کی جانب مڑوں تو ایک چھوٹی سی کھاڑی، ایک ساحلی جھیل...... جنگلی سبزے سے بھری پہاڑیوں میں گھری اور اس کے بالکل پار، خاصے فاصلے پر، کُھلا سمندر، چوں کہ مجھے مستقبل میں اس منظر اور بہت سی تفصیلات کو بار بار یاد کرنا ہوگا۔ چاہے میں ایسا چاہوں یا نہیں، میں اس خلاصے سے مطمئن ہوں۔ پھر بھی مجھے اس میں اتنا اضافہ کرنے دیں:

کمرا جس میں، میں ٹھہری ہوئی ہوں، اس میں آپ شیشے کے دروازے سے بالکنی میں جاتے اور سرخ پھولوں والی جھاڑیوں، مختلف قسم کے کیکٹس، چار رنگوں کے جرنیم کے گچھوں کے قریب پہنچ جاتے۔ کنیر کو عمارت سے پرے، لوگ سے دُور ترین حصے میں اگایا گیا ہے، موٹل کو گھیرے میں لیے دودھیا سفید دیواروں کے ساتھ، جو ان کے لیے مناسب جگہ سمجھی گئی ہے۔ وہ زمین جہاں عمارات تعمیر کی گئی ہیں اُس کی ہر انچ جگہ گھاس اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ (یہاں مجھے اس کو لکھ لینا چاہیے۔ کیوں کہ میری اگلی منظر کشی میں گھاس اور پھولوں بھری اس جگہ کا تذکرہ زمین کے کھاری، بے آب وگیاہ گڑھوں سے بھرے ٹکڑے کے طور پر کرنا تھا جہاں سے صنوبر، میپل اور خروب (Carobs) کے درخت اکھاڑے جا چکے ہیں)۔

پھر، وہ گھر۔

یہ عجیب لگ سکتا ہے، کوئی بھی اس کا یقین نہ کرے گا لیکن وہ آخری چیز جو میری نگاہوں کو دکھائی دی وہ چھوٹا سا پرانا اجاڑ گھر تھا جو ریسٹورنٹ اور موٹل کے اس حصے سے قریب ترین تھا جہاں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ سائنسی طور پر یہ درست ہے کہ نگاہیں سب سے پہلے ایک خاص فاصلے پر موجود چیزیں دیکھتی ہیں، وہ نہیں جو قریب ترین ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ توجہ میں آ کر یہ گھر عجیب سے

احساسات، خیالات کو جگاتا ہے۔ یہ ایسا گھر ہے جو آنکھوں کے سامنے آنے کے بعد مسلسل سرگوشیوں میں بات کرتا ہے، کہانیاں سناتا ہے۔ جب آپ کی آنکھیں اس سمت میں حرکت کرتی ہیں آپ کو ایک فریب خیال (illusion) کا سامنا ہوتا ہے، حتیٰ کہ آپ کچھ عکس کچھ تصویروں کی برسات میں بھی پھنس سکتے ہیں۔ (وہ لمحہ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا، اس برسات کا آغاز تھا۔ اس وقت وہ بے ربط ردھم سے گرتے بڑے بڑے قطرے تھے)۔ جو کچھ میں کہہ چکی ہوں اسے دہراتے ہوئے اس طرح آپ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ وہاں ایک غیر معمولی روشنی تلے زندگی کے آثار ہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ یہ مبہم زندگی جو اپنی لمحاتی وقتی حقیقتوں کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے ظاہر اور غائب ہوتی رہی وہ میرے ناول ...... دی میپل لیف ...... کی راہ میں حارج ہو چکی تھی، جس نے کبھی مجھے تنہا نہ چھوڑا لیکن میرے لیے یہ سمجھنا اب تک ناممکن تھا کہ یہ حالت بھی درحقیقت مسودہ تحریر کرنے، کچھ نیا کہنے کا عمل تھا۔ سب کچھ ابھی تک اسرار کے پردے تلے چھپا ہوا ہے۔ ایسی جگہ پر جہاں آپ نہیں جانتے، ان لوگوں کے ساتھ جنہیں آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا، جن کے نام آپ نہیں جانتے ان کی پوزیشنز وغیرہ تو درکنار، لوگ جن کے ساتھ آپ احساسات اور خیالات کے تناظر میں کچھ بھی مشترکہ نہ رکھتے تھے، نہ رکھتے ہیں، وہاں کسی بھی صورت میں لکھا بھی کیا جا سکتا تھا؟ میرے سوال پر کسی وجہ سے میرے دماغ نے جلدی سے دو جوابات فراہم کر دیئے جو ایک دوسرے کے برعکس تھے:

۱۔ آپ کچھ بھی لکھنے کا نہیں سوچتے، کہہ لیجئے کہ ناول جس کی سماجی پوزیشنز کے بارے میں بھی بات کرنے کی ضرورت ہے۔

2۔ اور ان لوگوں کو پوزیشنز ...... اگر ہر قیمت پر ضروری ہو ...... جو ان ساحلوں پر یہ گھر بنا پائے تھے، جو غربت زدہ ہے لیکن پھر بھی خوب صورتی کے تمام پہلوؤں سے دور نہیں ...... پہلے ہی خاصی واضح ہے۔ یہ کم سے کم ایک اشارہ ہے۔

چوں کہ ذہن دلیل کے صرف ایک پہلو کی جانب ہی کام نہیں کرتا، اس نے ان جوابات پر بھی یکے بعد دیگرے ردعمل دے دیا:

''کہا جاتا ہے کہ یہاں ایسا ہے یا ویسا ہے۔ یہاں نہ ایسا ہے اور نہ ہی ویسا۔ یہاں کچھ اور ہی ہے۔'' (ذور کا ایک نغمہ)۔ چوں کہ تم لکھنے بتانے کا نہیں سوچتے ہو اس لیے تم کسی Clue کسی

اشارے کی تلاش میں بھی نہیں ہو۔ کچھ مختلف زیادہ مختلف، بالکل مختلف......

یہاں بالکل مختلف چیزیں بھی ہیں۔

اجاڑ سنسان گھر، دونوں جانب لکڑی کے ٹوٹے ہوئے جنگلوں والا باغ...... تیسری جانب وہ ڈھلان ہے جو سمندر تک جاتی ہے...... اس نیچی سفید اور خوب صورت دیوار کے ساتھ جو موٹل کے مالک نے گھر اور موٹل کی حد بندی پر تعمیر کروائی ہے، خاکستری رنگ کے Witch's Broom، جلی ہوئی کانٹے دار جھاڑیاں، جڑی بوٹیاں...... اور لاتعداد رھوڈز فلاور، گھر کی مغربی جانب فرش سے چھت تک ابھی تک کھلے ہوئے، اپنی تیز قرمزی چمک کے ساتھ۔ (یہاں مجھے ایک اور بریکٹ کھول کر یہ بتانا ہوگا: میرا ایک دوست زرعی انجینئر اس پودے کو "بوگن ویلیا" کہتا ہے۔ میرے خیال میں لوگ اسی پھول کو ایجن کے علاقے میں "پائپ فلاور" اور باقی جگہوں پر "ویڈنگ فلاور" کہتے ہیں۔ جہاں تک میری بات ہے میں اس پودے کو جس پر پتوں سے زیادہ پھول ہوتے ہیں، "رھوڈز فلاور" کے نام سے جانتی ہوں۔ آپ کیا کر سکتے ہیں؟ آپ کا اپنا ماضی مزاحمت کرتا ہے، رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اس دوران متجسس قارئین کے لیے مجھے بتانا ہوگا کہ بعض علاقوں میں اس پھول کو Bride's Veil (دلہن کا نقاب) بھی کہتے ہیں اور ہمارے موٹل کے گارڈ کے مطابق اس کا نام ہے، "بیوٹی فل یوسف"۔ حسن یوسف...... (امریکہ میں سویٹ ولیم) خیر آپ جانتے ہیں، ہر چیز کے لیے بہت سے ممکنات ہوتے ہیں۔ اور ہر کوئی سچ بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اتنا سخی ہونا چاہیے کہ جو بھی جانتے ہوں لوگوں میں بانٹ دیں، لیکن یہ بتانا دشوار ہے کہ اس سخاوت اور محض گپ بازی کے درمیان حد کہاں استوار کی جانی چاہیے)۔

گارڈ کا بیٹا یوسف جو دس یا بارہ برس کا ہے، پودوں کو پانی دینے اور آتے جاتے لوگوں کی کاریں دھونے کا انچارج ہے...... لیکن کیوں کہ زیادہ لوگ آتے جاتے نہیں اس لیے وہ ایک بے حد پرانے ٹائپ رائٹر سے جڑا ہوا ہے۔ وہ یہ تمام کام کسی روبوٹ کی طرح کرتا ہے۔ لیکن جہاں بات لگاتار بغیر رکے ٹائپ رائٹر کے بٹن دبانے کی آتی ہے، معاملہ مختلف ہے۔ یوں ہے جیسے وہ خود کو ٹائپ کرنا سکھا رہا ہوں۔ شاید میں غلط تھی۔ میں نے سوچا، ایک بچہ جو ایک دیہاتی اور موٹل ملازم ہونے کے بیچ کہیں تھا، ممکنہ طور پر کیا لکھ سکتا تھا، اگر وہ لکھ بھی لیتا۔ سو مجھے معلوم ہوا کہ اپنے فارغ وقت میں وہ

جو پرانے ٹائپ رائٹر پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا وہ ایک واحد جملہ ترتیب دینا تھا۔

بعض اوقات ساحل پر کچھ لوگ اپنی کاروں میں آتے تھے یا آتے ہیں۔ ویٹرز جو اگرچہ اب تیراکی کے لباس میں تیرتی چند ایک عورتوں میں دلچسپی نہیں رکھتے، پھر بھی ایک لمحہ رک اور مڑ کر انہیں دیکھنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ تاہم یوسف کو لگتا ہے اس میں بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ (کسی وجہ سے ان قرمزی پھولوں کے یہ نام رکھنے سے زیادہ، اس پرانے ٹائپ رائٹر کے باعث یوسف میری یادداشت میں تھوڑی دیر کو مگر متواتر آتا رہے گا، اگرچہ وہ میرے لیے اس قدر اہم نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں کیا یوسف ان لوگوں کو جانتا ہے جو ہمسایہ گھر میں رہتے تھے)۔

اب میں دوبارہ پوچھتی ہوں: کوئی کیوں اس جھیل میں مچھلیاں پکڑنے کی بنسی لٹکائے گا جس میں ایک بھی مچھلی نہ ہو؟

لمبی سیریں۔ جنگلات کی خزاں کی خوشبو۔ فرن کے پودے جو صنوبر کے جھڑے ہوئے پتوں کی تہوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ گھنی جھاڑیوں اور جنگلی پودوں کے درمیان کم چوڑے قدرتی چشمے کے پانی کی دُور سے بھی سنائی دینے والی آواز۔ موسم کے آخری گرم لمحات میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی سفید رنگ کی تتلیوں کا جوڑا۔ میری نگاہوں نے کبھی اس قدر قریب سے اس قدر ثابت قدمی سے ایسی تتلیوں کا تعاقب نہ کیا تھا۔ اُس گھنے جنگل میں جہاں درختوں کی گھنی ٹہنیوں کے بیچ سے دھوپ کا چھن کر آنا بھی دشوار تھا، میں نے صبح کی سیر کرتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔ پہلے وہ دونوں ریکا جھاڑی کی ایک بالکل پتلی شاخ پر بیٹھی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے کھیل کود اور چہل کرنے میں مگن تھیں۔ پھر اُن میں سے ایک نے پَر پھیلائے، اڑان بھری اور دس فٹ اوپر بلیک بیری کی شاخ پر جا بیٹھی۔ دوسری مخالف سمت میں اڑ گئی۔ میں سمجھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو گم کر بیٹھی تھیں اور اب دوبارہ کبھی نہ مل پائیں گی۔ لیکن ان کی ضرور کوئی مخصوص بُو باس ہوگی جو صرف وہی سونگھ سکتی ہوں گی کیوں کہ آنکھ جھپکنے میں اریکا جھاڑی والی تتلی نے پر دوبارہ پھیلائے اور سمت بدلتے ہوئے خاصی دُور موجود بلیک بیری کی شاخ کی جانب اڑ گئی۔ اس نے اپنی ساتھی کو دوبارہ بڑی آسانی سے تلاش کر لیا تھا، یوں جیسے اُس نے خود اُسے وہاں پہنچا دیا تھا۔ اس نے اپنے پروں سے دوسری تتلی کو چھوا اور محبت کا اظہار کیا۔

اس کے بعد سے میری نگاہوں نے مسلسل ان کا پیچھا کیا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ کیسے ہر بار وہ ایک دوسری کو ڈھونڈ لیتی ہیں، تب جب میرا خیال ہوتا کہ وہ ایک دوسری کو گم کر بیٹھی ہیں۔ چاہے اُن میں سے کوئی کسی بھی سمت میں اڑ گئی ہوتی، آخر میں ایک دوسری کو ڈھونڈ لیتی، وہ ہمیشہ کی طرح ایک دوسری کو گلے لگاتی، پر ٹکراتی، بالکل بھی تھکے بغیر: (تم کہاں تھیں؟ تم کس کے ساتھ تھیں؟ پھر تم میرے پیچھے کیوں نہیں آئی؟ تم نے کل بھی ایسا ہی کیا تھا! کیا اُس روز بھی تم مجھ سے بھاگ نہیں رہی تھیں۔ کیا تم مجھ سے دُور نہیں بھاگ گئی تھیں؟) کوئی سوال نہیں، کوئی الزام، کوئی فیصلہ، کوئی سزا نہیں...... جو میں نے دیکھا وہ خالص، دوستانہ اور بے حد با احترام وصل تھا۔

میں دونوں تتلیوں کی تلاش میں پوری طرح محو تھی۔ تب بھی جب وہ دونوں اُس قدرتی چشمے کی دوسری جانب گم ہوگئی تھیں، جسے میں پار نہ کر سکتی تھی، میری نگاہیں گھنی شاخوں میں اس امید میں سرگرداں رہیں کہ وہ پتوں میں سے دوبارہ دوبارہ نکل کر سامنے آجائیں گی۔ اُس صبح جنگل میں میری سیر کافی دیر تک جاری رہی تھی۔

میں نے تتلیوں کی زندگیوں کے بارے میں اس سے پہلے کبھی نہ سوچا تھا۔ مجھے اس کے نسل بڑھانے کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ حتیٰ کہ آج بھی میرے پاس ان کے بارے میں یہ جان لینے کے سوا اور کوئی علم نہیں کہ تب بھی وہ ایسے رابطوں سے جو ہمیں دکھائی نہیں دیتے اور ایسی بُو باس سے جو ہم سونگھ نہیں سکتے، ایک دوسرے کے بے حد قریب ہوتی ہیں۔ دوسری جانب میں ہمارے بارے میں بہ خوبی جانتی ہوں کہ ایک دوسرے کے بالکل قریب رہتے ہوئے بھی ہم اس بات سے بے خبر رہتے ہیں کہ ہم میں سے دوسرا کہاں ہے... آہ، ملکیت! آہ... شاید میرا کسی مقصد کے بغیر اس جھیل میں مچھلیاں پکڑنے کی ڈوری ڈالنا جہاں مچھلیاں ہیں ہی نہیں، ان تتلیوں کے جوڑے کے سبب سے ہو، کون جانتا ہے؟ آپ کو روشنی کے ان لحاتی جھماکوں کے منبع کو تلاش کرنا ہوگا۔ آپ کو چلنے، مسلسل چلنے کے لیے ندی کا تعاقب کرنا ہوگا۔ لیکن میں تو چھٹیوں پر ہوں۔

جب میں جنگل سے موٹل واپس آئی...... دوپہر کا کھانا تیار تھا...... میں نے اپنے خوشبودار صابن سے غسل لیا۔ پھر میں ریسٹورنٹ میں چلی گئی۔ میں دوبارہ اس کھڑکی کے سامنے بیٹھ گئی جہاں سے ہمسائے کے گھر اور اُس سے آگے کھاڑی کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ میرے پاس ٹھنڈی برف سی

بہترین وائن کی بوتل تھی۔ میں اُس مچھلی کا انتظار کرتے ہوئے، جس کے بھوننے کا میں نے آرڈر دیا تھا، وائن کی چسکیاں لے رہی تھی۔ تبھی جس کا میں نے پہلے تذکرہ کیا ہے، وہ منظر میرے سامنے روشن ہوا۔ جیسا کہ میں نے بتایا، وہ بے حد مختصر لمحہ تھا۔ آنکھ جھپکنے میں میرے احاطۂ نظر میں ایک بالکل مختلف روشنی کوندنے لگی۔ کسی قدر زرد، سبزی مائل سرمئی نیلی روشنی۔ میں نے گھر کے ٹیرس پر اس روشنی میں کچھ لوگوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک پتھروں کی شکستہ سیڑھیوں سے ڈھلان سے نیچے اترا اور سمندر میں غوطہ لگا دیا۔ ایک عورت جو شاور تلے نہا رہی تھی: اس کی کمر کا خط گہرا تھا۔ شاور کے قریب سرمئی مونچھوں والا ایک شخص ظاہر ہوا اور اس آواز میں جو تقریباً ایک کراہ تھی، میری سمت میں پکارا: بارشیں؟ اس کی آنکھوں کا تاثر گڈمڈ سا ہے۔ آرزو، دکھ، اچھائی اور شیطانیت کا ملغوبہ۔

اس کے بعد ان مناظر نے میرا پیچھا پکڑ لیا اور بار بار میرے سامنے آنے لگے۔ جب میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی تب بھی یہ وہاں موجود ہوتے تھے۔ اگر میں اپنی آنکھوں کو ذرا کم کھولتی اور اپنے احاطۂ نظر کو صرف وہاں تک محدود رکھتی جہاں وسیع سمندر ختم ہوتا تھا تو میں نے خیال کیا ہوتا کہ مناظر حقیقی تھے۔ یہ سچ ہے، وہاں وہ گھر موجود تھا جسے میں نے پورے یقین سے دیکھا۔ لیکن جہاں تک ان لوگوں کی بات تھی جن کا کبھی اس گھر سے تعلق رہا تھا، میں چند ٹوٹے ہوئے ادھورے جملوں کے سوا کچھ نہ جانتی تھی جو میرے پوچھے بغیر کہے گئے تھے:

سب سے پہلے وہ عورت آئی۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ چھے تھے۔

لوگ کہہ رہے ہیں کہ اُس نے عورت پر دست درازی کی تھی۔

لوگ کہہ رہے ہیں کہ اُس نے عورت پر کوئی دست درازی نہ کی تھی۔

لڑکے کی نظر ہمیشہ سے ٹائپ رائٹر پر تھی۔

اس نے کہا کہ میں بچوں کو گاؤں چھوڑ دوں گا اور رات تک واپس آجاؤں گا۔

پھر بارش شروع ہوگئی تھی۔

شروع میں کوئی بارش نہیں ہوئی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ اُس لڑکے نے چٹانوں سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔

جب وہ واپس آئی کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ بہر حال اس کی چیخنی تو کام کرتی ہی نہ تھی۔

جب وہ سب چلے گئے تو وہ تین دن اور راتوں تک مسلسل لکھتی رہی۔ (میرے خدایا، وہ سب تحریریں کہاں ہیں؟)

اگر وہ پاگل ہوگئی تھی تو پتا چل جاتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ کسی نے بھی اُسے دوبارہ نہیں دیکھا۔

کھاڑی کے سرے پر جنگلی سٹرابریوں تلے پاگل لڑکے کی لاش ملی تھی۔ اپنے رخسار تلے ایک پھول دار زرد لباس لیے یوں جیسے وہ سو رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ کافی روتا رہا تھا، روتے روتے اس کی سانس اکھڑ گئی تھی۔

گھر فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ کیا جا سکے تو اسے موٹل میں شامل کر لیا جائے گا۔

(کیا میں نے یہ سب باتیں سنی تھیں یا صرف انہیں خود گھڑ لیا تھا؟ مجھے اچانک شک ہونے لگا کہ میں نے انہیں سنا تھا)۔

جو بھی ہے۔ بس۔ لیکن ایک مرتبہ میں نے یوسف سے کہا تھا، ''کس قدر خوب صورت گھر ہے! کیا یہاں کوئی نہیں رہتا؟''

''کبھی یہاں لوگ رہتے تھے۔ میں تب چھوٹا تھا۔ اب یہاں کوئی بھی نہیں رہتا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اور کسی سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ میں گھر کو اندر سے دیکھنے کے لیے بھی نہیں گئی۔ پھر بھی کسی قسم کی تصویریں، آوازیں، حتیٰ کہ موسیقی، کبھی کسی ہنسی یا کسی کراہنے سے مشابہ ایک چیخ، بعض اوقات ایک زرد لباس، بہت سے دوسرے رنگوں کے ساتھ، میرے پوچھے میرے تلاش کیے بغیر سامنے آئے۔ چاہے عورت اس گھر میں سب کے مرنے، یا پاگل ہو جانے یا جو بھی ہوا تھا اس سے پہلے آئی تھی، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کسی واضح انجام کی تلاش میں نہیں ہوں۔ باقی سب کچھ کی طرح، میں فطرت کے اس حصے کے واضح اختتام یا انجام کی تلاش میں نہ ہو سکتی تھی جہاں میں کچھ عرصے کے لیے رہ رہی تھی۔ جب تک یہ ساحل موجود رہیں گے تب تک زندگی ایک یا دوسری طرح ان ساحلوں پر اپنا وجود قائم رکھے گی۔ میں ایک مرتبہ خود وہاں گئی تھی۔ میں نے دُور تک دیکھا (تلاش کیا) اور پھر خود اپنی آنکھوں سے اس اجاڑ گھر کو دیکھا۔ بس یہی بات تھی۔ پہلے گھر میں ایک عورت آئی

تھی۔ بعد میں دوسرے لوگ آئے۔ شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ باہر لگا ہوا شاور کا نل ٹوٹ چکا تھا۔ شاور کا سیدھا عمودی پائپ ایک جانب جھک چکا تھا۔ رھوڈ رفلاور یا بوگن ویلیا نے ریسٹورنٹ کے سامنے والی گھر کی پوری دیوار کو ڈھانک رکھا تھا۔ کھڑکیاں بالکل اس بلندی پر ہیں کہ کوئی بھی جو اندر جھانکنا چاہے، جھانک سکتا ہے۔ (کون جھانکتا ہے؟ کس نے دیکھا؟ ان دنوں میں جب وہ عورت باقی سب کے جانے کے بعد پیچھے رہ گئی تھی، اس نے کیا لکھا تھا؟ اس نے کیا بتایا؟ کتنے سال پہلے؟)

حتیٰ کہ اس موٹل کو کھلے ایک سال بھی نہیں ہوا۔

ایک اور جملہ: ''تب تعمیر شروع ہوئی تھی۔''

اگر چار برسوں میں تعمیر مکمل ہوگئی تھی تب یہ زیادہ سے زیادہ پانچ برس پہلے کی بات تھی؟

پانچ سال پہلے ایک تاریک دَور کا اختتام ہوا تھا۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے بعد ایک تاریک تر دَور آنا تھا۔ بعض امیدیں پالی گئی تھیں۔ قتل عام رک جائیں گے۔ میری چھٹیوں کی صبح میں نے ساحل پر ٹی آئی ٹی (ترک انتقام بریگیڈ (Türk İntikam Tugayı)) کا نعرہ دیکھا۔ ریت پر ایک تحریر درج تھی۔ وہ اس قدر گہری کھودی گئی تھی کہ کوئی بڑی لہر بھی اسے مٹا نہ سکتی تھی۔ اس جیسی بہت سی ملی نت تنظیمیں تھیں۔ تحریر کہتی تھی، ''انتقام۔ جنگ جاری ہے۔ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ!'' یہ سب ریت پر ٹی آئی ٹی کے لوگو کے ساتھ تحریر تھا۔ اپنی شام کی سیر کے دوران کسی وجہ سے...... جیسے کہ یہ ایک کھیل تھا...... ''جنگ جاری ہے'' کے نیچے میں نے چھوٹے حروف میں ایک چھوٹی سی چھڑی کے ساتھ لکھا، ''کس کے ساتھ؟'' ساحل پر کوئی ایک ذی روح بھی موجود نہ تھا۔ صرف میں۔ کوئی ایک جان دار بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ یعنی اگر آپ سمندر کی جانب بھاگتی سمندری مکڑیوں کو گنتی میں نہ لاتے۔ اگلی صبح میں ناشتہ کرنے کے بعد دوبارہ سیر کر رہی تھی۔ یوں تھا جیسے وہ عورت تیراکی کے لباس اور رنگ برنگی زرد سکرٹ میں...... کسی وجہ سے اس وقت ایسا ہی تھا... میرے ساتھ چل رہی تھی اور پھر وہ سمندر میں غوطہ لگا کر غائب ہو گئی۔ بہت عرصہ پہلے میں نے اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ ٹیرس پر دیکھا تھا۔ انہوں نے میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ موسیقی کی کوئی دھن پانی اور ہوا میں گونجتی مجھ تک پہنچتی ہے۔ (میں نے یہ بھی سوچا کہ گیت ساحل پر جس کی بازگشت سنائی دی، وہ تھا جو اِن الفاظ سے شروع ہوتا تھا، ...Now you're far away)۔ اب جب کہ میں اسی گیت کو لبوں اور اپنے ذہن

میں لیے ساحل کی جانب جا رہی ہوں، میری نگاہیں اچانک ان الفاظ سے جا ملیں جو ایک رات قبل میں نے لکھے تھے۔ میں نے اپنے سوال کے ساتھ ہی بڑے بڑے بورڈ حروف میں لکھا اس کا جواب دیکھا۔ ''تم جیسوں سے۔''

میں ان لفظوں پر پیر رکھنے والی تھی۔ لہریں انہیں مٹا نہیں سکتی تھیں سو میں نے انہیں ریت سے ڈھانپنے کا سوچا۔ جب میں یہ کرنے ہی والی تھی تو میں اس احساس سے اپنی جگہ جم کر رہ گئی کہ چھپ کر میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ میں نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا۔ میں تیزی سے پلٹ آئی، میرا وقار ہل کر رہ گیا۔

میں مین روڈ پر پہنچ گئی۔ سڑک کی خشکی والی جانب کنکریٹ سے بنے دو منزلہ کاٹیج کی قطار ہے، جن کے نیچے سٹور تیج روم اور پچھلی جانب باغیچے بنے ہیں۔ یہ زیادہ تر اپرنٹس آرکیٹکس کا کام ہے۔ وہ جنہوں نے ساحل پر میرے لکھے ہوئے سوال کا جواب دیا، ہوسکتا ہے انہی میں سے کسی میں رہتے ہوں۔ جھکے ہوئے سر کے ساتھ میں تیزی سے وہاں گزر گئی۔

میں پُرعزم تھی، میں اپنی چھٹیوں کے دوران کسی تاریکی یا مایوسی کو راہ دینے والی نہ تھی۔ میں نے اپنے بے ترتیب وقار کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ میں نے نااہل سول سرونٹس کے حوصلہ دکھانے کے عمل کی طرح اپنا سر ضرورت سے زیادہ آسمان کی جانب اٹھایا۔ نیا چاند طلوع ہو چکا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ یہ ایسے ہی ہوا تھا۔ پہلے عورت گھر آئی تھی۔ وہ خود۔ وہ ساتھ آئی......

ایک بس میرے قریب سے گزرتی ہے۔ میں عمودی ڈھلان کے سرے پر ہوں۔ اوپر بلندی پر پہنچ کر بس آہستہ ہو جاتی ہے۔ چوٹی پر پہنچنے پر بس کی رفتار آہستہ ہو جاتی ہے۔ یوں ہے کہ جیسے وہ اب رکنے والی تھی اور کوئی اترے گا اور موٹل کی طرف جاتی سڑک، جس پر دو رویہ پام کے درخت تھے، اس کے سرے پر فوارے پر جھک جائے گا۔

بس کی رفتار بڑھ گئی اور وہ گزر گئی۔ وہ رکی نہیں تھی۔ کوئی بھی بس سے نہ اترا تھا۔ لیکن میں نے ایک بار پھر دیکھا، وہ وہی عورت تھی۔ اس کا کوئی چہرہ نہ تھا۔ کوئی آنکھیں، منہ نہیں تھے بلکہ وہاں اس کی گردن سے نیچے آتے گہرے بھورے بالوں کے ساتھ دبلا، طویل قامت وجود تھا۔ جب وہ شاور میں تھی تو میں گیلے ہونے کے باعث اس کے بالوں کا رنگ نہ بتا پائی تھی۔ وہ بارش یا گہری

دھند، کہر سے دھلے شیشے کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ مبہم امیج پانی کے فوارے کے سامنے جس قدر تیزی سے ظاہر ہوا تھا، اسی تیزی سے غائب ہو گیا تھا۔

پانی کا ایک خوب صورت فوارہ۔ پرانے رومی فواروں کی یاد دلانے والا۔ یہ پہاڑی لوگوں کا تیار کردہ نہیں ہوسکتا۔ یوں لگتا تھا جیسے موٹل کے مالک نے اسے سیدہ (Side) سے چرایا تھا اور آرٹی کرافٹ چوری کی بے باک مثال کے طور پر یہاں لے آیا تھا۔ یہ پرانے شہر میں داخلی دروازے کے بالکل ساتھ، عوامی ٹوائلٹس کے ساتھ ہی تھیٹر اور Agora کے درمیان جنوب مغربی کنارے پر موجود فوارے جیسا ہے۔ یہ اینٹیک کی ایک خوب صورت نقل ہے۔ امی ٹیشن سنگ مرمر سے بنے نلکے سے شفاف پانی پھوٹتا ہے۔

اس کے قریب جا کر میں نے ہتھیلیوں کا پیالہ بنایا اور انہیں پانی سے بھر لیا۔ میں نے خود کو یہ یقین دلانے کے لیے اپنے چہرے پر بار بار پانی کے چھپاکے مارے کہ وہ امیج جو میں نے دیکھا تھا وہ ایک فریب نظر تھا لیکن اس بار چہرے کے بغیر دکھائی دینے والا جسم کسی وجہ سے میری بھیگی پلکوں کے درمیان زندہ ہو گیا۔ یہ ایک مسخ شدہ بدصورت چہرہ تھا۔

انہیں جنگلی سٹرابریوں تلے پاگل لڑکا ملا تھا اور بس، اس کے چہرے پر بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنے گیلے رخسار سے ایک زرد لباس لگا رکھا تھا۔ وہ سویا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن بدصورت چہرے پر آنسوؤں کا سیلاب رکتا نہیں۔ (پانی جسے میں نے فوارے سے اپنے ہاتھوں میں بھرا تھا اور اپنے چہرے پر اس کے چھپاکے مارے تھے، میرے رخساروں سے بہتا ہوا گردن تک آ گیا تھا)۔ دیکھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا، نہ ہی وہ رونا، مسخ شدہ چہرہ، نہ ہی زرد لباس۔

شام کی ٹھنڈک میں روزمری کی خوشبو تیز ہو گئی تھی۔ اس خوشبو میں سانس لیتے ہوئے میں نے پام کی دو رویہ قطاروں والی سڑک کا رخ کیا اور پیدل چلنے لگی، میں موٹل تک آ گئی۔ نئے طلوع ہوئے چاند اور قریب آتی قرمزی اور زرد لہروں کی جانب رخ کر کے، جو ساحل سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں، کچھ پینا کس قدر بھلا محسوس ہوتا!

بار میں دو نوجوان موجود ہیں۔ آہستہ آہستہ اپنے مشروب کی چسکیاں لیتے ہوئے۔ ان کے انداز و اطوار مہذبانہ ہیں اور کمرے میں موجود باقی سب کو ڈسٹرب نہ کرنے یا مخل نہ ہونے کی

غرض سے وہ نرمی، آہستگی سے باتیں کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا نوجوان ہے۔ دوسرے کے بال بھورے رنگ کے ہیں۔ ہم احترام سے ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔

کسی وجہ سے میں نے بھورے بالوں والے نہیں بلکہ سنہری بالوں والے نوجوان شخص سے پوچھا، ''کیا تم پہلے کبھی یہاں آئے ہو؟''

دونوں مسکرا دیئے۔ سنہری بالوں والوں نے اسی مہذب انداز میں جواب دیا، ''نہیں، محترمہ ہم یہاں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ ہم صرف ایک رات کے لیے یہاں رک رہے ہیں۔''

(خدا کرے کوئی امید سے محروم نہ ہو۔ ساحل والے جناب ٹی آئی ٹی کو کوئی بلائے اور دکھائے کہ کیسے ایک مہذب انسان بنا جاتا ہے)۔

پھر بھی مجھے شدید مایوسی محسوس ہوئی۔ میں خود پر حیران رہ گئی تھی۔ میں کیوں چاہتی تھی کہ یہ مخصوص سنہری بالوں والا شخص یہاں پہلے بھی آیا ہوتا؟ کسی ضرورت کے بغیر میں اس بارے میں مثبت خیال رکھتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اگر وہ کہہ سکتا کہ جی ہاں محترمہ کچھ عرصے پہلے ہم قریب ہی اس گھر میں ٹھہرے تھے اور کیا اس نے کبھی ان لوگوں سے بات کی تھی جو وہاں رہتے رہے تھے، خصوصاً وہ عورت جو دوسروں سے پہلے وہاں پہنچی تھی اور بعد تک وہاں ٹھہری رہی تھی، تو میں بالکل بھی حیران نہ ہوتی۔ مجھے احساس سا ہوا تھا کہ ہم دونوں اس دَور یا وقت، ان لوگوں کے بارے میں جانتے تھے۔ یقیناً یہ ابھی بھی ایک مبہم، غیر یقینی سا احساس ہے۔

بدقسمتی سے ہمارا ایسا کوئی ٹکراؤ نہ ہوا تھا۔

''اور آپ؟'' بھورے بالوں والے نوجوان نے پوچھا۔

''میں بھی یہاں پہلی مرتبہ آئی ہوں۔''

کیا میں نے جھوٹ بولا تھا، میں بے چین ہوں۔

''یہ خاصی منفرد جگہ ہے، ہے ناں، میم؟''

مائی ڈیئر، دنیا میں پھر لوگ کیسے یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ آج کل کے نوجوان بالکل بے خبر ہیں کہ مناسب برتاؤ کیسے کرنا ہے، بدتمیز یا گستاخ، تباہی پسند حتیٰ کہ مہلک ہیں؟ آہ، ہاں آپ

ساحل پر لکھی گئی تحریر کی جانب اشارہ کریں گے۔ لیکن ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ جنہوں نے ریت پر اس قدر فوراً ہی ''تم جیسوں سے'' لکھ دیا تھا، کس قدر حاضر جواب تھے! میں دوسرے لوگوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ جیسے ہی مجھے یہ یاد آیا، میں نے دل ہی دل میں ان کی حاضر جوابی کی تعریف کی تھی۔ بار میں اپنے قریب موجود ان دو نوجوانوں کو دیکھتے ہوئے میرے سوال پر دیا جانے والا وہ ردِعمل یا جواب اب مزید دہشت انگیز نہ تھا۔ یہ بالکل احمقانہ بات تھی کہ میں وہاں سے تیزی سے بھاگ آئی تھی، میں خجل تھی۔ آپ نے دیکھا کہ وہاں میرے وقار کو کم کرنے والی ایسی کوئی بات نہ تھی، کچھ بھی نہیں)۔

نوجوانوں کو فخر سے دیکھتے ہوئے میں مسکرا دی۔ ''ہماری زندگیوں میں ایسے بے حد اچھے لمحات ہوتے ہیں، کیا نہیں ہوتے؟ موسیقی کے کسی مختصر ٹکڑے کی طرح؟'' میں نے کہا۔

جیسے ہی میں نے یہ کہا، میری آواز کوئی معنی نہ دیتے ہوئے، میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ لیکن کس قدر عجیب تھا کہ نوجوانوں نے اسے بالکل بھی اس طرح نہ سمجھا۔ وہ میری جانب بڑی محبت و عقیدت سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ کسی ایسی شخص سے ملے ہیں جو حتیٰ کہ زندگی کی خزاں میں بھی بڑی آرزو کے ساتھ زندگی پر گرفت رکھنا یا اسے تھامے رکھنا چاہتی ہے۔

''خدا کرے کہ آپ ہمیشہ ایسی ہی رہیں، کسی بچے کی طرح۔'' سنہری بالوں والے نوجوان نے کہا۔

میرے رخسار آہستہ آہستہ گلابی ہو گئے یوں جیسے سورج ڈرتے ڈرتے میرے اندر طلوع ہو گیا تھا۔

ہم نے اپنے اپنے گلاس بلند کیے۔

''زندگی کے نام!'' براؤن بالوں والے نوجوان نے کہا۔

''زندگی کے نام!'' ہم نے دہرایا۔

کچھ دیر کو وہاں خاموش ہو گئی تھی۔ میں نے خوش گوار طور پر طمانیت محسوس کی۔ خاموش لیکن مایوس کرنے والی نہیں۔ میرے اندر سورج طلوع ہو رہا ہے۔ یہ پرانے شہر کے قریب کہیں غروب ہو رہا ہے۔ سمندر کی لہروں کی مسلسل آواز دُور سے ہی سنائی دے رہی ہے۔

سنہری بالوں والے نوجوان نے کہا، ''آپ ان ساحلوں پر ہر وقت غیر معمولی آوازیں سن سکتی ہیں۔''

(میں یہ اپنی نوٹ بک میں لکھ چکی ہوں)۔

اپنے مشروب ختم کرنے کے بعد ہم باہر نکل گئے۔ ہم ڈھلان پر جنوب مشرقی جانب بڑے طریقے سے رکھے گئے بنچوں پر بیٹھ گئے۔ ہم نے سمندر کی آوازیں سنیں۔ دُور کے پہاڑوں سے چلنے والی ٹھنڈی ہوا ہم تک پہنچی۔ اگرچہ جب سنہری بالوں والا نوجوان بار میں تھا وہ عینک پہنے ہوئے نہیں تھا۔ دھند لکے میں بنچوں پر بیٹھے ہوئے اس نے اپنی عینک نکالی اور اسے پہن لیا۔ اگرچہ ہم نے پوچھا نہیں لیکن اس نے کہا، ''یوں میں جل پریوں کی آوازیں زیادہ بہتر طور پر سن سکتا ہوں۔''

دوسری جانب براؤن بالوں والے نوجوان نے ایک دل گداز نظم پڑھی جس کی چند ہی سطریں مجھے یاد ہیں۔

''سنو گونے (جنوب)

ایک لفظ، ایک اظہار یا اشارہ

یہ وقت ہے جب شہزادے مرتے ہیں۔

وقت جب سورج خاموشی سے ڈوب جاتا ہے......''

بعد میں، میں کئی روز تک پوری نظم تلاش کرتی رہوں گی۔ میں ادبی مجموعوں اور بیاضوں میں ڈھونڈوں گی۔ آہ ادبی مجموعے، جی ہاں...... اگرچہ مجھے ان میں سے بیشتر پر بھروسا نہیں ہے پھر بھی میں ایک ''شاید'' کے ساتھ انہیں الٹتی پلٹتی رہوں گی۔ مجھے کرنا ہوگا۔ کیوں کہ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والا نوجوان، جو عینک پہن کر جل پریوں کی آوازیں زیادہ بہتر طور پر سن سکتا ہے، اس اجاڑ گھر کے ٹیرس پر یہاں وہاں متواتر دکھائی دیتا رہے گا۔ وہ چھے لوگوں میں سے ایک ہوگا۔ اگر اس کا ''یہ وقت ہے جب شہزادے مرتے ہیں'' کہنے والا دوست اپنی نظم بھول جائے اور باقی یاد نہ کر پائے تو وہ اشعار مکمل کرے گا۔ لیکن کیسے؟ بعد میں مجھے بے حد پچھتاوا ہوا کہ میں نے براؤن بالوں والے نوجوان سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کیا وہ نظم جو تم سنا رہے ہو میں اپنی نوٹ بک میں لکھ سکتی ہوں؟ یوں تھا جیسے یہ خیال میرے ذہن ہی سے نہ گزرا تھا اور میری زبان پر نہ آیا تھا۔ لیکن صاف گوئی سے کہوں تو

میں ان دو نوجوانوں کے سامنے ان ریٹائرڈ سول سرونٹس جیسی دکھائی نہ دینا چاہتی تھی جو اپنی چھوٹی جیبی نوٹ بکس میں روزانہ اندراج کے ساتھ قریبی پنساری کی دکانوں اور کافی شاپس پر سنے جانے والے چٹکلے، کہانیاں، باوزن اشعار اور ہم قافیہ اشعار نوٹ کرتے ہیں۔

بعدازاں سیاست پر بات چیت کی گئی تھی۔ (کیا میں نے ذکر نہیں کیا تھا کہ ہم اپنے دکھائی دینے والے مرئی زیورات ہر جگہ ساتھ اٹھا کر لے جاتے ہیں؟)

نوجوانوں نے اردگرد موجود انتشار کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے نے، اس بار کچھ زیادہ خوش امیدی سے یہ کہا، ''سب کچھ ویسا ہے جیسا اسے ہونا چاہیے میم۔''

کسی نامعلوم وجہ کے باعث اس کا ایک پیارا دوست ہلاک کیا جا چکا تھا۔ میں حیران تھی کہ اس سب کے باوجود جو ہوا وہ اب بھی بڑے سکون سے کہہ سکتا تھا، ''سب کچھ ویسا ہے جیسا اسے ہونا چاہیے۔'' (ہاں، اب میں سمجھ گئی ہوں! نوجوان مارکیز کے جملے بول رہا تھا۔ لیکن ایمان داری سے بات کرو! تم کولمبیا کا موازنہ یہاں سے کیسے کر سکتے ہو؟......) اچھا، اگر ایسا تھا بھی، کیا اس کے اور اس عورت کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے جو ہمسایہ گھر میں باقی ہر کسی سے پہلے آئی تھی؟ ایک تعلق، غیر سیاسی، لیکن میں نہیں جانتی۔ کیا اس قسم کے تعلقات مزید موجود ہیں؟ (چوں کہ میں نے یہ سوال چند گھنٹے بعد اپنے کمرے میں نیند اور بیداری کے درمیان پوچھا ہے، یہ اہم نہیں ہے۔ میں نے اسے اہمیت نہیں دی یا اہمیت نہیں دیتی ہوں۔ یہ بالکل واضح یا صاف ہے)۔

وہ اگلی صبح چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں دوبارہ اکیلی تھی۔ تنہائی کی اصل اہمیت ان سوالوں کا پیچھا کرنے کے قابل ہونا ہے جنہیں دوسرے غیر اہم خیال کرتے ہوں...... اسی وجہ سے ان کے جانے کے کئی روز بعد تک میرا دماغ سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے نوجوان اور زرد لباس والی عورت کے درمیان کسی قسم کے غیر سیاسی تعلق کا کھوج لگاتا رہا...... زرد لباس جس میں بہت سے دوسرے رنگ بھی تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ اگر اس کھوج کو وہیں کہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں گھر واپسی کے بعد بھی اس تلاش میں متذبذب نہ ہوتی۔ میں اپنے تمام ٹرنکس اور باسکٹیں دیکھوں گی۔ میں اپنے دراز چھان ماروں گی۔ میں اس نیلی آنکھوں والے نوجوان اور ایک عورت کے درمیان جو سمندر میں کھو گئی تھی یا یہاں یا ہوا میں...... جہاں بھی...... غیر سیاسی یا غیر معاشی تعلق کی

تلاش جاری رکھوں گی اور جب میں اسے تلاش کرنے کے قابل نہیں ہو پاتی تو میں جلدی سے کہیں سے ایک عجیب وغریب رومانوی لوک گیت تیار کرلوں گی۔ ان دونوں کے لیے آرڈر پر تیار۔ لیکن ایک بے نام رشتہ، جسے واضح کرنا مشکل ہے، جو میں بعد میں تلاش کر لیتی، وہ میرے نزدیک کسی ایجاد کردہ رومانس سے زیادہ قابل بھروسا ہوتا۔

اب میں جھیل کنارے کھڑی ہوں۔ مزید یہ کہ مچھلیاں پکڑنے کی اس ڈوری کے ساتھ جو میری مرضی کے خلاف پانی میں ڈالی گئی ہے۔ جب تک کہ میں اس ساحل پر انتظار کرتی ہوں تو میں ایک دوسرے میں اس قدر مکمل طور پر گندھے ہوئے رشتوں کو اپنے چہروں، آوازوں، رویوں، برتاؤ کے ساتھ اپنے خاموش، پُرامن یا پُرسکون دنوں کو ڈسٹرب کرنے سے روک نہیں سکتی ہوں۔

آپ ان ساحلوں پر غیر معمولی آوازیں سن سکتے ہیں۔ (لیکن اپنی عینک لگانا مت بھولیں)۔

پھر بھی، بارشیں۔

پہلے پہل کوئی بارش نہ ہوئی تھی۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔

وہ اچھے لوگ تھے۔

لیکن پہلے عورت آئی تھی۔ (کئی برسوں بعد پہلی مرتبہ)۔

اگر آپ بے مچھلی جھیل کے کنارے تھکے بغیر، گھنٹوں، دنوں، مہینوں بیٹھے رہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ننھی سی Mayfly بھی پانی کی سطح پر بڑے بڑے دائرے بنا سکتی ہے، ان دائروں کو بتدریج بڑا اور بڑا بناتے ہوئے۔

عورت کا شوہر بھی تھا۔ (کیا واقعی اس کا شوہر تھا؟ اس کا شوہر ہونے دو۔ ان کے درمیان خوش گوار چیزیں ہونے دو اور کہہ لیں کہ ان میں طلاق ہو چکی تھی اور وہ یہاں دوبارہ ملے تھے۔ کسی بھی صورت میں ہر کسی کے درمیان ناخوش گوار باتیں ہوتی ہیں لیکن وہ پھر بھی وقفے وقفے سے مخصوص جگہوں پر اکٹھے ملتے رہتے ہیں)۔

میں اس ساحل پر تنہا ہوں۔ میں تنہا تھی۔ میں کسی کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ میں کسی کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ میں کسی سے ملی نہیں تھی۔ میں کسی سے ملنے والی نہیں ہوں اور میں کسی سے ملنے والی

نہیں تھی۔

خبردار، یادرکھو: بہار کا اختتام ہوا۔

میں ان لوگوں کو حقیقت میں کبھی نہ جانتی تھی، یعنی وہ عورت، اس کا شوہر، نیلی آنکھوں والا نوجوان، عورت کا بھائی اور نوجوان لڑکی جس کا منگیتر وہ براؤن بالوں والا نوجوان جو نظمیں لکھتا ہے۔ اگرچہ میں ہماری چھٹیوں کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ ہر کوئی ان کے بارے میں پہلے سے جانتا ہے۔ خرچ کیے گئے وقت اور رقم کے بارے میں ناشکر گزار نہ ہوتے ہوئے ہر کوئی کہتا ہے کہ یہ بے حد اچھی، خوب صورت تھیں۔

پتنگا کپڑے کھا جاتے ہیں، زنگ لوہا کھا جاتا ہے، کیڑے سب کھا جاتے ہیں اور ماضی اور حال انسانوں کو کھا جاتے ہیں (لوگ یہی کہتے ہیں)۔

(میں نے چھٹیوں پر جانے سے پہلے یہ باتیں اپنی نوٹ بک میں لکھی تھیں۔)

......سو حال کی طرح تمہیں ماضی کی بھی نگہبانی کرنی پڑے گی......

وہ سب کچھ جو مجھے بتایا گیا اور وہ سب جو میں نے معلوم کیا، اس کے مطابق پہلی نسل جو پہاڑوں سے نیچے آ کر ساحل پر موجود دیہاتوں میں آباد ہوئی تھی، ابھی زندہ تھی۔ وہ بوڑھے ہیں لیکن ابھی بھی موجود ہیں۔ ساحلوں پر بڑے اچھے موٹل اور چھٹیوں میں گھومنے کی جگہیں بنائی جا رہی ہیں۔ جو انہیں تعمیر کر رہے ہیں وہ دہقان نہیں ہیں، وہ تقریباً صرف ایک ہی نسل سے یہاں ہیں۔ جہاں تک یوسف کی بات ہے اس نے تین یا پانچ سال پہلے پہلی مرتبہ ٹائپ رائٹر دیکھا تھا۔ اچھا ان میں سے کس نے تیراکی کے لباس میں ملبوس کسی عورت کو پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا ہوگا؟ (یہ سوال میرے لیے خاصا اہم سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ اہم ہے جب یہ پوچھا جاتا ہے، لیکن یہ وہ سوال ہے جو بڑی جلدی فراموش کر دیا جاتا ہے)۔

میں موٹل کے اندر اور اردگرد مٹرگشت کر رہی ہوں۔ میں ریت پر ٹہل رہی ہوں، سفید رنگ کے پروں والی تتلیوں کے جوڑے کے پیچھے جنگل میں جا رہی ہوں اور سب سے بڑھ کر میں خوابوں کو حقیقت کا متبادل نہ بنانے کے لیے تکلیف اٹھا رہی ہوں۔ علاقے کے مخصوص پودوں کی تیز مصالحے دار مہک شام کو میرے نتھنے جلا دیتی ہے۔ جہاں تک کنیز کی بات ہے آپ کو اس سے ہمیشہ

دُور رہنا چاہیے۔ (عورت اس بارے میں دوسروں کو متنبہ کر سکتی تھی)۔

ایک روز، دوپہر کے فوراً بعد گرلڈ چکن کے ساتھ باغ سے تازہ توڑی گئی زوکینی (Zucchini) سے تیار کیے گئے au gratin کھانے کے بعد بیگونیا اور سرخ سیج جھاڑی سے بجی اپنی بالکنی میں ستا رہی تھی۔ میری آنکھیں نیم وا تھیں۔ دھوپ ابھی تک اتنی تیز تھی کہ میں پہلو بدلتی اور میری ناک کی نوک گلابی ہو رہی تھی، سورج بالکنی سے گزر کر عمارت کی پچھلی جانب چلا گیا۔ اس مقام پر میں احتیاط سے سننے لگی: عورت اس بارے میں دوسروں کو متنبہ کر سکتی تھی۔

ایسا جملہ اور آپ نے دیکھا بغیر کسی وجہ کے۔ پھر میں ہوشیار ہو گئی، میری نیم وا پلکوں کے پیچھے میری نگاہیں دُور نیچے کونے میں کنیر (Oleander) کے جھنڈ پر جم چکی تھیں جہاں ساحل اور مرکزی سڑک ملتے تھے۔ پہلے پہل مجھے ادراک نہ ہو پایا کہ میں غبار آلود سبز پتوں میں گلابی پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جس جملے کا میں نے تذکرہ کیا، وہ بے ساختہ طور پر میرے اندر نہیں ابھرا تھا۔ میں نے کنیر کے جھنڈ کی جانب لوگوں کو بھاگ کر جاتے دیکھا تھا اور سب کے پیچھے وہ عورت۔ سبز، نیلے، گہرے نیلے اور کچھ پیلے رنگ کے نہانے کے لباس میں۔ لمحے بھر کو، سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والے شخص نے کنیر کے پودوں میں چھلانگ لگا دی۔ دوسرے اس تک پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ کنیر کے جھنڈ کے بالکل کنارے پر ہیں۔ عورت ان کے قریب پہنچنے ہی والی تھی کہ وہ سب کے سب غائب ہو گئے۔ لمحے بھر کو۔ لیکن اس قدر مختصر لمحے کو۔ چاقو کی دھار پر وہ لمحہ، بالکل تب جب میں نے سوچا کہ میں نے ایسا کچھ دیکھا تھا اور جب میرے ذہن سے اچانک ایک بے حد انتباہی، ہدایت آمیز، کچھ ایسا جملہ گزرا کہ عورت کو انہیں بتا دینا چاہیے تھا کہ کنیر کے قریب سے نہ گزریں۔

ہاں اسے ان کو متنبہ کر دینا چاہیے تھا، انہیں بتا دینا چاہیے تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ میڈوسا (Medusa) کے سروں پر ابھی تک خوب صورت گھنے بالوں کا تاج تھا۔ Minerva کے مطعون کردہ وہ سر، بالوں کی بجائے اب اپنی زبانوں سے زہر تھوکنے والے موذی زہریلے سانپوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ (میں جہاں بیٹھی اونگھ رہی تھی وہاں سے اٹھتے ہوئے میں نے اس جیسا ایک غیر متعلقہ ٹکڑا اپنی نوٹ بک میں بھی تحریر کیا، کسی وجہ سے......)

کسی وجہ سے؟ قطعی نہیں۔ کیوں کہ بے حد احمق یا بے حد حساس اس عورت کا مستقبل مجھے

حقیقتاً پریشان کر رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ یکدم یوں غائب ہو جائے۔ جیسے کبھی وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ آپ کو یقین کرنا ہوگا کہ میں اس کا انجام تبدیل کرنے کے لیے بھی اپنی سی پوری کوشش کر رہی ہوں۔ تاہم میں کامیاب نہ ہوں گی۔ فطرتاً میں قسمت یا تقدیر کی مخالفت کرتی ہوں، سو میں کوشش کرتی ہوں لیکن میں چاہے کس قدر ہی کوشش کروں یا نہ کروں اور چھٹیوں اور بہت سے آنے والے دنوں میں کتنا ہی کام کیوں نہ کروں، میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ کسی پہلے سے طے شدہ انجام کے مطابق تیار کیا جا چکا ہے۔ مزید یہ کہ عورت نے خود کو اپنے انجام کے مطابق تیار کر رکھا ہے۔ مجھ یہ بالکل آغاز پر واضح کرنا پڑے گا۔ مجھے وہ چیزیں پسند نہیں کہ جن کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑتا کہ آخر میں کیا ہوگا اور مزید یہ کہ وہ چیزیں جو گھڑے ہوئے اسرار سے سجائی جاتی ہیں جب کہ ہر ادراک یا دریافت یا شعور ایک فریب خیال ہوتا ہے۔ بہر حال وہ کیا ہے جسے وہ ''بتانا'' کہتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ یہ زندگی کے متعلق یا زندگی کے ایک حصے کے متعلق ایک نئی گھڑت ہے یا جعل سازی ہے۔ زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ نئے جھوٹ جسے حقیقی خیال کیا جاتا ہے اس سے زیادہ حقیقی بنا کر دکھائے جائیں۔ اگلے وقتوں کے جادوگر اس میں بڑے کامیاب تھے۔ اس قدر کامیاب اور ان کے ناظرین انتہائی ڈرامائی انجامِ داستان، کے منتظر نہ ہوتے تھے۔ چاہے وہ انتہائی متاثر کن یا ڈرامائی انجام خود ناظرین کا ہو...... بہرکیف وہ کیا ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں؟ روشنی جو ہمارے اندر وقتاً فوقتاً چمک دکھاتی ہے۔ وہ روشن لمحے، وہ ننھے ننھے نقطے، ایک ایک کر کے، ایک سے دوسرے سرے تک اکٹھے کیے گئے، بعض اوقات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے، ایک دوسرے کے اوپر دھرے، یا نیچے ڈھلکے ہوئے، نقطوں کا یہ امتزاج جو آگے بڑھتا ہے، مسلسل جگہیں اور سمتیں بدلتا ہوا، یہ بے حد خوب صورت موسیقی تخلیق کرتا ہے۔ ایسی موسیقی جو ہمیشہ جاری ہے جو ہم میں سے کسی کی مداخلت کے بغیر سنائی دے سکتی ہے اور دوسروں کو محض کبھی کبھار، انجام کی وضاحت کے باوجود یہ ہمیں اپنے پیچھے آنے پر مجبور کرتا ہے، یہ ہمیں گھسیٹ لیتا ہے، ہمیں تھکا دیتا ہے، مشکل میں ڈال دیتا ہے، خوشی دیتا ہے، فرحت بخشتا ہے، زہر بن کر ہماری رگوں کو بھر دیتا ہے، پھر بہار کی پُر حدت ہوائیں چلاتا ہے، ہمیں بحال کرتا، دوبارہ زندہ کرتا اور حرکت میں لاتا ہے، ہم بدل جاتے ہیں، یہ خود کو بھی بدل لیتا ہے، ہمیشہ اس طرح آخری لے کو جانتے ہوئے تقریباً تمام وقت دھنیں، المیہ اور طربیہ، ہمارے کانوں سے

کبھی دُور نہیں ہوتیں، ہم میں سے ہر کوئی ان دھنوں سے مختلف مطلب اخذ کرتے ہوئے اور پھر یوں اس موسیقی کو تبدیل کرتے ہوئے اس موسیقی کی ہر لے...... زندگی کے چھوٹے چھوٹے لمحات...... کو ہمارے اندر لاکھوں مرتبہ تبدیل کرتے ہوئے اور اس کی وجہ سے وہ لے، سُر اور دھنیں ہم میں سے ہر کسی کے لیے اتنے مختلف مطلب اخذ کرتے ہوئے، ہم آخری لے کی طرف سفر کرتے ہیں۔ وہاں کم پیچ، سکوت، رفتہ رفتہ چڑھتی ہوئی لے ہوگی، ہم مستقل آخری سر کی جانب بھاگتے جائیں گے، آخری سر یا نوٹ کسی ڈرم کی بیٹ ہوگا یا پھر کسی تار کی گمک یا تھرتھراہٹ جو رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جائے گی اور ختم ہو جائے گی یا پھر "ti" کی ایک بلند آواز جو کسی ہوا کے موسیقی کے آلے میں پھونک مارنے سے سنائی دیتی ہے۔ یہ صدیوں سے لوگوں کے لیے دہرائی جا رہی ہے۔ (پھر بھی ٹی وی کے سامنے ہر کوئی پوچھتا ہے، اس کا اختتام کیسے ہوگا؟)

اگر یہ موسیقی اس سے کچھ زیادہ دیر جاری رہے تو شاید ہم معلوم کرلیں گے۔ نہیں خواتین و حضرات، کسی فلم یا ناول کا اختتام نہیں۔ ہم معلوم کرلیں گے کہ کچھ لوگوں نے بعض دورانیوں میں اس قدر تکلیف کیوں اٹھائی یا اتنے مصائب کیوں برداشت کیے۔ ہم جان لیں گے کہ سسکیوں میں ہنسی کے سُر کیوں شامل ہوتے ہیں، ہنسی میں سسکیوں کے سُر کیوں موجود ہوتے ہیں۔ ہم مستقبل کا نغمہ، راگ یا آہنگ جان لیں گے......

یہ سمجھ سے باہر ہے! اس خوب صورت فطرت کے قرب میں جب میری نگاہیں اپنے ہر جانب ہر وقت بے پرواہ، بے فکرے لوگوں کو دیکھتی ہیں، یہ سمجھ سے باہر ہے!

یقیناً بارشیں کچھ مزید روز رک سکتی تھیں۔ دھوپ بھرے دن کچھ مزید عرصہ جاری رہ سکتے تھے۔ پھر اس عورت کو بھی معلوم ہوسکتا تھا اور ہوسکتا ہے کہ جس لمحے اسے معلوم ہوا تھا، اسی لمحے وہ گم گیا تھا یا کھو گیا تھا۔ اس لمحے جب موسیقی اپنے آخری سُر کو پہنچ چکی تھی، شاید اس پر بھی سب کچھ کھل کر واضح ہو چکا تھا۔ لیکن ہم، چاہے ہم یہ جاننے میں کامیاب ہوسکتے ہیں کہ وہ دوسروں کے جانے کے بعد تین دن رات تک کیا بتانے کی کوشش کرتی رہی تھی...... یعنی چاہے ہم وہ کاغذات حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں...... ہم کبھی نہیں جان پائیں گے کہ جب وہ رخصت ہوئی تو اسے کیا علم ہوا۔ یہ بھی کہ تمہیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم نے بھی وہ کاغذات حاصل نہیں کیے ہیں۔ یہاں ہم صرف یہ فرض

کر سکتے اور جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ اس عورت نے تنہائی میں کس کا ذکر کیا تھا۔ وہ موسیقی اسی لیے شروع ہوئی ہے کہ اسے تحت الشعور میں سنا جائے اور اسی وجہ سے ہم ''سنو'' کے لفظ کے ساتھ اپنی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں......اور یہ بہت سی باتوں کی وضاحت نہیں کرتا۔

تاہم تم شام کے اوّلین لمحوں میں جب سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے، قریب سے گزرنے والے اس سنہری بالوں والے نوجوان سے مل سکتے ہو۔ وہ لڑکی اور لڑکے درمیان کچھ ہے اور وہ تم سے کہتا ہے، ''سب کچھ ویسا ہی ہوا ہے جیسا اسے ہونا چاہیے تھا۔''

اور جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اچھا، لیکن کیا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، اس لیے یہ ہوا؟

درحقیقت میں ایسے سوالات کو خود تک پہنچنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، میں پوری طرح چھٹیوں پر ہوں۔ ریلیکس!

تم ان ساحلوں پر غیر معمولی آوازیں ہی سن سکتے ہو۔ مثال کے طور پر، نفیری کی وہ وجدآور آواز اس مقبول گیت میں گڈمڈ ہو سکتی ہے، جس کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے، Now, you're far away.... لیکن اس گیت کی بازگشت ٹیرس سے اور کسی قدر دھاتی میکانکی دھنوں والی نفیری کی وجدآور آواز کی بازگشت ساحل سے آنی چاہیے تھی یا اس کی بجائے کسی نامعلوم جگہ سے۔

کل سے بارشیں شروع ہو جائیں گی۔

موٹل کا مالک اس گھر کو بھی اپنے موٹل میں شامل کر لے گا۔ (مت بھولو کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب ہیں)۔

سب کچھ ویسے ہی ہوتا ہے جیسے اسے ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اسے سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ مشکل ان چیزوں کا وزن کرنے کے قابل پانا ہے......اس تمام جمع شدہ سامان کے ساتھ جو وہ اپنے ساتھ لاتے ہیں......جو اس طرح سے واقع ہوتی ہیں جیسے انہیں ہونا چاہیے۔ تا کہ ''ہونا'' اور ''ہونا چاہیے'' ایک ساتھ فٹ ہو سکیں۔ شاید تبھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا بھی اس میں حصہ ہے جو ہونا چاہیے۔

آغاز سے اب تک، جیسا کہ میں نے ممکن حد تک واضح طور پر وضاحت کی ہے، میں ان ساحلوں پر کچھ سمجھنے، کہہ لو تلاش کرنے، نہیں آئی تھی۔ میرے معاملے میں بھی سب کچھ ویسا ہوا ہے جیسا اسے ہونا چاہیے۔ یعنی ایک غیر متوقع لمحے میں روشنی کا کوندا لپکا، جہاں روشنی ہوئی وہاں کی کچھ

چیزیں میری آنکھوں میں منعکس ہوتی رہی ہیں اور میری نگاہوں میں منعکس ہونے والی ان چیزوں کو کوئی معنی پہنانے کی کوشش میں میرا دماغ ناکام رہا ہے۔ اس طرح ہو چکا ہے، یہ سچ ہے لیکن ان ساحلوں پر بھی ہر شے میری آنکھوں کے سامنے آتی اور غائب ہوتی رہی۔ روشنی مختلف لمحوں میں کوندتی ہے اور یہ ہمیشہ مختلف عکس بناتی ہے۔ رنگ مسلسل ایک سے دوسری قسم میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ پُرآب یا سیلابی پرانے ساحل لہروں کے واپس پلٹنے پر اچانک ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور اس کے مخالف جو آپ کچھ دیر پہلے تک پوری وضاحت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، دُور اور دُور ہٹتے ہوئے ایک گہرے نیلے سرمئی پردے کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔ پانی کی سطح کا ابھرنا اور پلٹنا، اعتبار اور Defination کا وہ احساس نہیں دیتا جو ٹھوس زمین دیتی ہے لیکن لوگ معمولی چیزوں کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے اب بھی ان ساحلوں پر وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔ ایک ناقابل روک خواہش۔ یادِ ماضی کی طرح۔ ہماری آنکھیں سمندر کو کسی لامحدود وصل کی طرح زمین کو چومتے دیکھتی ہیں، اسی دوران ایک بے انت عداوت اور اسی طرح وہ سختی اور نرمی کا، زندگی اور موت کا، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اندر، مشاہدہ کرتے ہیں۔

مختصراً سب کچھ کسی چاقو کی دھار پر ہے۔

میں بھی ان ساحلوں پر جہاں میں آرام کی غرض سے آئی تھی، کسی چاقو کی دھار پر تھی۔ میں خود کو عورت اور اس کے ساتھ موجود باقی لوگوں تک جانے سے روک نہ پائی، لوگ جو ایک لمحے ظاہر ہوتے اور اگلے لمحے غائب ہو جاتے تھے۔ جہاں تک سنسان گھر کی بات ہے، اس کی کھڑکیاں دروازے بغیر کسی وجہ کے کھلے ہیں۔ باغ میں آگ روشن ہے، ٹیرس پر لوگ منڈلاتے ہیں، بعض راتوں کو میں ایسی ہنسی کی آوازیں سنتی ہوں جو سسکیوں سے مشابہ ہیں۔ پھر یہ تمام چیزیں ایک دوسری میں ضم ہو جاتی ہیں اور شروع سے آخر تک ایک دوسرے سے جڑ جاتی ہیں، نیم اداس نیم مسرور موسیقی کی دھنیں ہمارے کانوں میں بھر جاتی ہیں۔ میرے لیے اب چاقو کی دھار سے نیچے اترنا مزید ممکن نہیں رہا ہے۔

❋❋❋

II

میں نے دیکھا کہ کیسے
انار کے رنگوں نے ڈھانپ لیا
پہاڑوں کو، سمندر کو
چند قدم آگے
ساحل ہے
نقرئی پروں والے پرندے
تمنا کے کھنڈرات میں۔

یوں لگتا تھا جیسے بارشیں کبھی نہ آئیں گی۔

آسمان گہرا نیلا تھا۔ سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ وہ اتنا روشن تھا کہ آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔

وہ جنوب میں ساحلی سڑک تھی۔ سڑک اچانک سمندر کی جانب مڑی پھر اس نے کچھ دیر خشکی کی طرف رخ کیا اور پھر دوبارہ ساحل کی جانب لوٹ آئی۔ سمندر کا رنگ اب گہرا نیلا ہے مگر عموماً وہ نیلگوں سبز ہوتا ہے۔ خیر مقدمی انداز میں وہ سڑک کے قریب سے قریب تر آتا گیا۔ وہ دُور فاصلے پر

پھیلنے والی کہر کوتحلیل کرتے ہوئے سڑک کے قریب تر آگیا اور ایسا کرتے ہوئے جب یہ ساحل کے ساتھ ساتھ موجود چٹانوں میں داخل ہوا اور واپس پلٹا تو سمندر سے ایک گنگناتی ہوئی آواز ابھری۔ یوں تھا جیسے یہ گنگناہٹ ایک صابر اشتعال کی تیاری تھی۔ جیسے کسی دل کو سمندر میں ڈبویا جا رہا تھا اور کوئی چیخیں نہ اٹھتی تھیں۔

(میں سمندر کا خشکی سے تعلق اسی انداز میں دیکھتی رہی ہوں اور خصوصاً شمال کی جانب انطالیا (Antalya) اور الانیا(Alanya) کو سفر کرتے ہوئے ساحلی سڑک پر تقریباً دن کے انہی اوقات میں، اس لیے میرا یہ سوچنا قدرتی سی بات ہے کہ وہ عورت جس کا میں پیچھا کر رہی ہوں، وہ بھی اسے اسی طور دیکھتی رہی تھی۔ مزید یہ کہ چوں کہ میں یہ تاثرات دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں، یہ بھی بالکل واضح ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ وہ انہی جذبات وتاثرات سے گزریں چاہے وہ کبھی ان جگہوں سے گزرے ہوں یا نہیں۔ یہ دوسروں کو خود ان کی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی دعوت بھی ہے اور اگر ممکن ہو تو اس میں اضافہ کرنے اور اسے مالا مال کرنے کی، وہ سب کچھ جو میں اس عورت کو دُور فاصلے سے دیکھنے پر اپلائی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ درحقیقت میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ دوسروں کو ایک طرح سے ستانا ہے۔ اچھا، درحقیقت اگر کوئی یہ بتا نہ رہا ہوتا تو اتنے سارے لوگ بظاہر بلا وجہ جنوب کی اس ساحلی سڑک پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے)۔

سو پھر، ریت کے ٹیلوں سے خبردار رہو۔ اس قدیم فصیل کے کھنڈرات سے خبردار رہو جس میں یہاں وہاں جڑی بوٹیاں اُگ رہی ہیں۔ کیلے کے جھنڈ، ان کے پیچھے کہیں کہیں بعض جگہوں پر پس منظر میں رہتے ہوئے اور کہیں سمندر تک پھیلتے اور واپس لوٹتے ہوئے، صنوبر کے جھنڈ۔ صبح کی پُرسکون فضا میں شہد کی خوشبو اور فضا میں ملی جلی مہندی کے پتوں اور پرالی یا پیال کی باس ابھی چٹانوں کے پرے سے آنے والی اور خشکی پر پھیلنے والی آیوڈین کی بُو پر غالب نہ آئی تھی۔ سڑک جب ساحل کو کچھ دیر کے لیے چھوڑ کر پیچھے ہٹتی ہے تو یہ بُو بھی بدل جاتی ہے۔ یہ بُو یا باس۔ (جب کبھی میں گاؤں کے سامنے سے گزروں یا مرکزی سڑک پر چلوں۔ یہ بُو مجھے محسوس ہوتی تھی)۔ وہ ابلے ہوئے سبز لوبیے کی بو جیسی تھی۔ سبز ابلے ہوئے لوبیے کی وہ بُو سڑک کی دونوں اطراف پھیلے کاٹیجز میں سے بھی آتی تھی...... ان دنوں ...... پرگولا (Pergola) کے نیچے، اناروں اور ترنج کے پیڑوں تلے، کپاس پر چھڑکی گئی

کیڑے مار دوائیوں، کیلوں پر کیلشیم کاربائیڈ اور مالٹے اور لیموں کے پودوں پر سلفر کیمیکلز کے چھڑکاؤ کی بو پر غالب آتی ہوئی۔ سبز لوبیوں کے اتنے ڈھیر کو کون ابالتا اور رگڑ رگڑ کر دھوتا ہوگا؟ بحیرۂ روم کی پانیوں کی کن پریوں کے لیے؟ کن Athenas کے لیے؟ کس Tyche کے لیے، قسمتوں اور شہروں کا محافظ؟ (امید ہے کہ آنکھ یا ذہن کے ذریعے حقیقت کو یوں مسخ کرنے سے کوئی الجھن نہیں اٹھ کھڑی ہوگی۔ اگر ہوتی ہے تو یہ الجھن بھی خود ہی تلاش کر لے گی کہ اس کے لیے کیا ٹھیک ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں، جب تک کہ ہماری نگاہ گری ہوئی دیوار یا فصیل کے کسی حصے کو چھوتی ہے تو جیسے یہ خوشبوئیں ہمیں اپنے پیچھے گویا کھینچتے ہوئے قبل از تاریخ دَور میں لے جاتی ہیں۔ وقت، جب ہم اسے بسر کر رہے ہوتے ہیں، یہ کبھی تاریخ کی کسی سیدھی لکیر پر نہیں چلتا)۔

مرکزی سڑک پر عمودی ڈھلان پر چڑھتے ہوئے بس کی رفتار کم ہوگئی، وہ میدان کے قریب دیوار کے آخری حصے کے پاس رُک گئی جہاں سامنے کسی کی سخاوت کا ثبوت آبی فوارہ موجود تھا۔ (عثمانی دَور میں عوام کو پینے کے پانی کی فراہمی کے لیے بنائے گئے فوارے)۔ اپنے مقبروں کے قریب مرحومین شاید اس لیے یہ فوارے بنواتے تھے کہ پانی پینے والے ان کی ارواح کے لیے فاتحہ بھی پڑھ دیا کریں گے (ان آبی فواروں کا بعد میں قدیم رومی شہروں کے فواروں سے موازنہ کیا جاتا تھا)۔ اب مرکزی سڑک کی خشکی والی جانب گاؤں پیچھے اور سمندر آگے تھا۔ ایک عورت بس سے اتری۔ اس کی عمر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ دبلی پتلی ہے، اس میں زیادہ نسوانی پن نہیں ہے لیکن مردانہ پن بھی نہیں ہے۔ (میرا خیال ہے کہ میری نگاہوں کے سامنے یہ سب کچھ بالکل حقیقی ہے، لیکن پھر بھی میں مکمل طور پر پُریقین نہیں ہوں)۔ وہ اپنے بائیں کندھے پر خاصا بڑا سا بیگ لٹکائے بس کے اگلے دروازے سے نیچے اتری تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹائپ رائٹر تھا۔ (کیا یوسف نے اس سنسان گھر میں موجود ان لوگوں کے پاس ایک پرانا ٹائپ رائٹر موجود ہونے کی بات کی تھی جس کی Keys وہ دباتا رہتا تھا، کلک کلیک؟) وہ غیر ہموار بچھائی گئی بجری پر چلی جو پتھر کی دیوار اور میدان کے سامنے وسیع جگہ اور اسفالٹ یا تارکول کے درمیان پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چند الٹے قدم بس کے پچھلے دروازے کی جانب چلی اور وہاں سے پکڑایا جانے والا اپنا سامان لے لیا۔ اس نے سامان نیچے رکھا، کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ بس کے رکنے اور کھڑے ہونے پر اس کے انجن کے

ارتعاش میں اضافہ ہوگیا۔ پہیے دوبارہ مڑے۔بس اپنے باقی مسافروں کو لے کر سست رفتاری سے عمودی ڈھلان پر آگے بڑھ گئی۔ کھلے لمبے ساحل اور سمندر کی جانب وہ دائیں طرف مڑ گئی۔ وہ اس کھاڑی کے قریب سے گزری جو گویا بڑا سا منہ کھولے سمندر کنارے موجود تھی، وہ سمندر میں آگے نکلے ہوئے خشکی کے اس قطعے کے قریب سے گزری جہاں گہرے سایوں والے صنوبر کے درختوں کا گھنا جھنڈ موجود تھا اور پھر وہ دُور مشرق......الانیا کی جانب نظروں سے اوجھل ہوگئی۔عورت نے بس کی جانب ہاتھ ہلایا۔

دو کاریں چڑھائی چڑھنے لگیں، وہ وہاں سے گزریں اور مخالف سمت میں مناوگت (Manavgat) (انطالیا صوبے کا ایک ضلع)۔سیدہ۔انطالیا کی جانب آگے بڑھ گئیں۔گاڑیوں کے مسافر لمحے بھر کو میدان سے گزرتے رستے کے آخری سرے پر فوارے کے سامنے کھڑی عورت کو دیکھ سکتے تھے۔وہ اس کی عمر کا اندازہ نہ کر پائے۔ وہ خاصی خوب صورت عورت تھی اور بس۔ وہ مٹیالے رنگ کی سکرٹ اور لائنوں والی کھلی سی ٹی شرٹ پہنے ہوئی تھی۔اور در حقیقت تمہارے دماغ میں بس کے چلے جانے کے بہت دیر بعد بھی اس کا ہوا میں معلق لہراتا ہاتھ رہ گیا۔ وہ ہاتھ یوں لگتا تھا کہ جیسے سرمئی نیلے خالی پن سے بیابان علاقے سے بہت سی چاہی جانے والی قیمتی چیزیں ایک ساتھ اکٹھی کر لینا چاہتا ہو۔(میری ایک دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس پر ایک روز یہی احساس غالب آ گیا تھا جب اس نے خود کو ایک ایسی قدرتی صورتِ حال میں پایا جس کی اس نے بہت کمی محسوس کی تھی اور برسوں سے اس سے نہ گزری تھی، اس نے کہا تھا،''اس لمحے میں اپنے کسی ہاتھ سے سب کچھ سمیٹ لینا چاہتی تھی۔'')

عورت نے زمین پر سے بیگ اٹھایا۔اس نے ہائی وے کی دوسری جانب نیچی پہاڑیوں کی جانب اپنی پشت کر لی، ان کا ٹیجز کی جانب جو اب کم ہوتے جا رہے تھے اور بس کہیں کہیں ہی دکھائی دیتے تھے۔وہ چلنے لگی۔ چند قدموں کے بعد وہ رک گئی۔کیچڑ سے ہوشیار رہو!(اُن دنوں میں ......اب اُسے کنکریٹ کی سلوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے)۔

آبی فوارے سے پھوٹتے اور رِستے پانی نے، جہاں وہ کھڑی تھی اور گزرگاہ کے درمیانی راستے کو کیچڑ کی دلدل بنا دیا تھا۔کیچڑ کی دلدل میں جڑی بوٹیاں اُگ آئی تھیں۔ یہ بتانا ناممکن تھا کہ اگر آپ وہاں کوئی غلط قدم اٹھا لیتے تو آپ کا پیر وہاں کتنا گہرا جاتا۔(اسی مقام پر سڑک کے

کنارے قطار در قطار کھڑے پام اور کنیر کے درختوں نے میرا خیر مقدم کیا تھا۔ پام کے درختوں کو تراشا گیا تھا اور کنیر سفید اور گلابی پھولوں سے بھرے تھے اور ان کی شاخیں، جن میں سے ہر کوئی اپنی جگہ چھوٹا سا پیڑ تھی، ان پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔ تہذیب زندہ باد!)

عورت نے اپنے بائیں ہاتھ میں ٹائپ رائٹر کو تھام رکھا تھا، اُسے سختی سے پکڑے ہوئے وہ کیچڑ کی دلدل میں ایک سے دوسری جگہ پر پھلانگ رہی تھی۔ اپنے سامان کو دائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے جیسے ہی وہ اس جگہ سے گزر کر آگے بڑھی، اس نے خود کو آبی فوارے کے قریب پایا۔ خود کو پانی میں قدم رکھنے سے بچانے کی خاطر وہ فوارے کے کنارے تک گئی، کچھ لڑکھڑائی لیکن پھر اس نے اپنا توازن قائم کرلیا۔

مرکزی سڑک اور کھیتوں کے درمیان موجود فوارہ بڑا بدصورت تھا۔ ٹیڑھی دیواروں والے فوارے کی اونچائی 6 فٹ تھی۔ عطیہ کرنے والے کا نام پتھر پر کندہ تھا اور اس کی تعمیر کا سال اس کے سامنے کے حصے پر نقش کیا گیا تھا۔ فوارے پر کبھی سفید پھیری گئی تھی جس کے اب آثار ہی باقی تھے۔ جو کچھ باقی بچا تھا، اسے کیچڑ، سیاہ پینٹ اور کالے تارکول کے نقش و نگار نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مختلف سائزوں کے صنوبر کی شاخوں کے دائرے نے عطیہ کرنے والے کے نام کو گھیر رکھا تھا۔ ایک تنگ پائپ کے ذریعے فوارے سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پانی پینے کا نل بند ہو چکا تھا اور بے حد گندا تھا۔ نتیجے کے طور پر انگلی برابر قطر کی پانی کی دھار بہنے لگی اور فوارے کے گرد مزید جگہ گیلی ہوگئی۔ (یہ فوارہ اس چیز کا نتیجہ تھا جسے ہم اس زمانے کی دیہی فری انٹر پرائز کہہ سکتے ہیں۔ دوسری طرف اب میں شہری فری انٹر پرائز کی دوبارہ واپسی دیکھتی ہوں......)

کیچڑ میں ایک مینڈک نے چھلانگ لگائی۔ پتھر کی دیوار کے پیچھے میدان کے قریب موجود فوارے کے کنکریٹ کے بیسن سے متواتر ٹرانے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پینے کے نل سے بہتے پانی کے باوجود بیسن میں بہت کم پانی تھا۔ کائی جم چکی تھی۔ اس میں سے بدبُو اُٹھ رہی تھی اور چھوٹی چھوٹی مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی تھیں، پانی کی بجائے چیخنے اور چرچراہٹ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں یوں جیسے بیسن سے جاری چشمے سے لے کر ڈھلان کے آخر ساحل سمندر تک کوئی مخلوق خشک شاخوں اور پتوں تلے رینگ رہی ہو۔ ڈھلان زینہ در زینہ مغرب کی جانب اترتی اور دُور فاصلے پر موجود جنگل

تک پھیلی ہوئی تھی ۔ چشمے کے کناروں پر قطار در قطار خروب (Carob) اور کنیر کے درخت اور گنجان جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، جس کے آگے میپل کے گھنے جھنڈ تھے جو ان قطاروں سے آگے جنگل تک پھیلے ہوئے تھے ۔ میپل کے پتے یہاں وہاں گر رہے تھے......

جھاڑیوں سے اچانک ایک پرندے نے اڑان بھری (آہ، ان جنگلات کا سلسلہ ابھی بہت سے لوگوں کو دیکھنا تھا: کسی بھی لمحے آپ کے سامنے اچانک اڑان بھرنے والا ایک پرندہ اچانک آپ کو چونکا دیتا ہے ۔ اگر آپ خود کو پُرسکون کر لیں اور صاف شفاف پانی کے ذخیرے پر جھکیں تو آپ کو فوراً ہی پانی کی دیوی (Naiad) کا چہرہ دکھائی دے گا ۔ جس جانب پرندے نے اُڑان بھری تھی عورت نے اس طرف نگاہ کی: آگے، نیچے جہاں آسمان سمندر کو چھوتا تھا اور اس میں ضم ہو جاتا تھا، وہاں ایک مدھم کہر آلود نیلاہٹ، جہاں سمندر کم گہرا یا پایاب تھا وہاں نقرئی نیلاہٹ سے مل جاتی تھی ۔ ساحل پر چوڑی پُرسکون اتھلی لہروں سے بننے والے سفید جھلملاتے چوڑے چوڑے دائرے کسی نفیس ترین شیفون جیسی کہر کے پردے تلے دیکھے جا سکتے تھے ۔ وہ صبح کا وقت تھا ۔

بڑی کھاڑی یا خلیج جس کا ایک حصہ دُور پرے جنگل سے ملا ہوا تھا، اس پر کہر دوپہر تک تحلیل ہو جاتی ۔ کچھ دیر بعد سمندر کی جانب جنوبی سمت سے ہوا چلتی اور اس کہر کو خشکی کی طرف لے آتی ۔ اس کے بعد یہ شمال اور شمال مشرق میں پہاڑوں کی چوٹیوں کی جانب واپس پلٹ جائے گی اور زیادہ گہری ہو کر وہاں جم جائے گی ۔ رات کو خشکی کی جانب سے پہاڑوں کی طرف ہوا چلے گی اور کہر کو پہاڑوں کے کنارے تک لے جائے گی ۔ پھر یہ کہر یوں دکھائی دے گی جیسے وہ دُور پرے کی لامتناہی تاریک شے ہو اور دوبارہ سمندر کی جانب دھکیلی جائے گی، دوبارہ اسی جانب جہاں سے یہ آئی تھی ۔ جاتے جاتے یہ زمین کو، گلابی پھولوں، کنیر کے پیڑوں کو نم آلود کر جائے گی، یہ ساحل کو بھی نم کر دے گی اور صبح سویرے جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں پر شبنم کے قطرے چمکیں گے ۔ دن نکل آئے گا، ہر روز کا سا بے داغ آسمان، سمندر جو مسلسل سرمئی سبز سے فیروزی رنگ اختیار کر رہا ہو گا اور اپنے گہرے اور دُور ترین حصوں میں گہرا نیلا ہوتا چلا جائے گا ۔ ان بارشوں کا کبھی کوئی اشارہ نہ دے گا جو ایک مرتبہ شروع ہو جائیں تو کئی روز تک نہیں رکتیں ۔

یوں لگتا تھا جیسے بارشیں کبھی نہ ہوں گی ۔

عورت دلدلی علاقے کی طرف پشت کر کے چلنے لگی، کائی زدہ حوض اس کی دائیں جانب تھا۔ گردآلود راستے پر زیادہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پھر رک گئی۔ اسے وہاں پرانی بچی کھچی عمارتی لکڑی سے بنا وہ ڈھکا ہوا رستہ یا کنج (پرگولا) دکھائی دیا جہاں دلدل ندی سے جاملتی تھی۔ اس پرگولا کے اوپر تربوزوں کے چھلکے خشک کرنے کے لیے رکھے گئے تھے جن کے کنارے دھوپ میں مڑ گئے تھے۔ ان پر ابھی تک مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ چھلکوں کے کچھ حصوں میں ابھی تک گودا باقی تھا۔ مکھیاں ان حصوں پر جمی بیٹھی تھیں۔ اردگرد بکھرے بہت سے بیج دیکھ کر کوئی سوچ سکتا تھا کہ اس پرگولا کو پابندی سے استعمال کیا جاتا رہا تھا لیکن ابھی اردگرد کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا...... پوری جگہ پر مکھیوں کی شدید بھنبھناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ چشمے کے کنارے، جہاں سے وہ گردآلود رستہ شروع ہوتا تھا، قطار در قطار اُگے میپل کے درختوں میں سے ایک پر ایک عندلیب گیت گارہی تھی، جس کی آواز کسی نامعلوم سمت سے آتی غیر فطری گرجتی ہوئی آواز پر غالب آرہی تھی۔

وقت کی پرواہ کیے بغیر عندلیب مسلسل مستقل مزاجی سے گائے چلی جارہی تھی۔

(اپنے نیم کھلے پپوٹوں سے اس سڑک کو دیکھتے ہوئے آپ ان غیر معمولی آوازوں کو سننے پر مجبور ہیں!)

دیکھو سمندر کا دیوتا پروٹیس (Proteus) سمندر سے ابھر رہا ہے،

سنو، جل دیوتا ٹرائٹن (Triton) اپنی بانسری بجارہا ہے۔

عورت نے پہلے سنا اور پھر وہ مسکرانے لگی۔ قریب سے دیکھنے والا کوئی شخص جان سکتا تھا کہ وہ ایسی مسکراہٹ تھی جس نے اسے بالکل نوجوان بنا دیا تھا۔ اس کا دبلا پتلا وجود، بیگز اٹھائے اس کی بانہیں، ٹائپ رائٹر، رستے پر آگے بڑھتے ہوئے اس کی دلکشی اور سب سے بڑھ کر اس کی مسکراہٹ کی وجہ سے اس کے کسی حزن میں ڈوبے جھریوں بھرے چہرے پر توجہ نہیں جاتی تھی۔ کچھ دیر قبل مخالف سمت سے تیزی سے آتی گاڑیوں میں گزرتے لوگوں نے لمحے بھر کو اسے دیکھا تھا، انہوں نے اس کے وجود کے ہر پہلو سے جھلکتا حزن آلود حسن دیکھ لیا تھا۔ راستے کے آغاز میں وہ بالکل ایسے کھڑی تھی جیسے اس منظر کا لازمی جزو تھی۔ سمندر، لہروں، صنوبر کے درختوں، ریت، چونے جیسی مٹی، بہت سے کانٹوں اور حتیٰ کہ دلدل اور کیچڑ کے چھوٹے سے حصے کی طرح۔ سو وہ راستے کے ساتھ ساتھ چلنے

لگی۔ اس نے سمندر کا ایک اور جانا پہچانا حصہ دیکھا۔ اس کی دائیں جانب چند ایکڑ کے بعد سمندر چٹانوں کے دامن میں سبزی مائل سے مغرب کی جانب پھیلا ہوا تھا۔ مغرب کی جانب اور جنوب کی سمت۔ کسی رکاوٹ، کسی پہاڑی، کسی راس (Cape) کے حائل ہوئے بغیر وہ پوری طرح پھیلا ہوا تھا۔

عورت کی اپنے گردونواح کی عادی نگاہ اچانک حیرت زدہ رہ گئی۔ بھنبھناہٹ جو اس نے کچھ دیر قبل سنی تھی وہ کسی قدرتی چیز سے نہیں آ رہی تھی.... ہر وہ جو اپنی بانسری بجاتا ہے یونانی دیومالا کا جل دیوتا ٹرائٹن نہیں ہے......اس نے جو سنا وہ ہتھوڑے، زنجیری آرے کی آواز، کسی انجن کا شور، دھاتوں کے بجنے کی آواز تھی، جو بالکل بھی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی نہ تھی۔ پھر اس کی بائیں جانب، چشمے سے پرے، ساحل اور سمندر پر اترتی پہاڑی ڈھلان پر، زمین کی ڈھلان پر اسے اینٹوں کا ڈھیر، معماروں کے بلاک، سٹیل اور سیمنٹ دکھائی دیئے۔ وہاں پہاڑی دامن کے کھلے میدان میں بڑے بڑے درخت، خرنوب کے سخت سیاہ پھل والے درخت جن پر مکڑیوں کے جالے لٹکے ہوتے، ہونے چاہئیں تھے، اب وہ وہاں نہیں تھے۔ جنگل اپنی جگہ راکھ اور نمک کی رنگت کا چٹیل میدان چھوڑ کر ختم ہو چکا تھا اور ان جگہوں پر جہاں راکھ کی رنگت کھاری زمین، سمندر تک چلی جاتی تھی، مقامی پتھر کی بنیادوں والی عمارتوں سے بھری تھی، جن میں سے بیشتر اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں...... اسے آٹھ مستطیل عمارتیں دکھائی دیں جن میں سے دو ڈھلان کے مختلف چبوتروں یا اترائیوں پر تھیں اور ان کی دیواریں ابھی تک نامکمل تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عود کر آئی حیرت کی بدولت اس کی بھنوؤں کے اوپر دو لکیریں بن گئیں۔ وہ دوبارہ چلنے لگی۔ اس کی عمر کچھ بڑھ گئی تھی۔

(میری نگاہیں دُور سے اس کا پیچھا کرتی رہی ہیں، کچھ دیر کو۔ اس وجہ سے، چوں کہ میں نہیں بتا سکتی کہ ان تبدیلیوں سے متعلق جن کی اسے توقع نہیں تھی، وہ کیا محسوس کرتی اور سوچتی ہے، ہمیں اس کی دونوں بھنوؤں کے بیچ بننے والی دو لکیروں پر گزارا کرنا ہوگا اور یہ بھی سچ ہے کہ اس سے عمر تیزی سے پانچ سے دس سال زیادہ نظر آنے لگتی ہے۔ کچھ دیر پہلے وہ کہیں نوجوان دکھائی دی تھی)۔

سڑک کو ہموار کرنے اور بارش کے دوران وہاں جوہڑ بننے سے بچاؤ کے لیے راستے پر ایک بل ڈوزر چلایا گیا تھا۔ اس سے عورت کو چلنے میں مزید آسانی ہوگئی تھی۔ وہ اس سڑک پر چلنے لگی جو جزیرہ نما کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ مغرب کی جانب زمین، سمندر کنارے موجود چٹانوں پر

جا کر ختم ہو جاتی تھی، جہاں ابھی تک مکئی اور کھیروں کی کاشت ہو رہی تھی...... یہ اس بات کی نشانی تھی کہ تا حال کسانوں نے اس جزیرہ نما کو پوری طرح چھوڑا نہیں تھا...... اور پتھر کی ایک چھوٹی سی دیوار! اسے سڑک سے الگ کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دیوار، رواں یا چلنے والے پتھروں کو جمع کرنے سے تعمیر کی گئی تھی۔

چلنے والے پتھر...... کہا جاتا ہے کہ جب خانہ کعبہ کی تعمیر کی جا رہی تھی تو بہت سے پتھروں کی ضرورت تھی۔ اردگرد کے پہاڑوں اور پہاڑیوں پر موجود بڑے چھوٹے تمام پتھر چلتے ہوئے خانہ کعبہ کی جائے تعمیر کی جانب آنے لگے۔ وہ تیزی سے لڑھک رہے تھے۔ جب وہ پتھر جائے تعمیر کی طرف لڑھکتے چلے آ رہے تھے تو پیغمبرؑ کی جانب سے خبر آئی: ''بس، خانہ کعبہ کی تعمیر ہو چکی ہے۔ کعبہ کی دیواریں مکمل ہو چکی ہیں!'' وہ پتھر جو خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے بروقت نہ پہنچ پائے تھے، ماندگی کے عالم میں جہاں تھے وہیں رک گئے۔ جنگ میں کسی فوج کی جانب سے پیچھے چھوڑی گئی لاشوں کی طرح۔ تھکن سے شل سپاہیوں کی طرح۔ اب دوسرے اُن سے نئے کعبہ تعمیر کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں وہ پتھر سانس لینے کو رکے تھے، نئے کعبوں کی دیواریں تعمیر جا رہی ہیں...... (ٹی وی اشتہاروں کی طرح جو ایک سیکنڈ میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ دیتے ہیں)۔

ان پتھروں سے تعمیر کی گئی نیچی دیوار، مغرب کی جانب زمین کو سڑک سے الگ کرتی تھی۔ آنے جانے والے ٹرکوں کے ربر کے بھاری پہیوں کے باعث سڑک ہموار ہو گئی تھی۔ پتھروں میں جڑی بوٹیاں اُگ آئی تھیں۔ جنگلی گلاب کی جھاڑیوں کے پھول عرصہ ہوا جھڑ چکے تھے...... دیوار کے اوپر اور بنیاد کے ساتھ موجود آلائشیں، جو جانے کسی جانور کی تھیں یا انسان کی، خشک ہو چکی تھی...... ڈٹرجنٹ کے ڈبے، ڈبہ بند خوراک کے خالی ڈبے، لیموں کے خشک چھلکوں کے ڈھیر، کسی ٹائر سے بنایا گیا کسی دہقان کا ایک جوتا، غیر ملکی لیبل والی سورج کی تمازت سے بچاؤ کے لوشن کی ایک خالی ٹیوب، سب ایک دوسرے کے اوپر، ساتھ ساتھ پڑے تھے......

اپنی بائیں جانب ڈھلان پر کنکریٹ، سٹیل اور اینٹوں کے ڈھیر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے عورت آگے بڑھنے لگی۔ اب وہ ان عمارتوں، اُن ڈھیر کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتی لیکن دھاتوں کے ٹکرانے اور بجنے کی وہ پتلی سی آواز اور موٹر کی آواز نہیں رکتی اور نہ ہی اس کا پیچھا چھوڑتی ہے۔ (وہ

تقریباً100 گز مزید اس سڑک پر چلتی رہے گی)۔

وہ جزیرہ نما کے آخری سرے تک جو بحیرۂ روم میں دائیں، بائیں اور سامنے پھیلا ہوا تھا، سڑک پر تقریباً100 گز آگے تک چلتی رہی۔ چلتے ہوئے اس کی راہ میں میپل کا ایک بھی درخت نہ آیا جو موسم کی نشان دہی کرتا۔ وہاں، کھاڑی کے بالکل آخر میں ایک چھوٹا سا یک منزلہ گھر تھا...... سمندر، پہاڑوں اور آسمان کی طرح وہ گھر اب بھی وہاں موجود ہے...... وہ اسی جانب جارہی تھی۔ اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ یہاں تک کوئی بھی مشین نہ لائی جاسکتی تھی۔ وہ پتھروں اور جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں لمحے بھر کو لڑکھڑائی۔ جب وہ سیدھی ہوئی تو اُسے دُور فاصلے پر گھر کی چمنی دکھائی دی۔ تیز بے رحم سمندری ہواؤں نے چمنی کو بجھا دیا تھا۔ (اور وہ اب تک ایسی ہی ہے)۔

عورت حیران نہ ہوئی تھی۔ اس کی پھرتی اور عجلت بھی کم نہ ہوئی تھی جب تک کہ وہ ٹوٹی ہوئی باڑھ والے بے ترتیب باغ کی شمالی سمت تک نہ پہنچ گئی۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب اس نے گھر کو دیکھا تو وہ کوئی گیت گنگنانے لگی تھی......

اس کے سارے جسم سے جیسے جان رخصت ہوگئی جب اس نے باڑھ کی شمال مغربی جانب ایک بدصورت، کنکریٹ کے بلاکس کو جلدی میں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر بنایا گیا ایک اور گھر دیکھا۔ اس کی گنگناہٹ تھم گئی۔ تھکن زدہ سی، وہ رک گئی۔ وہ جو کچھ اٹھائے ہوئے تھی، اس نے اسے زمین پر رکھا اور اپنی سن گلاسز سر پر جمالیں۔ لمحے بھر کو اسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ کوئی کتا بھونکا۔ کتے نے باڑھ پر سے چھلانگ لگائی اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اپنی دُم لہراتے ہوئے وہ بھونکتا رہا۔ اپنی آنکھیں عورت پر جمائے ہوئے، منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے، یوں تھا جیسے وہ اسے مزید ایک قدم بھی اٹھانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ (ان لمحات کے دوران جب میں خواب اور حقیقت کے درمیان کسی چاقو کی دھار پر تھی، میرے گردونواح اس قدر خاموش اور پُرسکون تھے کہ میرے لیے انجن کی آوازوں، بچے کے رونے اور کتے کے بھونکنے کا شور سننا خاصا مشکل ہو رہا تھا...... لیکن عورت چاہے وہ چاہتی یا نہیں...... اسے ضرور کچھ لوگوں سے ملنا ہوگا)۔

اس سب کے باوجود، وہاں تھا یہ، کھاڑی کے کنارے گھر۔ اس سے چالیس گز کے فاصلے پر! خواہش۔ (اگر میرا ایسی جگہ پر گھر ہوتا اور میں طویل عرصے سے وہاں نہ جاسکی ہوتی تو یہ چالیس گز

مجھے بہت لمبے، بہت طویل اور دُور لگتے)۔

ٹیرس کا رخ شمال مشرق اور مشرق کی جانب تھا۔ ٹیرس سے نیچے پہاڑ کی مختصر سی ڈھلان کھاڑی تک اترتی تھی لیکن وہ چھوٹی سی کھاڑی یہاں سے دیکھی نہ جا سکتی تھی۔ کھاڑی کی طرف اترتی پہاڑی ڈھلان صنوبر کے بلند و بالا درختوں، جنگلی سٹرابریوں اور سدا بہار پیڑوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اگر ہر سال انہیں چھانٹا نہ جاتا تو بید کے درخت اور جنگلی پھول بھی اسے ڈھک لیتے۔ ایک قسم کی ساحلی جھیل، یہ عمودی چٹانوں سے گھری ہوئی اور دُور موجود چوڑے ساحل سے ملی ہوئی ہے، کسی بچی کے پہلی مرتبہ کیے گئے لیس ورک کی یاد دلاتی، کسی اُلجھے ہوئے ڈیزائن کی سی۔ صنوبر، جنگلی سٹرابریوں، خرنوب کے درختوں اور سدا بہار پیڑوں کے سائے میں گھر پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ تین اطراف سے کھاڑی کو گھیرے میں لیے ہوئے ڈھلان، عمودی راس تک جا کر ختم ہوتی تھی۔

سفید دیواروں اور بند براؤن کواڑوں والا گھر ایک دوسرے میں الجھی جڑی بوٹیوں، جنگلی کینر اور اس کے ٹیرس کے لکڑی کے جنگلوں پر پھیلے جرینیم کے پھولوں میں گھرا ہوا تھا۔ گلاب کی شاخیں مرجھا چکی تھیں، ان کے سخت کانٹے کسی تلوار کی نوک کی طرح مڑے ہوئے تھے اور مکڑیوں کو اپنے جال بُننے کے لیے جگہ فراہم کر رہے تھے۔ باغ میں جس کی کبھی بھی اچھی دیکھ بھال نہ کی گئی تھی، دُوب یا گھاس کو پھولوں کی راکھ کی سی رنگت کی باقیات نے ڈھک دیا تھی، جو موسم بہار میں جب وہاں گرے تو ان کا رنگ ارغوانی مائل نیلا تھا۔ جرینیم عرصہ ہوا اپنی سبز رنگت کھو چکے تھے اور اب وہاں ان کے صرف ارغوانی جنگلی پھولوں کی باقیات رہ گئی تھیں۔ کسی زمانے میں گھر پر پھیری گئی سفیدی کی رنگت اب زرد ہو چکی تھی...... سڑک پر کھلنے والے مرکزی دروازے کے اوپر رھوڈزفلاور لپٹے ہوئے تھے۔ انگور کی بیل کے گھنے سبز پتے تقریباً تمام کے تمام خاکستری رنگ کے ہو چکے تھے۔ اس کے بیشتر پھول گرے براؤن اور خشک تھے اور باقی زرد قرمزی بیل صبح کی دھوپ کی تلاش میں گھر کی چھت پر چڑھ گئی تھی...... (اچھا، وہاں یاسمین بھی ہے۔ لیکن وہ یاسمین...... تقریباً ایک چھوٹا پیڑ...... جو کھاڑی کے ساتھ ملی ہوئی چٹانوں اور وسیع ساحل کو دیکھتا ہوا کھڑکی کے سامنے اُگ آیا ہے...... وہاں سے دکھائی نہیں دیتا جہاں وہ عورت کھڑی ہے)۔ وہاں بڑے سے نیلے پتوں والا کیکر یا آکاشیا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ کیکر ٹیرس کی شمال مشرقی سمت گھر کے پیچھے رستے پر بچھے کنکروں یا بجری کے بیچ اُگا

ہوا تھا۔ اس کی براؤن اور گہرے سبز رنگ کی شاخیں زمین تک جھکی ہوئی تھیں۔ درخت خود اپنے سائے کو بھی چھپائے ہوئے تھا۔

آپ نے دیکھا، اس سب کے باوجود گھر وہیں تھا۔ عورت کے سامنے کتا ابھی تک بھونک رہا تھا اور بچے کے رونے کی آواز اس دھاتی آواز میں مل جل رہی تھی...... یہ سب اس چھوٹے سے گھر سے کس قدر قریب تھا جو ماضی میں خوب صورتی سے تنہا کھڑا رہتا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ معمولی جھونپڑی جس کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔

کتا جھونپڑی کے سامنے ٹماٹر اور ترئی کے تازہ لگے پودوں کے درمیان سے نکلا تھا، وہاں ترنج (Citrus) اور کیلے کے بھی کچھ درخت تھے جو تیزی سے لمبے ہو گئے تھے۔ وہ کوئی زیادہ بڑا کتا نہیں تھا۔ وہ رکھوالی کا کتا تھا۔ یہ واضح تھا کہ وہ حملہ کرنے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں صرف ڈرانے دھمکانے کو مدنظر رکھ کر پالا گیا تھا۔ لیکن دوسری جانب وہ صرف تبھی وارننگ دیتا تھا جب کوئی غیر معمولی صورتِ حال بالکل قریب پہنچ جاتی۔ (کتا جو موٹل میں ہر جگہ گھومتا پھرتا ہے، صبح سویرے ساحل سمندر پر میری سیر میں میرا پیچھا کرتا ہے، بعض اوقات ہنگامہ سا مچا دیتا ہے، چاہے اس کی ضرورت ہو یا نہیں...... جب کہ غالباً انتہائی نازک لمحات میں بالکل خاموش رہتا ہے)۔ سڑک پر کھلنے والے جھونپڑی کے دروازے کے سامنے بیلچے، کدالیں اور پلاسٹک کے کچھ برتن وغیرہ پڑے تھے۔ جھاڑی پر ڈائپر اور کپڑے پھیلائے گئے تھے۔ (سرد سفید وائن کی چسکیاں لیتے اور مچھلی کے کباب کھاتے ہوئے اب میں بالکل اسی جگہ پر ہوں)۔

کتے کے بھونکنے کی آواز سنتے ہی پانچ یا چھے سال کا بچہ جھونپڑی سے باہر نکلا تھا۔ لیکن عورت نے بچے کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ لڑکا، جھاڑیوں اور پھل دار درختوں کے بیچ سبزی باڑی میں تھا۔ جب چالیس قدم دُور سفیدی پھیرے گئے گھر سے اس عورت کی نظریں ہٹیں تو وہ لڑکا اسے دکھائی دیا۔ وہ امریکی انڈینز کی طرح اپنی کمر پر ایک بچے کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کی قمیص اس کے پیٹ تک پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال بے توجہی سے گویا جیسے کسی درزی کی قینچی سے کاٹے گئے تھے۔ وہ سبزی باڑی کے سامنے چلا گیا اور اب کتے پر چیخ رہا تھا، ''چپ، قرہ باجک!'' وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کتا آخر بھونک کیوں رہا تھا۔ اس کی کمر سے بندھے بچے کے خوف زدہ چہرے پر مکھیاں چپکی ہوئی تھیں۔

عورت، لڑکے اور کتے نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ جب وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے تو ایک مہربان سی عورت وہاں آ پہنچی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی عمر 45 کے لگ بھگ ہوگی۔ (دوسری جانب میرے نزدیک وہ زیادہ سے زیادہ 25 سال کی تھی)۔ اس نے بانہوں میں ایک بچہ اٹھا رکھا تھا۔ لڑکے کی کمر سے بندھا بچہ دو یا تین سال کا ہوگا لیکن اس عورت کی بانہوں میں نومولود بچہ تھا۔

لڑکا چیخ رہا تھا: ''ماں، ادھر دیکھو!'' بچے کو بانہوں میں اٹھائے عورت پہلے ہی اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا اور اس کی گود میں موجود بچہ مسلسل روئے چلا جا رہا تھا، رونے کی وہی آواز جو کچھ دیر پہلے سنائی دی تھی۔ لیکن کتا اب خاموش ہو چکا تھا۔ اپنے دُم کو ہلاتے ہوئے وہیں کھڑے اس نے اپنی نظریں آنے والی عورت پر جما رکھی تھیں۔ یوں جیسے اسے کوئی اہم سوالات پوچھنے ہوں۔ اپنی بانہوں میں بچے کو جھلاتی دوسری عورت نے پوچھا، ''آپ کس کی تلاش میں ہیں؟''

عورت نے فاصلے پر موجود ایک منزلہ گھر کی طرف اشارہ کیا، ''میں اسے کھولوں گی......'' پھر اس نے لڑکے اور اس کی ماں کی نگاہوں سے جھانکتے شک وشبے سے پریشان ہو کر فوراً ہی اپنی بات میں اضافہ کیا، ''ہم یہاں رکیں گے......''

ٹوٹی ہوئی باڑھ جو جھونپڑی کو باغ سے الگ کرتی تھی، اسے فوراً ہی پھلانگ کر بچے کو گود میں لیے عورت آگے بڑھ آئی، ''آپ گھر کی مالکہ ہیں، ہے ناں؟''

عورت نے اپنا سر ہلا دیا۔ لیکن اس کی نگاہ سوال کر رہی تھی، ''اور تم؟ تم کون ہو؟ تم یہاں کب آئیں؟ نیچے تعمیر کی گئی وہ عمارتیں کیا ہیں؟ صنوبر اور خرنوب کے درخت کہاں گئے؟'' (اس کی دونوں بھنوؤں کے درمیان بننے والی لکیر گہری ہوگئی ہے)۔

بچے کو گود میں لیے عورت نے ان سوالیہ نگاہوں کو ڈھلانوں کی طرف مبذول ہوتے دیکھا جو ساحل تک چلی گئی تھیں۔ وہ اب تیز تیز بول رہی تھی۔ 'اوز بے (Oğuz Bey) ایک موٹل تعمیر کروا رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں چوکیدار کے طور پر یہاں رکھا تھا۔ ہم آپ کے ہمسائے بن گئے۔ میرا شوہر یہاں، نیچے تعمیراتی جگہ پر کام کرتا ہے۔ ہم دونوں چوکیداری اور مزدوری کرتے ہیں۔ جاؤ یوسف، بھاگو، اپنے بابا کو بتاؤ۔ اسے بتاؤ کہ ہمسائے آئے ہیں!......اپنے قادر بابا کو بلاؤ۔ یہاں

کھڑے مت رہو، بھاگو......''

(اچھا، ٹھیک، تو یہ ہی یوسف ہے جو موقع ملتے ہی ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے بٹن دباتا رہتا ہے)۔

بہر حال لڑکا وہاں سے ذرا سا ہلا بھی نہیں۔ اس کی ماں مڑی اور بولی، ''مجھے اسے بستر میں لٹانے دیں، پھر میں آپ کی مدد کروں گی۔ ہم گھر کھولیں گے اور صفائی کریں گے۔''

اس نے بعد میں اردگرد دیکھا۔ اس نے بازو سے اپنے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا۔

''تو آپ بالکل اکیلی ہیں؟''

عورت نے دوبارہ سر ہلایا۔

''کچھ روز میں ہم کافی سارے ہو جائیں گے۔ میرے مہمان آئیں گے......''

اس کا چہرہ یکدم دوبارہ نوجوان ہو گیا۔ نیچے جھک کر اس نے اپنا بیگ اور ٹائپ رائٹر اٹھایا۔ وہ اسی بے صبری سے چلنے لگی جو اس نے بس سے اتر کر چلتے وقت دکھائی تھی۔ وہ جنگلی گلاب کی کانٹے دار جھاڑیوں اور بچھالی کے قریب سے گزری۔ بجری جو کبھی باغ میں سے گزرنے والے رستے پر بچھائی گئی تھی، اب ہر جگہ بکھری ہوئی تھی، اس پر اس نے سنا کہ اس کے قدموں میں کس قدر تیزی تھی۔ (میں نے بھی)۔ اپنی بانہوں میں بچہ اٹھائے عورت نے تمام وقت اس کا پیچھا کیا۔ وہ مسلسل چلتی رہی۔ ٹائپ رائٹر والی عورت رک گئی۔

''میں گھر خود ہی کھول لوں گی۔ میں اس کی صفائی کروں گی۔ تم اپنا کام دیکھو۔'' اس نے کہا۔

اس کی آواز مستحکم تھی۔ حتیٰ کہ حاکمیہ۔ یوں جیسے اس حکمیہ لہجے نے خود اسے کسی بھی چیز سے زیادہ غصہ دلا دیا تھا، اس نے اپنا سر جھکایا اور مسکرا دی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''خدیجہ۔ لڑکے کا نام یوسف ہے۔ بچی جسے وہ اپنی کمر پر اٹھائے ہوئے ہے، شدمان (Sadıman) ہے۔ اور یہ بے چارہ بچہ نومولود ہے۔ اس کے باپ نے اس کا نام عثمان رکھا ہے۔''

''اپنا کام کاج دیکھو خدیجہ خانم۔ اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں بلا لوں گی۔ ٹھیک ہے؟''

اس فاصلے کو محسوس کرنے کے دوران، جو وہ عورت ان کے درمیان رکھنے اور اسی وقت اس فاصلے کو ظاہر نہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، خدیجہ بولتی رہی۔

''مجھے آپ کے آنے کی بے حد خوشی ہے۔ میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔گاؤں بہت دُور ہے۔میری والدہ اس سے بھی زیادہ دُور ہیں۔ یہاں کوئی ہمسایہ نہیں ہے،کوئی بھی نہیں۔جیسا کہ آپ نے دیکھا،ہم ہمیشہ یہاں ہوتے ہیں۔باغ میں یا بچوں کے ساتھ مصروف......اوز بے آتے جاتے رہتے ہیں۔جب وہ آتے ہیں تو میں ان کے لیے کھانا بناتی،برتن اور کپڑے دھوتی ہیں اور کچھ نہیں۔ ہم نے آپ کے بارے میں سنا تو ہمیشہ تھا لیکن آپ کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ہم نے گاؤں والوں سے بھی پوچھا لیکن انہوں نے بس اتنا کہا کہ وہ نہیں جانتے۔میں کہتی ہوں،یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جنت جیسی یہ جگہ،وہ یہاں کبھی آتے کیوں نہیں؟ جب آپ یہاں نہیں تھیں،پورے موسم گرما دوسرے لوگ آپ کے باغ پر قبضہ کیے رہے۔کیا آپ کے شوہر بھی آئیں گے؟''

''وہ آجائیں گے۔''عورت نے جواب دیا۔

خدیجہ رک گئی۔یوں جیسے وہ جن لفظوں کی تلاش میں تھی وہ بکھرے ہوئے تھے،اس نے اپنے دائیں اور بائیں جانب دیکھا،پھر وہ سیدھی ہوئی اور دوبارہ تیزی سے بولنے لگی،''ایک دیہاتی نے یہ بات بتائی تھی۔خدا آپ کو زندگی دے۔ماں بننا آسان نہیں ہے۔میرا بھی ایک بچہ فوت ہو گیا تھا۔شدمان اور عثمان کے بیچ والا۔ مجھے افسوس ہے،لیکن پھر بھی مجھے کہنا پڑے گا،قسمت۔ہمیں کہنا پڑتا ہے،فکر مت کریں،زندگی......اور آپ کا بیٹا،پورا جوان،شیر جیسا جوان،ایسا ہی تھا؟''

(روشنی کے ان لمحاتی جھماکوں میں،میں نے کبھی بھی اتنی لمبی گفتگو نہیں سنی تھی۔ میں نے یوں کسی کو متواتر بولتے نہ سنا تھا۔کوئی چہرہ،کوئی تصویر،زیادہ سے زیادہ ایک یا دو الفاظ،ایک آواز، ایک چیخ......)

عورت نے خدیجہ کی بات نہیں سنی۔

وہ پہلے ہی گھر کے قریب تھی۔ٹیرس پر جو کھاڑی کے رخ پر تھا۔خدیجہ ابھی تک اسے دیکھتے ہوئے یوسف کو ساتھ گھسیٹ رہی تھی اور اس سے کہہ رہی تھی،''آپ جب بھی چاہیں،مجھے بلا لیں۔اگر آپ کہتی ہیں کہ بچے آپ کو پریشان کر رہے ہیں تو میں انہیں نہیں لاؤں گی......

(اب کے لیے اتنا کافی ہے۔تم اب جا سکتی ہو)۔

نیچے عمودی چٹانوں اور دو ڈھلانوں کے درمیان چھوٹی سی کھاڑی آگے جا کر بڑی خلیج یا

کھاڑی میں بدل جاتی تھی، جس کے آگے سمندر تھا۔ جزیرہ نما، جس کے ساحل ہی سے صنوبر کے درخت شروع ہو جاتے تھے، اس کھاڑی کے پار دیکھا جا سکتا تھا اور سمندر کو اس سمت سے دیکھا جاتا تو اس کا شفاف نیلا پانی دُور تک پھیلا ہوا تھا جو ٹیرس کے نیچے چھوٹی سی عمودی پہاڑی کے دامن میں دلدل کو چھوتا تھا۔

پہاڑی پر بنائی گئی سیڑھیاں دوبارہ بُردگی کا شکار ہو چکی تھیں، ان کو سہارا دینے والے پتھر اپنی جگہوں سے ہٹ کر نیچے لڑھک چکے تھے۔ ٹیرس کے نیچے پتھر کی پانچ یا چھے سیڑھیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ انگور کی جنگلی بیل کی شاخیں بلند و بالا صنوبر کے درخت سے لپٹی ہوئی تھیں، جن کی ایک برس قبل اچھی کانٹ چھانٹ کی گئی تھی کہ اب وہ کھاڑی کے منظر کی راہ میں حائل نہ ہوتی تھیں۔ ٹیرس اور سمندر کی طرف جاتی پتھر کی سیڑھیوں پر بڑے بڑے سروں والی چھپکلیاں گھوم رہی تھیں۔

کبھی ٹیرس کی بڑی اچھی دیکھ بھال کی گئی تھی۔ لکڑی کے بھاری جنگلوں پر اخروٹ کا رنگ کیا گیا تھا لیکن عرصہ ہوا وہ بارش اور دھوپ کے باعث پھیکا پڑ چکا تھا۔ پینٹ اکھڑ چکا تھا، مختلف جگہوں پر جنگلے کے ساتھ لکڑی کے بینچ رکھے گئے تھے، لیکن ایک خاص مقام سے آگے کوئی بنچ نہ تھا۔ ٹیرس کا صرف کنکریٹ کا فرش باقی رہ جاتا تھا۔ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا کنکریٹ کا فرش کچن کی کھڑکی تک جاتا ہے۔ ٹیرس پر جہاں وہ کھڑکی کھلتی ہے وہاں لکڑی کا ایک چھجا بنا ہوا ہے۔ اس چھجے کے نیچے سے سمندر کو مغرب، مشرق، جنوب ہر سمت سے دیکھا جا سکتا ہے اور اس کے نیلے اور سبز شیڈز ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں اور نگاہ مخالف سمت موجود پورے جنگل، ساحل اور چٹانوں کو دیکھ سکتی ہے، جنہیں غروب ہوتا سورج انار کا سا رنگ دیتا ہے۔ (میں وہاں باہر جا کر اس ٹیرس پر غروبِ آفتاب کے وقت اتنی مرتبہ بیٹھ چکی ہوں، یوں جیسے کسی نے مجھے بلایا تھا)۔

ٹیرس پر کھلنے والے کچن کے دروازے کے سامنے عورت گھر کی جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ اس لمحے سمندر، سمندر کے طور پر، ساحل ساحل کے طور پر اور جنگل، جنگل کے طور پر اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ سب کہر میں سے ظاہر ہو کر سامنے آ گئے تھے۔ دوپہر کے قریب کا وقت تھا۔ موسم کے آخر میں ان میں جو بھی سکت باقی رہ گئی تھی، اس کے ساتھ جھینگر ٹرانے لگے تھے۔ وہ چند ایک ہی تھے اور ان کے ٹرانے کی آوازیں مسلسل نہیں تھیں۔ پھر بھی وہ موٹل کی تعمیر میں استعمال

ہونے والی مشین اور موٹر کی پتلی دھاتی جھنکاروں یا آوازوں پر غالب آ گئے۔ عورت جہاں کھڑی تھی وہاں سے موٹل کی تعمیراتی جگہ اگرچہ دیکھی نہ جا سکتی تھی۔

سمندر ابھی ابھار پر نہ تھا۔ پانی جو عام طور پر کھاڑی میں نوکیلی چٹانوں کے سروں کو چھپا لیتا تھا اور خالی جگہوں کو بھرتے ہوئے کھاڑی کے ساحل پر پھیل جاتا تھا، اب اتنا پیچھے ہٹ چکا تھا کہ سب سے بڑی یا لمبی چٹان کا نچلا حصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے تالاب جو سمندر ان چٹانوں کے نچلے حصوں کے ساتھ بنا دیتا تھا، وہ بھی حقیقتاً بالکل خالی تھے۔ سمندر کی تہ میں بالکل باریک ریت میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کھیل رہی تھیں۔ فاصلے پر، سمندر میں ایک بھی کشتی یا موٹر بوٹ نہ گزر رہی تھی۔ وہ بہار کا بالکل انجام تھا۔ ٹیرس سمندر سے آنے والی ہوا میں نہایا ہوا تھا۔

عورت کپکپا اٹھی۔ وہ اپنے پیچھے موجود کچن کے دروازے کی جانب مڑ گئی۔ وہ بند تھا۔ اس نے اسے کھولنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس نے اپنے بیگز اور ٹائپ رائٹر کھڑکی کے قریب نیچے کونے میں رکھ دیئے تھے۔ (ایمان داری سے بتاؤں تو اس کونے میں اپنے اندر احساسِ جرم اور ندامت لیے کھڑے میں نے بھی ایک بار ٹوٹے ہوئے کواڑوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی تھی)۔ کھاڑی اور صنوبر کے جنگلات کی جانب کھلنے والی خواب گاہ کی کھڑکی کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی، اس کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ اس نے ایک زنگ آلود ڈھیلی چٹخنی کو پکڑا، اسے کونے کی جانب کھینچ کر موڑ دیا، آدھا کواڑ کھل گیا۔ تختے میں موجود خلا سے ایک بڑی سی مکڑی نکل کر باہر بھاگی۔

عورت بائیں جانب مڑ گئی۔ وہ ایک دوسری کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اسے ڈھانپے ہوئے یاسمین کے پودوں کو دیکھنے لگی۔ یہ کھڑکی جھونپڑی کی جانب تھی۔ (وقت کے ساتھ، یہی کھڑکی، یہی یاسمین، موٹل ریسٹورنٹ اور ان لوگوں کو دیکھیں گے جو اس ریسٹورنٹ میں بیٹھتے اور غور وفکر کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایسے ہوں جن کی آنکھیں کھانے کے دوران اپنے گردوپیش میں کسی ایسی نفیس شاعرانہ شے کی تلاش کرتی ہوں، جو فوری طور پر توجہ نہیں کھینچتی، تو یہ یاسمین کے پھولوں والی کھڑکی اس مقصد میں کبھی ناکام نہیں رہتی)۔

چند گز کے فاصلے پر جنگلی جڑی بوٹیوں اور کیلے کے درخت کے پیچھے یوسف اس عورت کو چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ بچی جو اس کی کمر پر سوار تھی، اس نے اسے نیچے اتار دیا، اپنا گندا سا ہاتھ شدمان

کے منہ پر رکھ کر اسے خاموش کروایا، کیلے کے درخت کے قریب بیٹھا اور اپنی سانس روک کر اس عورت کو دیکھنے لگا۔ شدمان کے گلے سے بیٹھی ہوئی بھاری آوازیں نکل رہی تھیں۔ شٹر کو یاسمین کی خشک شاخ سے آزاد کرواتے ہوئے وہ عورت یہ آوازیں سن کر ٹھٹک گئی تھی۔ اسی وقت خدیجہ کی یوسف کو چیخ کر پکارنے کی آواز سنائی دی۔ وہاں ہاتھا پائی بھی تھی۔ شدمان رو رہی تھی۔ یاسمین کی شاخ سے زرد اور تقریباً براؤن ہو جانے والے پھول جھاڑ کر وہ عورت گھر کی پچھلی جانب چلی گئی۔ (میری نوٹ بک میں اس پر تحریر ہے: ''یوسف کی نگاہیں عورت کا پیچھا کر سکتی ہیں۔'' مجھے صنوبر کے درختوں سے ڈھکے جزیرہ نما کے آخر میں بھربھری چٹانوں کے پیچھے سورج کو غروب ہوتے دیکھتے ہوئے یہ تحریر کرنا یاد ہے)۔

دیوار کے سرے پر کنکریٹ کا راستہ ربر کے اس درخت کے باعث ناقابل گزر ہو چکا تھا، جو تازہ پتوں والی اپنی بڑی شاخیں ہر جانب پھیلائے ہوئے تھا۔ ڈوب یا لمبی گھاس اور گلاب کی خوشبو والے جرینیم کے پھولوں نے پیدل راستے کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا۔ جانور ان سے نکل کر سرسراتے ہوئے مختلف سمتوں میں بھاگ گئے۔ عورت...... ہمیشہ وہیں جہاں یوسف اسے آسانی سے دیکھ سکتا تھا...... نے ربر کے درخت کی شاخیں راستے ہٹائیں اور گھاس اور گلاب کی خوشبو والے جرینیم کو پھلانگ کر مغربی سمت گھر کے مرکزی دروازے کی طرف چلی گئی۔ کچھ قدم آگے کنکریٹ کی ایک چوڑی سِل رکھی تھی...... اگر یوسف ہر وقت عورت پر نگاہ رکھنا چاہتا ہے تو اسے اپنی جگہ تبدیل کرنی ہو گی...... دوسرے ٹیرس پر کنکریٹ شاید کسی کمرے کے لیے ڈلوایا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے جو کام شروع کیا گیا تھا، وہ بعد میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ پتھروں پر کسی ترپال یا جنگلے کے بغیر سل رکھی تھی۔ گرمیوں میں یہ سِل صبح سے لے کر سورج ڈھلنے تک تیز دھوپ میں پڑی رہتی ہو گی۔ دروازے کا پینٹ پھول کر جھڑ چکا تھا، کھڑکی کی سکرین زمین پر گری ہوئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے فریم اور سوراخوں کا جال ہی پیچھے باقی رہ گیا تھا۔ اس نے نائلون کی جالی اور فریم کے ٹکڑے پیروں سے پرے ہٹا کر کنکریٹ کی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیئے۔ اس نے اپنی چابی نکالی۔ عین اسی لمحے ایک بڑی سی چھپکلی نے خود کو دروازے کے اوپر لگی رھوڈز فلاور (بوگن ویلیا) کی شاخوں سے آزاد کروایا۔ اس کے بعد دو چھوٹی چھوٹی چھپکلیاں۔ چھوٹی چھپکلیاں دروازے کے دونوں جانب کے اکھڑے ہوئے سفید پلستر سے چپک

گئیں۔ وہ چھت سے ٹیک کر دیواروں پر آنے والے زنگ، السی کے تیل کے رنگ اور داغوں کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھیں۔

دروازے کی پیتل کی ناب کا رنگ سبزی مائل ہو چکا تھا۔ تالہ زنگ آلود تھا۔ اسے چابی لگانے کے لیے خاصی دیر کوشش کرنی پڑی۔ بے بسی محسوس کرتے ہوئے وہ لمحے بھر کو واپس مڑی۔ اس نے مدد کی تلاش میں اردگرد نگاہ دوڑائی۔ اسے جس چند صنوبر کے درختوں کے پیچھے سے، بجری اور جنگلی گلابوں سے آگے، مغرب میں دُور تک پھیلا ہوا سمندر ہی دکھائی دیا۔ دائیں جانب دُور فاصلے پر جہاں سمندر خشکی سے ملتا تھا، اسے دھند میں کسی گاؤں کا مینار دکھائی دیا۔ نیلاہٹ زدہ دھند میں اسے مینار اصل سے زیادہ پتلا دکھائی دیا۔ جس طرح طلوعِ آفتاب کی سمت میں ہر چیز کہر یا دھند کے سامنے تھی، اسی طرح غروبِ آفتاب کی سمت میں ہر چیز دھند کے پردے کے پیچھے رہی۔

یہاں سورج سمندر میں غروب ہوتا ہے۔ جب اس کا وقت آتا ہے تو آپ کو سورج کو سمندر میں غروب ہونے سے روکنے کے لیے کوئی ایک بھی پہاڑی چوٹی دکھائی نہیں دیتی۔ پہاڑ اس قدر دُور ہیں کہ انہوں نے خود کو غائب کر دیا اور دوسروں کے ذہنوں سے بھلا دیا ہے۔ اب گہری دھند کے پیچھے ان کی عمودی ڈھلانیں بہ مشکل ہی پہچانی جا سکتی ہیں۔ اب سورج کی دھوپ تقریباً عمودی طور پر کنکریٹ کی اس سِل پر پڑتی ہے جہاں عورت کھڑی ہے...... مان لیا گیا، یہ بہار کا انجام تھا۔ گھر کے سامنے کے حصے کو سہ پہر میں اسی وقت کچھ حدت ملتی جب سورج مغرب میں پہنچتا تھا۔ اور چھپکلیاں مزید نشو ونما پانے کے قابل نہ ہوتیں۔ آپ نے دیکھا، وہ ایک نئی چھپکلی تھی۔ وہ اس کے پیروں کے بالکل قریب سے گزری، سیڑھیوں کے نچلی طرف گلاب کی پرانی جھاڑی تلے گھس گئی جو کسی بونے درخت جتنی اونچی تھی۔ عورت نے لمحے بھر کو پرانے گلاب کی جھاڑی سے صنوبر کے درختوں اور کھلے سمندر تک نگاہ ڈالی۔ پھر وہ گھر کی جانب مڑ گئی۔ اس نے اس امید میں دروازے کے تالے میں دوبارہ چابی لگائی کہ وہ اسے کھول لے گی۔ دروازہ غیر متوقع طور پر ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ دہلیز پر کسی کیڑے کا کوکون پھٹ کر کھل گیا۔ (میرا خیال ہے......)

پیچھے باہر سے خدیجہ کا چلانا سنا جا سکتا تھا:

''یوسف ادھر آؤ! میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی!......''

اس مرتبہ یوسف اس عورت کو دائر وی خشک تالاب کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا جو پام کے بڑے بڑے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ جب اس نے دروازہ دھکیل کر کھولا تو یوسف نے دیکھا کہ کسی گہرے غار کی طرح اس عورت کے سامنے اچانک تاریکی ظاہر ہو گئی تھی۔ عورت اندر داخل ہوئی اور اس تاریکی میں غائب ہو گئی۔ (میں بھربھری چٹانوں سے اٹھتی ہوں۔ میری نگاہیں سورج کو پل بھر کو آنکھیں جھپکائے بغیر دیکھنے سے چندھیا گئی ہیں، جو سمندر میں غروب ہو جائے گا۔ سورج غروب ہو چکا ہے۔ میں بھی تاریک خلا میں چھلانگ لگا دیتی ہوں)۔

وہ گھر کے اندر تھی۔ بالکل مدھم روشنی میں۔

وہ دروازے سے چھن کر آتی ہلکی سی روشنی میں چھوٹے سے تنگ کاریڈور سے گزری۔ جب وہ اپنے بائیں طرف موجود چار سیڑھیاں نیچے اترے گی تو وہ لِونگ روم میں ہو گی۔ یہ کشادہ کمرا، خواب گاہ کے سوا واحد کمرا، سیڑھیوں کے آخر میں دائیں جانب کھلے سے کچن میں کھلتا تھا۔ کچن اور لِونگ روم کے درمیان کوئی دروازہ نہیں تھا۔ تمام شٹرز بند تھے اور اسی وجہ سے سیڑھیوں کی دوسری جانب کوئی روشنی نہ تھی۔ (واقعی۔ میں کچھ ٹوٹے یا کھلے ہوئے شٹر سے جھانک کر بلاشبہ اندر دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن چوں کہ ٹوٹے ہوئے یا ادھ کھلے شٹر سے آپ زیادہ نہیں جھانک سکتے اس لیے کچھ دیر تو میں گھر کے صرف خاکے یا نقشے کا تصور ہی کرتی رہی۔ بالکل تب جب میں دُور صنوبر کے جنگل کے سرے پر چونے کی چٹانوں کے پیچھے غروبِ آفتاب کے منظر میں کھوئی ہوئی تھی...... کس قدر عجیب...... میں نے خود کو اچانک گھر کے اندر پایا)۔ کورویڈور کے پار خواب گاہ تھی۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ اس کے بالکل ساتھ موجود باتھ روم کا دروازہ بھی بند تھا۔ اگر ہم باہر نکلنے والے دروازوں کو نہ گنیں تو گھر کے ایک حصے کو دوسرے سے الگ کرنے والے صرف دو دروازے تھے۔ عورت نے وہ اسے جیسے ملے اسی طرح بند رہنے دیا اور کوریڈور کی نیم تاریکی میں سیڑھیاں اتر گئی جن سے وہ بہ خوبی واقف تھی۔ اپنے شناسا گرد و پیش کے ساتھ وہ بائیں جانب موجود بک شیلف تک پہنچ گئی۔ ٹٹولتے ہوئے اسے تانبے کے ایک برتن میں رکھا گھریلو ایندھن پروپین کا ٹینک مل گیا۔ اس نے سوچا کہ اسے ماچسیں بھی اپنی معمول کی جگہ پر رکھی مل جائیں گی لیکن وہ وہاں نہ تھیں۔ اس نے ایک سگریٹ لائٹر جلایا، پروپین ٹینک کا سوئچ دبایا اور لائٹر اس کے برنر کے قریب لے گئی لیکن وہ نہ جلا۔ ٹینک خالی تھا۔ لائٹر

جلد ہی گرم ہو گیا، اس نے اسے بجھا دیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کے درمیان سگریٹ دبا لیا۔ ایک بار پھر لائٹر استعمال کرتے ہوئے اس نے سگریٹ سلگایا۔

اپنے ہونٹوں کے بیچ سگریٹ دبائے جس کا آخری سرا کسی جگنو کی طرح دکھائی دیتا تھا، وہ کمرے کے عین درمیان میں کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں۔ کمرا جہاں وہ کھڑی تھی اور کچن کے درمیان پتھر کے آتش دان کے سامنے رکھا مٹی کے تیل کا لیمپ اس نے اٹھایا لیکن اسے جلانے کی کوشش نہ کی۔ وہ دو آرام کرسیوں، بید کی میز، چند کرسیوں اور ایک دوسری میز کے قریب سے گزری جو یقیناً ٹیرس سے اندر لائی گئی تھیں...... وہ سب مختلف سمتوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ فرش پر رکھے مٹی کے بڑے سے برتن سے جا ٹکرائی۔ وہ انگیٹھی سے بچتے ہوئے وہاں سے گزری۔ اسے جو پہلی کھڑکی ملی اس نے اس کا ہینڈل گھمایا۔ اسے ہینڈل گھمانے میں کچھ دشواری ہوئی۔ اس نے کھڑکی کھولی۔ پھر اس نے شٹر کی زنگ آلود چٹخنی کھینچی جو اندر سے بند تھی۔ اس نے اپنی پوری قوت لگا کر چٹخنی گھمائی اور کھڑکی کے کواڑ باہر کی جانب کھولے۔ شٹر چرچراہٹ کے ساتھ کھل گئے۔ دونوں کواڑ باہر کی جانب دیوار سے جا کر لگے۔ کمرا روشن ہو گیا۔

صنوبر کے درختوں سے چھن کر آتی دھوپ نے کمرے کو روشن کر دیا۔ نیچے وہ چھوٹی سی کھاڑی تھی جو اسے کچھ دیر قبل ٹیرس سے دکھائی دی تھی۔ آپ جانتے ہیں، وہی کھاڑی۔ پانی کی تہ کے قریب مچھلیاں کھیل رہی تھیں۔ دُور فاصلے پر صنوبر کا جنگل تھا۔ سدا بہار درخت جنگلی سٹرابریاں، مہندی کے پیڑ، خرنوب کے درخت دائیں جانب پہاڑی ڈھلان کو ڈھانپے ہوئے تھے...... پھر پتھروں میں اُگی جڑی بوٹیاں جو ساحل کو ڈھانپے ہوئے تھیں...... سمندری چٹانیں جو جب پانی اترتا ہے تو اپنا کاہی سبز مخملیں چہرہ دکھاتی ہیں۔ صنوبر کے درختوں سے ڈھکے خشکی کے دو حصوں، ایک بڑا اور ایک چھوٹا، کے درمیان دکھائی دیتا وسیع سمندر، جس کا سبزی مائل نیلگوں پانی دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

کمرے کے پھیلاوے کی جانب پشت کر کے وہ عورت کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دُور کی چیزوں کو دیکھنے کے بعد جب اس کی نظر قریب کی چیزوں پر پڑی...... گھر کو پہلی مرتبہ جانتے ہوئے...... اسے کواڑوں کے درمیان درزوں میں حشرات الارض کے کوکون بھی دکھائی دیئے۔ وہ

دودھیا سفید رنگ کے کوکون تھے۔ کچھ عرصے پہلے بنائے گئے، حشرات الارض کے بچوں کے، انڈوں کے گھر......اس نے انہیں جیسے دیکھا تھا ویسا ہی چھوڑ دیا۔ پھر اسے مٹی سے بنے چھوٹے چھوٹے گھر دکھائی دیئے جو کھڑکی کے فریم کی جھریوں سے چپکے ہوئے تھے۔ یوں جیسے کمہار نے انہیں چاک پر بنایا ہو، ان مخلوقوں کے گھر کی ہموار دائروی دیواریں، جنہوں نے اپنے یہ گھر گرد مٹی اور تھوک سے بنائے تھے۔ ہر کوئی مٹی کا ایک چھوٹا سا جگ تھا۔ اس نے انہیں بھی نہیں چھوا۔

اس نے اسی طرح دو اور کھڑکیاں کھولیں۔ ایک کے کواڑ کھولنے میں مشکل ہوئی۔ اس نے اسے دھکیلا، دھکا دیا، کواڑ کا ایک حصہ زنگ آلود قبضے سے ہل کر کھل گیا اور باہر جھولنے لگا۔ اس کا گھٹنا جنوب مغربی دیوار کے ساتھ رکھے تخت سے ٹکرایا۔ اس نے اپنا گھٹنا سہلایا۔ اس نے گھٹنا تخت پر رکھا اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک مغربی سمت کے کواڑ نہ کھول پائی تھی۔ اس نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر صنوبر کے درختوں اور کھلے سمندر پر نگاہ دوڑائی جو کچھ دیر پہلے اس نے مرکزی دروازے کے سامنے رکھی سل پر سے دیکھے تھے۔ دائیں جانب اسے کہر میں مینار دکھائی دیا۔ یہ بالکل وہی مقام تھا جہاں مغرب مشرق سے بغل گیر ہوتا تھا۔

بے ترتیب گندے کمرے کے وسط میں جو تین اطراف سے بحیرۂ روم میں گھرا ہوا تھا، وہ یوں لگتا تھا کہ کھاڑی پر، راس کے سرے پر ہوا میں معلق تھی۔ کمرے کے بیچ، جس کے ہر کونے میں مکڑیوں نے جال تان رکھے تھے، کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ چھت اور فرش پر صنوبر کی لکڑی استعمال کی گئی تھی، جسے کیڑوں نے جگہ جگہ سے کتر دیا تھا۔ گھر کے اندر سے پرانی وارنش یا گوند کی سی بُو آ رہی تھی۔ عورت نے پرانے صنوبر کی خوشبو میں سانس لی۔

(بعد میں ایک شب بستر میں لیٹے سمندر کی لہروں کا شور سنتے ہوئے اپنی کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے کیا اچانک ہی میں نہ دیکھتی کہ تاریکی میں سگریٹ کہاں روشن ہوا تھا؟ درحقیقت اس کتاب میں مَیں کچھ مختلف چیز ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ اندلس سے سسلی تک بہت سی چیزیں، مقامی زبانوں سے بحرالجزائر تک۔ لیکن اس سب کی بجائے اندھیرے میں وہ سگریٹ روشن ہوا تھا......)

تاریکی میں اس کے سلگائے گئے سگریٹ کا دھواں پتھر کے آتش دان کے سامنے اٹھتا دکھائی دیا تھا۔ اب سورج کی روشنی سے بھرے کمرے میں ہلکا سا دھواں خلا میں بہ مشکل دکھائی دینے

والے مرغولے بناتا، چھت کی جانب اٹھا اور بورڈز کے درمیان خالی جگہوں میں غائب ہو گیا۔ چوبی فرش، دیواروں، ہر چیز پر روشنی، رنگین کاغذی سجاوٹوں کی طرح پڑی اور اس بے ترتیبی کو حسن دے دیا۔ یوں تھا جیسے اس پرانے (یا اب نئے) کمرے کو کوئی ترتیب دینے کی کوئی وجہ نہ تھی، کھلی کھڑکیوں سے سمندر سے منعکس ہوتی ایسی جھلملاتی روشنی آ رہی تھی جو آپ بلیوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔ روشنی دائروں اور لکیروں میں حرکت کرتی تھی جو سفید دیواروں پر زرد، نیلے، سبز اور نارنجی رنگوں میں منقسم تھے۔ نگاہ اس حرکت کی جانب مبذول ہو کر آپ کو کسی خیالی دنیا میں لے جاتی تھی۔ یوں تھا جیسے آپ کسی ایکویریم کے اندر تھے یا کسی قوس قزح کے عین درمیان خلا میں گھوم رہے تھے۔

پھر پام کے درختوں میں سے یوسف کی آواز سنائی دی، ''دوسرے ہمیشہ آپ کے گھر میں گھستے تھے! ہم نے ایسا کبھی نہیں کیا! ہم تو اس وقت یہاں تھے بھی نہیں!......''

(مجھے بچوں کے جارحانہ رویہ اختیار کرنے پر حیرت ہوتی تھی، قبل اس کے کہ انہیں کوئی الزام دیا جاتا...... حتیٰ کہ چاہے کوئی امکان بھی نہ ہو کہ انہیں کبھی کوئی الزام دیا جائے گا)۔

یہ آواز عورت کو قوس قزح سے دوبارہ گھر میں لے آئی۔

کتابیں۔ وہ فرش پر گھسیٹی گئی تھیں۔ شیشے کے سلائیڈنگ پینلز اور کتابوں کی اخروٹی الماری کے پٹ، جو چار سیڑھیاں نیچے اتر کر تقریباً آدھی دیوار کو گھیرے ہوئے تھے، سب کھلے تھے۔ فرش پر: باریک شفاف کاغذ، پیپر کلپ، رنگین پینسلیں یا کھریا، میگزین...... پلے بوائے کے شمارے...... اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ عورت نے جھک کر ان میں سے ایک اٹھالیا۔ عریاں مس جولائی کا درمیانی صفحہ پھاڑ کر نکال لیا گیا تھا۔ مس جولائی اب اپنے شمارے سے الگ ہو چکی تھی۔ (اگرچہ میں ابھی تک اس عورت کی اندرونی دنیا سے پوری طرح مانوس نہیں ہو پائی، میں عادت کی مجبوری کے باعث خود کو اس قسم کے سوالات پوچھنے سے نہیں روک پائی کہ مس جولائی کہاں تھی؟ اس کو کس نے اور کیوں پھاڑا تھا؟ خصوصاً رات کو اکیلے کھائے جانے والے کھانوں میں یہ سوال آپ پوچھتے ہیں، بہ خوبی جانتے ہوئے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے گا اور بعض اوقات پوری زندگی یہ سوالات بے جواب ہی رہتے ہیں۔ لیکن ہر چیز کو ہر چیز میں شامل کر کے...... پلے بوائے کی کاپیاں بھی...... میں باہر سے دیکھ سکتی تھی (زیادہ تر ان خاموش اور تنہا شام کے کھانوں میں، جس دوران رات کے

پرندے گیت گاتے ہیں اور سمندر کی لہریں مسلسل شور مچاتی ہیں)، کسی قسم کے داخلی سوالوں کی وجہ سے میں امید کرتی ہوں کہ میں ان کے جوابات بھی تلاش کرلوں گی۔ اور آپ نے دیکھا، اسی وجہ سے......) چیزوں کو ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہوئے میگزینوں میں سے تیراکی کے لباس کا زرد اور سفید نچلا حصہ سامنے آیا۔ تیراکی کا وہ لباس پلے بوائے کی کاپیوں کے بکھرے ہوئے صفحات کے درمیان پڑا تھا۔ اس پر جگہ جگہ گندے داغ تھے اور پورے اطمینان تک استعمال کیے جانے کے باعث اس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ عورت ایک ہی وقت میں حیرت زدہ اور متجسس، کراہت کے عالم میں اور پریشان دکھائی دی۔ یوں جیسے وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ تیراکی کے اس لباس کو کہاں پھینکے یا اس کا کیا کرے۔ لیکن اس کی کراہیت اور حیرت دونوں ہی زیادہ دیر تک نہ رہیں۔ بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ اس نے تیراکی کا لباس اٹھایا...... اپنی چٹکی میں...... اور سیڑھیاں چڑھ گئی۔ ان چیزوں کو ایک طرف رکھ کے اس نے کوریڈور کے آخری سرے والا دروازہ کھولا۔ اندر زیادہ تاریکی نہ تھی۔ کمرا ادھ کھلے دروازے اور چھوٹی سی کھڑکی کی وجہ سے روشن تھا، جس کے ٹیرس پر کھلنے والے کواڑ اس نے کچھ دیر پہلے کھولے تھے۔ وہ باہر سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کمرے میں تین بیڈ دیکھے جاسکتے تھے، دو بالکل ساتھ ساتھ جب کہ تیسرا ان کے مخالف سمت میں بائیں جانب اندرونی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

بیڈز کے درمیان تیزی سے گزرتے ہوئے اس نے یاسمین کے حلقے والی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کے فریم کے نیچے سے کسی بڑے بچھو جتنی مکڑی باہر نکلی۔ اس کے بیگز جو اس نے کچن کے دروازے کے باہر ٹیرس پر رکھ دیئے تھے، ابھی تک وہیں پڑے تھے۔ اس نے مکڑی کو کھڑکی سے نکل کر دیوار پر نیچے جاتے دیکھا۔ اور اسی وقت اسے ڈھلان کے نیچے چھوٹی سی کھاڑی، صنوبر کے بلند و بالا درخت اور سبزی مائل نیلگوں سمندر دکھائی دیئے جو صنوبر کے درختوں سے ڈھکے جزیرہ نما کے جنوب میں دُور تک پھیلا ہوا تھا......

بستر بے ترتیب تھے۔ اس نے کپڑے کی پٹیوں سے سِلی زمین پر گری رضائی کو اٹھا کر تہہ کیا۔ فیصلہ کن انداز میں وہ تیزی سے سب کچھ سمیٹنے لگی۔ اس نے سب گندی چیزوں کو... تیراکی کا وہ لباس بھی جو وہ سیڑھیوں کے پاس چھوڑ آئی تھی...... کسی گیند کی طرح لپیٹا اور اسے اٹھا کر باہر کنکریٹ کی سِل تک لے آئی۔

اب وہ دوبارہ کوریڈور میں تھی۔ اسے دیوار پر لگے کوٹ ریک میں ایک ٹوٹی ہوئی چھتری ملی۔ اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اس کی تیلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ جب وہ اسے باہر کنکریٹ کی سِل پر لائی تو چھتری اچانک کھل گئی۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی مگر پھر اپنے خوف پر ہنسنے لگی۔ اس نے اوپر دیکھا: آسمان ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ اس کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ وہاں بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔

پام کے درختوں کے سامنے کھڑا یوسف دبی دبی ہنسی ہنسا، ''کیا آپ دیکھ نہیں سکتیں کہ بارش نہیں ہو رہی؟''

عورت آواز کی جانب مڑی۔ یوسف، پام کے درختوں کے بیچ بھاگ گیا۔

''یہ لو!''

اس نے بجری والے راستے پر چھلانگ لگائی، چھتری کھینچ کر پکڑی، مڑا اور پھر پام کے درختوں کی طرف بھاگ گیا۔

''ایک منٹ ٹھہرو، ٹھہرو!......''

یوسف بجری پر ہلکی سی آواز پیدا کرتے ہوئے واپس چل دیا۔ جب وہ وہاں کھڑا تھا، اس نے بجری کے راستے پر چھتری کو کھول دیا۔

خدیجہ اس پر چلائی، ''یوسف، اپنے بھائی کا خیال رکھو! سب کو پریشان کرنا چھوڑ دو!''

یوسف نے پرواہ نہ کی۔ وہ بجری پر چھتری کو بجاتے ہوئے منتظر رہا۔ چھتری پر نارنجی پس منظر میں سفید، زرد اور نیلے پھول بنے ہوئے تھے۔ بجری کے راستے پر اب سورج کی دھوپ عمودی پڑ رہی تھی جس سے چھتری کا زرد نارنجی چمک رہا تھا۔

عورت دوبارہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دوبارہ باہر آئی۔ وہ اپنے بازوؤں میں پرانے تولیے، سویٹر اور ایک پرانی نیلی جینز اٹھائے ہوئے تھی۔ اس نے مختلف چیزوں کو اٹھایا.. تیرا کی کا وہ گندا لباس بھی...... جسے وہ دروازے کے باہر رکھ گئی تھی اور پھر انہیں دوبارہ رکھ دیا۔ تیرا کی کے لباس کو چٹکی سے پکڑ کر اس نے اس ڈھیر سے الگ کر دیا۔ اس نے اسے یوں الگ رکھ دیا، جیسے اسے چھپانا چاہتی ہو۔ اس نے باقی سب چیزوں کو سمیٹ کر دوبارہ اپنے بازوؤں میں اٹھا

لیا۔ یوسف چھتری پیچھے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ وہ گلاب کے پرانے پیڑ کے پاس کنکریٹ کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑا تھا۔

''یہ سب لے جا کر اپنی ماں کو دے دو۔''

لڑکے نے ان چیزوں کو اپنی ننھی باہنوں میں اٹھالیا۔

''اور پھر آ کر یہ کھڑکی کی سکرین بھی لے جاؤ۔'' عورت نے کہا۔

یوسف اپنے بازوؤں سے نکل کر اِدھر اُدھر لٹکتی گھسٹتی چیزوں کو لے کر چلا گیا۔ وہ باقی سب چیزوں کے ساتھ ٹوٹی ہوئی چھتری بھی لے جانا چاہتا تھا، مگر نہ لے جا سکا۔ عورت کی آواز اچانک نرم پڑ گئی تھی، وہ بولی، ''یوسف، ایک قمیص کی جیب میں گم ہے۔ بھولنا مت!''

چھتری پیچھے چھوڑ کر یوسف پاگلوں کی طرح بھاگ گیا اور پام کے درختوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ (میرا خیال ہے، جب یہ سب کچھ ہوا، یوسف کے دماغ میں چھتری یا چیونگ گم نہیں بالکل عورت کی آواز نے خود کو نقش کر لیا ہوگا، جو پہلے بے حد سرد تھی، پھر اچانک پُرجوش یا پُرتپاک ہوگئی۔ بہرحال یہ مفروضہ بھی میرا اپنا ہی ہے۔ بار میں ڈرنک لیتے ہوئے، چاہے میری تمنا تھی یا نہیں، لیکن میں نے اچانک اس سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے نوجوان کی مہربان سی آواز سنی: خدا کرے کہ تم ہمیشہ کسی بچے کی طرح ایسی ہی رہو۔ بلاشبہ یہی وجہ رہی ہوگی کہ میں بھول گئی کہ یوسف پرانے ٹائپ رائٹر کے بٹن اس قدر پُرجوشی سے کیوں دباتا رہتا ہے۔ ہمیشہ اپنی سردیاں یوں گزارتا......میرا سوانا بچپن......)

عورت دوبارہ لِونگ روم میں تھی۔ لمحے بھر کو وہ اس بڑے سے سرامک برتن کے قریب رُکی جس سے وہ پہلے ٹکرا گئی تھی اور پتھر کے آتش دان کے پاس، پھر وہ کچن میں چلی گئی۔

اطراف میں کچن کے کاؤنٹر مٹیالی رنگ کی ٹائلوں سے بنے تھے۔ کچن کی الماریاں لکڑی کی تھیں۔ ایک طرف پروپین پر کام کرنے والا ریفریجریٹر اور سنک کے ساتھ چولہا اور ایک اوون لگے ہوئے تھے۔ باقی گھر کی طرح کچن میں بھی لکڑی کی چھت اور الماریوں کے سوا ہر چیز پر دودھیا سفید رنگ کیا گیا تھا۔ حبس اور گرمی کے باعث چند جگہوں سے پینٹ اکھڑ گیا تھا۔ چولہے اور اوون کے درمیان لگی چمنی کے ٹن کا اوپری حصہ زنگ آلود ہو چکا تھا اور چمنی کے اطراف سے جہاں سے بارش کا

پانی رِس کر اندر آتا تھا، دیواروں پر اس زنگ کے نشان تھے۔

پانی کے نلکے کے اوپر لگی کھڑکی نگاہ کی سطح پر تھی۔ گھر کی باقی کھڑکیوں کے برعکس یہ افقی سمت میں لمبی اور کم بلند تھی۔ عورت نے زور لگا کر کھڑکی کے کواڑ باہر کی جانب کھول دیئے۔ فطرت کا پورا حسن، سمندر، جنگل، بے بادل شفاف آسمان اس کی آنکھوں کے سامنے عیاں ہو گیا۔

کھڑکی کی چوکھٹ گہری تھی۔ وہاں ایک چمکتی ہوئی نیلی چائے دانی رکھی تھی۔ وہاں رنگ برنگی کنکریوں سے بھرا شیشے کا ایک جار بھی تھا لیکن جار میں موجود پانی عرصہ ہوا سوکھ چکا تھا اور سمندری کنکریاں، جو گیلی ہوں تو ان میں فرق کیا جا سکتا ہے، عرصہ ہوا زرد پڑ چکی تھیں اور اپنے رنگ کھو چکی تھیں۔

عورت نے نلکا کھول کر جار اس کے نیچے رکھ دیا، لیکن نلکے میں پانی نہیں تھا۔ اس نے جار ایک طرف رکھا اور چائے دانی کا ڈھکن اٹھایا۔ کسی بٹالین کی طرح اس میں سے چیونٹیاں باہر نکلیں اور کھڑکی کے قریب منڈلاتی چیونٹیوں کی طرف چلی گئیں۔ (چیونٹیوں کا ایک جتھا چائے دانی کی اندرونی سفید جانب گھوم رہا تھا)۔ چائے کے پرانے ڈھیر کو پھپھوندی لگ چکی تھی اور وہ خشک ہو چکا تھا، چیونٹیاں اسے چھوڑ کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ چیونٹیوں کی فوج کسی انگلی جتنی موٹی قطار بنا کر کچن کی کھڑکی میں ایک سوراخ کے جانے پہچانے راستے سے باہر ٹیرس پر چلی گئی۔ (حتیٰ کہ اتنی باریک بینی اور خوش ذوقی سے بنائے گئے صاف موٹل، جہاں میں ٹھہری ہوئی تھی، کے کچن میں بھی بے شمار چیونٹیاں تھیں۔ چینی کے برتن اور کھڑکی کے فریم کے درمیان اس فوج کی نہ ختم ہونے والی آمد و رفت......) لکڑی کے لمبے چھجے کی وجہ سے ٹیرس کا ایک گوشہ ہمیشہ سائے میں رہتا تھا، جب سورج ٹیرس کے عین اوپر چمک رہا ہوتا تب بھی وہ خوش گوار سایہ فراہم کرتا تھا۔ لکڑی کے جنگلوں سے پرے موجود صنوبر کے درختوں کے نوک دار پتے کنکریٹ کے فرش پر متواتر گرتے رہتے تھے۔ ٹیرس پر ان پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ان کے درمیان چھپکلیاں اور موسم گرما کے حشرات گھوم رہے تھے جو اب گرم موسم کے آخر میں اپنی پھرتی کھو بیٹھے تھے۔

عورت باہر ٹیرس پر جانے کے لیے کچن کے دروازے کی نچلی چٹخنی کھولنے کے لیے آگے بڑھی۔ چٹخنی پہلے ہی کھلی تھی۔ دروازے میں بنی چھوٹی سی چوکور کھڑکی کا ہینڈل بھی کھلا تھا۔ اوپر کی چٹخنی

بند تھی لیکن پھر بھی وہ پوری طرح سختی سے بند نہ تھی۔ اگر باہر کی جانب سے دباؤ ڈالا جاتا تو دروازہ آسانی سے کھل جاتا۔ یہ واضح تھا کہ اندرونی جانب اوپر کی چٹخنی کسی نے اس چھوٹی کھڑکی کو استعمال کرتے ہوئے کھولی تھی۔ جہاں تک نچلی چٹخنی کی بات تھی، اس کے قبضے اور پیچ اکھڑ چکے تھے۔ اوپر کی چٹخنی استعمال کرتے ہوئے اندر گھسنا اور پھر یہ تاثر دینا کہ دروازہ کھولا ہی نہیں گیا تھا، بہت آسان تھا۔ دروازہ، کچن کی کھڑکی کی طرح اوٹ میں تھا اور نگاہوں کے سامنے نہیں تھا۔ راستے یا جھونپڑی سے اس جانب دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ صرف فطرت کے لیے کھلی جگہیں ہی، دنیا کے کسی بھی دوسرے رابطے کے لیے بند ہوتی ہیں......

پرانی چائے اور اس میں ابھی تک رینگتی چیونٹیوں والی نیلی چائے دانی لے کر وہ باہر ٹیرس پر آ گئی۔ اس کی دونوں بھنوؤں کے درمیان بنی دو گہری لکیریں ایک بار پھر اس کے عدم اطمینان کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ وہ بجری والے راستے کی جانب چل دی۔ ٹیرس سے کھاڑی تک اترتی پتھر کی سیڑھیوں اور جھونپڑی کے ساتھ لکڑی کی ٹوٹی ہوئی باڑھ کے درمیان خاصا چوڑا بجری والا راستہ تھا۔ وہ باغ کا اوپری سب سے زیادہ دکھائی دینے والا حصہ تھا۔ پتھر کی ایک سہارا دینے والی دیوار نے مٹی کو پہاڑ سے نیچے لڑھکنے سے روک رکھا تھا جو سمندری ہواؤں کے سامنے بھی اسی طرح کھلی اور غیر محفوظ تھی جیسے دُور پہاڑوں سے آتی ہواؤں کے سامنے۔ اگر دیوار کے نیچے لگے جنگلی درختوں اور صنوبر کے ایک یا دو بلند و بالا درختوں کو چھوڑ دیا جاتا تو وہاں جھاڑیاں تھیں اور نہ ہی کوئی اور پودے...... وہ باغ کا وہ حصہ تھا جہاں صرف سنگ ریزے یا بجری تھی۔ اس منظر میں چھوٹی سی کھاڑی، چٹانیں، بڑی کھاڑی یا خلیج جو جنوب کی جانب کھلتی تھی اور کھلا ساحل دکھائی دیتے تھے۔ نئی تعمیراتی جگہ، سٹیل اور سیمنٹ کے ڈھیر اس کی شمالی جانب دیکھے جا سکتے تھے۔ لکڑی کے جنگلے کے آخر میں بڑے بڑے پتھروں سے بنا ایک بڑا سا تندور تھا۔ عورت نے چائے دانی تندور کے قریب رکھ دی۔

خدیجہ اپنی تقریباً تین سالہ بیٹی شدمان کا ہاتھ تھامے باڑھ کی دوسری جانب سے ظاہر ہوئی، اس کی پھول دار سوتی شلوار کانٹوں میں اٹکنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ باڑھ کے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ یوسف اپنی چیونگ گم سے بڑا سا غبارہ پھلاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا۔

''مویشی......'' خدیجہ بولی، ''گاؤں والے اپنے مویشی کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ باڑھ

گرا جاتے ہیں۔اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم انہیں پکڑ لیتے لیکن......''

''وہ گل خیرو یا گڑھل(Hibicus) کھاتے ہیں۔'' عورت نے کہا۔

وہ تندور کے قریب قطار میں پھیلے کچھ چھوٹے پودوں کو دیکھ رہی تھی جن پر کوئی پھول نہ تھے۔(جب آپ موٹل کی اسی جانب ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں تو نیچی سی سفید دیوار کے سامنے گڑھل کے خوں رنگ پھول اپنی بہار دکھاتے دیکھ سکتے ہیں)۔

''یہ ہمارے آنے سے پہلے ہوا تھا۔'' یوسف نے کہا۔

''اب اگر کسی نے اپنے جانور کھلے چھوڑے تو ہم انہیں بھگا دیں گے۔'' خدیجہ بولی۔

(ایک مطلوبہ وضاحت۔ پھر آپ کو یاد رکھنا ہوگا کہ میری نوٹ بک کی تحریر کے مطابق اپنے ایسے رویے سے خدیجہ اس عورت کی مہربانی یا حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔نہیں، اس لیے نہیں کہ میں دہقانوں، ہمسائیوں یا چوکیداروں کے بارے میں پہلے سے ہی فیصلہ کر لیتی ہوں بلکہ اس لیے کہ میں ہمیشہ اچھی نیتوں کے عقب میں کسی وجہ سے چھپی خوشامد پر آمادگی حتیٰ کہ عیاری اور مکاری دیکھ چکی ہوں، سونے کے دانتوں سے بھرے منہ والی اس عورت کے چہرے پر بھی جو میرے کمرے کی صفائی کے لیے آتی تھی)۔

''وہ مجھے مارتے پیٹتے ہیں!'' یوسف نے وہ غبارہ چھوڑنے کے بعد جو اس نے اپنی چیونگ گم سے بنایا تھا، اپنی آنکھیں پوری کھول کر یہ کہا۔

''میں انہیں پتھر مارتا ہوں اور وہ مویشی پہاڑیوں کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔'' اس نے مزید کہا۔

اس کی ماں نے اسے پرے دھکیلا۔''جاؤ، اپنے بھائی کو دیکھو۔اگر عثمان سوتے سے اچانک جاگ گیا تو وہ بستر سے گر جائے گا۔کیا میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ اسے اکیلا نہ چھوڑنا؟''

یوسف اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔

خدیجہ نے تندور کے کنارے پر رکھی نیلی چائے دانی دیکھی۔اسی دوران وہ اس عورت کو دیکھ کر ہنسی جو اپنی دونوں کلائیوں کو ایک دوسرے پر رگڑ کر رہی تھی کیوں کہ اسے خارش ہو رہی تھی۔

''آپ نے سوچا کہ وہ آپ پر چڑھ گئی ہیں، ہے ناں؟''

''چیونٹیوں نے گھر بنالیا تھا۔'' عورت نے کہا۔

بچی کو یوسف کی بانہوں میں دینے کو تیار خدیجہ نے اپنا ایک پیر لکڑی کی ٹوٹی ہوئی باڑھ پر رکھ دیا۔ ''چیونٹی کیا بگاڑ سکتی ہے؟ شکر کریں کہ مکھیاں چلی گئی ہیں۔ چیونٹیوں کی فکر نہ کریں۔ کیا گھر میں زیادہ نقصان ہوا ہے؟ کیا انہوں نے اسے گندا کر دیا ہے؟''

جواب کا انتظار کیے بغیر خدیجہ نے شدمان کو یوسف کی گود میں دیا اور باڑھ کی دوسری جانب پھلانگ آئی۔

''مجھے آنے دیں۔ ہم جلدی سے صفائی کر لیں گے...... بچہ پہلے ہی سو چکا ہے......''

عورت نے جھرجھری لی اور خود کو سیدھا کیا۔ وہ تیزی سے بولنے لگی، ''بعد میں...... بعد میں...... مجھے تھوڑی بہت صفائی کرنے دو خدیجہ خانم۔ شکریہ...... میں نہیں جانتی...... ہم دیکھیں گے، مجھے پہلے یہاں وہاں بکھری چیزیں جگہوں پر رکھنے دو......''

وہ اپنے بائیں جانب باغ میں آؤٹ ڈور شاور کی طرف مڑ گئی۔ ایک یا دو ٹوٹے ہوئے تھے جب کہ تیسرے کی نالی اس کی جگہ سے ہل چکی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ مڑے ہوئے نلکے سے پانی کی پتلی سی دھار رِس رہی تھی۔

''پانی آ رہا ہے!''

''بالکل۔ جانوروں نے گھر کی جانب جانے والا ایک پائپ توڑ دیا تھا۔ پھر اچانک ہمارا بھی بند ہو گیا۔ میرے شوہر نے تلاش کر لیا کہ پائپ کہاں سے ٹوٹا ہوا تھا اور پھر اسے جوڑ دیا......'' خدیجہ نے بتایا۔

''میں نے بھی مدد کی تھی۔'' یوسف بولا۔

''ہم یاسمین کے پودے کو پانی دیا کرتے تھے۔ ہم گلابوں کو بھی پانی دینا چاہتے تھے، لیکن چھوڑیں۔ گلاب کے پودے پرانے ہو چکے ہیں۔ ہم نئے پودے لگائیں گے۔ جب ہمارے پاس وقت ہو گا تو ہم یہ سب کریں گے۔ ہم پیاز اور تلسی بھی اُگائیں گے۔ اب تک ہم اس گھر کو ہی بچا کر رکھ سکے، چاہے، وہ اسے گرا ہی دیں گے۔ ہم نے یہاں کچھ چیزیں بھی اگائی تھیں۔ تین مہینوں میں، بس یہی...... اگر نہیں، تو ہم اس کی دیکھ بھال کریں گے......''

عورت نے اپنا رخ موڑا، ''اندر تو پانی نہیں آ رہا۔'' یہ کہتے ہی اس کی پیشانی پر بنی لکیریں نرم پڑ گئیں۔ ''اوہ ہاں۔'' وہ آہستگی سے بولی، ''تب اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم پانی کا مین والو بند کرنا نہیں بھولے تھے، جب ہم جلدی میں واپس گئے تھے؟ حسن......''

وہ رک گئی۔ پھر وہ ایک ہی سانس میں بولی، ''اس نے باتھ روم میں پانی کا مین والو ضرور بند کر دیا ہوگا۔ مجھے جا کر دیکھنا چاہیے۔ بہرصورت پانی اندر بھی آ جائے گا......''

یوسف اچانک بول اٹھا، ''ہم نے پانی آپ کے پائپ سے لیا تھا!''

وہ باڑھ کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ خدیجہ کے گالوں پر پھیلی مسکراہٹ وہی جم کر رہ گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطروں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ تیز تیز بولنے لگی، ''انہوں نے تعمیر کے لیے کنواں کھودا تھا۔ کچھ کھارا اور کڑوا۔ ہم نے پینے کے لیے پائپ سے پانی لیا تھا۔ یہ پہلے ضائع ہی ہوتا تھا۔ ہم وقتاً فوقتاً سبزیوں کے اس چھوٹے سے قطعے کو بھی پانی دیتے تھے۔ بہرحال پانی تو خدا ہی کی ملکیت ہے۔ ہم سب کے لیے یہ کافی ہے۔ اگر اندر پانی نہیں آتا تو مجھے بلا لیں۔ میں اپنا پانی بند کر دوں گی، پھر یہ آنے لگے گا......''

(دوبارہ، میری نوٹ بک سے: مت بھولنا کہ جھونپڑی ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ہوگی، دوسرے گھر سے کم سے کم دو آدمیوں کے قد جتنی اونچی! میں اکثر ایسی باتیں یا حکم اپنی نوٹ بک میں لکھ لیتی ہوں۔ لیکن چوں کہ مجھے حکم لینا پسند نہیں، اس لیے میری عادت ہے کہ میں ان ہدایات کو بھی اکثر اوقات نظر انداز کر دیتی ہوں، جو میں خود کو دیتی ہوں)۔

عورت نے باغ کے دروازے کے ساتھ پام کے درختوں تلے کنکریٹ سے بنے تالاب کو دیکھا۔ ''ہم اسے رات کو بھر دیا کریں گے۔ یہ تمہارے باغ کے ساتھ ہی ہے۔ اس کے لیے یہ کافی پانی ہوگا۔''

''تالاب بھی......ٹوٹ چکا یا کچھ ہو چکا ہے، اس سے پانی رِستا ہے۔ اس میں پانی جمع نہیں رہتا۔ جب میرے شوہر کے پاس وقت ہوگا تو وہ اسے ٹھیک کرے گا۔'' خدیجہ نے خوش امیدی سے کہا۔

وہاں خاموشی تھی۔ سب کچھ ٹھیک کیا جائے گا۔

عورت جلدی سے بولی، ''کسی کے آنے سے پہلے مجھے گھر ٹھیک کرنے دو......''

''وہ کب آئیں گے؟''

عورت مسکرادی۔ وہ بڑی پُرسکون اور بے جوش مسکراہٹ تھی۔ ''کچھ کل، کچھ پرسوں، شاید......''

''آپ کے شوہر کل آئیں گے؟''

''مجھے نہیں معلوم......وہ......''

اس کی نگاہ صنوبر کے درخت سے ٹوٹ کر تندور میں گرنے والی شاخوں پر پڑی۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ جلتی رہی تھیں اور ابھی بجھی تھیں۔ یوں جیسے ابھی بھی ان سے ہلکا سا نیلا دھواں اٹھ رہا تھا۔ لیکن وہ صرف سورج کی جاتی ہوئی روشنی تھی جو شاخوں اور رات کو تندور میں پڑے رہ جانے والے کوئلے کے ٹکڑوں پر پڑی شبنم کو بخارات میں تحلیل کر رہی تھی۔

''مچھیرے آتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے الاؤ جلاتے ہیں۔ وہ مجھ سے صنوبر کی لکڑی اور پھل یا مخروطے اکٹھے کرواتے ہیں۔'' یوسف نے بتایا۔

''ہاں، وہ آتے ہیں۔'' یوسف کی ماں نے اتفاق کیا، ''یہاں کوئی مچھیرا نہیں رہتا۔ آپ جانتی ہیں۔ وہ یہاں کے نہیں ہیں۔ وہ بہت دُور سے آتے ہیں۔ ہم انہیں گھر کے قریب نہیں جانے دیتے۔ لیکن ہم انہیں یہاں اپنی آنکھوں کے بالکل سامنے الاؤ جلانے پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ کہیں گے کہ اس سے تمہارا کیا جاتا ہے اور اس پر بات ختم ہو جائے گی۔ ہم بھی یہاں کے نہیں ہیں۔ ہم وہاں ان پہاڑوں میں موجود دیہات سے آئے تھے، ہم نہیں چاہتے ہیں کہ کوئی ہمیں اپنا دشمن سمجھے اور وہ کوئی نقصان بھی تو نہیں کرتے۔ ہم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ جب وہ سمندر میں جاتے ہیں تو میرا خاوند ہمیشہ یہاں اردگرد کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ آگ بجھا دیتا ہے۔ یقیناً، تعمیراتی جگہ پر ہر طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کبھی آگ نہیں لگی۔ ہم گھر کے اندر کی بھی دیکھ بھال کر سکتے تھے لیکن ہم اندر نہیں گھسے تاکہ کوئی ہمیں الزام نہ دے۔ ہم نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا، میرے خاوند نے سوراخ سے اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی اٹکا دی تھی۔ اس نے سوراخ کو کیل لگا کر بند بھی کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے انہوں نے شاید اسے دوبارہ اکھیڑ لیا۔ نہیں، گھر کے اندر جو کوئی بھی لوگ گھسے

تھے، وہ مچھیرے بہرحال نہیں تھے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں کہ وہ کون تھے۔ خیر، اگر ہم جانتے بھی تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، آپ سمجھتی ہیں...... جب گاؤں کے لوگ خود خاموش ہیں...... یوں لگتا ہے یہاں سب ایسا ہی ہے۔ وہ اپنے خلاف کوئی بات نہیں کہنے دیتے، لیکن وہ ہر قسم کے مسئلے کھڑے کرتے ہیں......''

خدیجہ بولتی رہی (اس عورت کی طرح جو میرے موٹل کا کمرا صاف کرتی تھی اور مسلسل بولتی رہتی تھی)۔ عورت نے اپنا ہاتھ خدیجہ کے شانے پر رکھ کر اسے خاموش کروایا (میں نے یہ بھی سوچا کیوں نہیں)، ''بے حد شکریہ، خدیجہ خانم۔''

اس نے گھر کی جانب دیکھا۔ ''تقریباً تین سال سے بند۔ پھر بھی، یہ ٹھیک ہے۔''

اس نے شدمان کی طرف اشارہ کیا، ''یہ مٹی کھاتی ہے؟''

''اسے کھانے دیں۔ یہ ایسا کرتی ہے۔'' خدیجہ بولی، ''یوسف بھی مٹی کھایا کرتا تھا۔ جیل میں، وہ تب اس بچی سے کچھ ہی بڑا تھا، وہ ہمیشہ دیواریں چاٹتا تھا۔ یہ ان کے خون میں ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

پہاڑ جس کی ڈھلان چھوٹی کھاڑی تک جاتی تھی، سورج اس پہاڑ کی دونوں اطراف موجود صنوبر کے بلند و بالا درختوں کے عین اوپر تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پتھر کی سیڑھیوں پر صنوبر کے پھل یا مخروطے آواز کے ساتھ گر رہے تھے۔ خدیجہ کی نگاہیں، حتیٰ کہ جب وہ مسلسل بول رہی تھی، تب بھی تندور کے قریب رکھی چائے دانی پر جمی تھیں۔

''آپ اسے پھینک دیں گی؟''

''نہیں۔ اس کے اندر جمع چیونٹیاں نکل گئی ہیں......''

اسے خدیجہ کے چہرے پر لکھا اس کے سوال کا مطلب سمجھ آ گیا، وہ فوراً ہی مزید بولی، ''دراصل...... اگر تم چاہو تو تم اسے استعمال کر سکتی ہو، خدیجہ خانم۔ یہ نئی ہے۔''

خدیجہ نے چائے دانی اٹھالی۔ ''بالکل نئی ہے۔''

بالکل تبھی، اوپر آگے سے، نیچے ساحل تک اترتے خلا یا گڑھے سے پانی کے پمپ کی آواز ابھری۔ پمپ تیز جھٹکوں کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اب آئیوڈین، صنوبر اور مہندی کی خوشبو کے ساتھ ڈیزل کی بوجھل بُو بھی گھل مل گئی تھی۔ عورت کی پیشانی پر دوبارہ وہی دو گہری لکیریں پڑ گئیں: ''یہ

پمپ اکثر اوقات چلتا ہے؟''

''دن میں دو مرتبہ۔ یہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ اب یہ رک جائے گا......''

''ساحل تک اترتی ڈھلان بہت خوب صورت ہوا کرتی تھی۔ وہاں، تمہارے قریب ہموار جگہ، وہاں میپل، صنوبر، خرنوب کے درخت ہوا کرتے تھے، کون جانے کتنے قدیم......'' اس نے جھرجھری سی لی۔ ''یہ خاصی بڑی جگہ ہوگی، یہ موٹل، میرا خیال ہے۔''

''یہ اچھا ہوگا۔'' خدیجہ نے گڑھے کی جانب مڑتے ہوئے کہا، ''اور اوز بے کہتے ہیں کہ یہ جگہ جہاں ہم رہتے ہیں، یہاں ریسٹورنٹ بنے گا، لائیو موسیقی اور سب کچھ کے ساتھ...... ہمارا یہ گھر عارضی ہے......'' (کسی نے مجھے بتایا تھا کہ موٹل کے تعمیراتی منصوبے مکمل کیے گئے تھے)۔

عورت کے چہرے کی مسکراہٹ دیر گزری غائب ہو چکی تھی، اس نے یاسمین سے گھری کھڑکی سے تین سے پانچ گز فاصلے پر موجود جھونپڑی کی جانب دیکھا۔ ''ان کے لیے جو آئیں گے، میں پُرسکون اور خاموش تعطیلات کا وعدہ کرتی ہوں جہاں صرف ہم ہوں گے۔'' اس نے اتنی ہلکی آواز میں کہا جو بہ مشکل سنی جا سکتی تھی۔

''کیا آپ کچھ عرصہ رکیں گی؟''

''دس روز......شاید......''

(اسی لمحے موٹل کے لان کا گھومنے والا فوارہ چلا دیا گیا۔ نوزل سے تیز آواز کے ساتھ نکلنے والے پانی نے اردگرد جگہ پر چھڑکاؤ کر دیا)۔

پمپ کی آواز رک چکی تھی۔ سمندر کی لہروں کے چٹانوں سے ٹکرانے کی آواز۔ حتیٰ کہ درختوں اور پودوں کے ہلنے کی سرسراہٹ بھی تقریباً تھم چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے پمپ کے رکنے سے ہر سمت گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف جھونپڑی کے باہر بندھے کتے کے غرانے کی آواز باقی رہ گئی تھی جو ایک بڑی سی ہڈی چبا رہا تھا۔

''میں پانی کا مین والو کھول آؤں۔'' عورت نے کہا۔ اس نے یہ کہتی ہوئی خدیجہ کی بات سنے بغیر اس کی جانب پشت موڑ لی کہ ''آپ پہلے یہاں بالکل اکیلی کیسے رہتی رہی ہیں؟'' وہ تیزی سے بجری والا راستہ پار کر گئی۔

خدیجہ نے پیچھے سے پکارا، ''اگر پانی نہ آئے تو مجھے بتا دیں۔ میں ہمارے والا پائپ بند کر دوں گی۔''

عورت نے سر ہلا دیا۔ بیگز جو اس نے کچن کے دروازے کے باہر رکھ دیئے تھے، اٹھائے اور اندر چلی گئی۔

دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن اندر کھلی کھڑکیوں سے آنے والی ہوا میں وہ ہولے ہولے آگے پیچھے جھولتا رہا۔ چٹخنی بند نہ ہو پائی تھی۔ خدیجہ نے دروازے کو دیکھا۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں میں نیلی چائے دانی لیے باڑھ پھلانگ گئی۔ اس نے یوسف اور شدمان کو سبزی باڑی کی جانب دھکیل دیا۔

چوڑی مگر کم بلند لہریں ہلکی سی آوازوں کے ساتھ ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ نیچے موجود سمندر چٹانوں سے مزید پیچھے ہٹ چکا تھا۔ (چھوٹی کھاڑی اب بھی کسی جھیل کی مانند ہے۔ صبح کے وسط میں پہاڑوں کی جانب سے آتی ہوا نے کہر کو بالکل منتشر کر دیا ہے، بڑے جزیرہ نما، پہاڑوں کی ڈھلانوں پر موجود ٹیلوں اور صنوبر کے کہر زدہ درختوں کو ڈھانپے شیفون کے نقرئی پردے کو بالکل اٹھا دیا ہے۔ دھوپ آپ کو خاص گرمائش دیتی ہے۔ خود کو قلوپطرہ کے ذاتی حماموں میں سے کسی ایک پر محسوس کرتے ہوئے (بحیرۂ روم میں قلوپطرہ کے حمام کے ڈوبے ہوئے کھنڈرات۔ کہا جاتا ہے کہ رومی کمانڈر مارک انتھونی نے مصری ملکہ قلوپطرہ کو بحیرۂ روم کا ایک ساحل شادی کے تحفے کے طور پر دیا تھا جہاں ملکہ نے کئی جگہوں پر حمام بنائے تھے) میں نے چھوٹی کھاڑی میں کچھ دیر تیراکی کی اور پھر لیموں کے ذائقے یا فلیور کے ساتھ کچھ پینے کے لیے اوپر بار کے ٹیرس پر آ گئی۔ جوں ہی میری نظر ساتھ ہی موجود اجاڑ گھر پر پڑی، میں نے خود کو بار کی بجائے اس گھر کے اندر پایا)۔

کچن کے کونے میں باغبانی کے آلات پڑے تھے۔ باغ کا پانی کا پائپ فرش پر ڈھیر تھا۔ عورت اس میں الجھ گئی۔ ٹائپ رائٹر اس کے ہاتھوں سے نکل کر بالٹی اور پائپ کے درمیان گر گیا۔ سب کچھ جہاں پڑا تھا اس نے وہیں چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی ٹی شرٹ کی جیب میں سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ بالکل جب وہ خود کو ایک آرام کرسی پر گرا دینا چاہتی تھی، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہاں ایک بڑا سا مردہ پرندہ پڑا تھا۔ (جب وہ گھر میں داخل ہوئی تھی تو ضرور فرش اور چھت کی صنوبر کی لکڑی کی خوش بُو اس بُو پر غالب آ گئی تھی یا شاید دھوپ کی شعاعوں سے ملنے والی

بے خودی یا پھر ہر کھڑکی سے دکھائی دیتا بحیرۂ روم......)

وہ مردہ پرندے کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھی لیکن دوبارہ پیچھے ہٹ گئی۔اس نے آتش دان سے لمبے ہینڈل والا ایک چمٹا لے کر پرندے کو اس سے اٹھالیا۔ جہاں مردہ پرندہ پڑا تھا وہاں ایک بڑا سا براؤن داغ رہ گیا۔لاش کی بدبُو بے حد شدید تھی۔

اس نے اپنے اردگرد کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نظر گھمائی جہاں وہ اسے پھینک سکتی۔ (میرے بھائی نے شہر میں اپنے پینٹ ہاؤس میں ایک بڑا سا مردہ چوہا پکڑا تھا۔ اس نے مجھے فون کر کے پوچھا تھا کہ وہ اسے کہاں دفن کرسکتا تھا۔ہم نے اس صورتِ حال کو اہم نہ جانا کیوں کہ وہ بس ایک چوہا ہی تھا اور ہم اپنے بھائی کے سوال پر ہنس ہی سکتے تھے۔ ''لیکن اگر آپ شہر کے عین درمیان رہتے ہوں اور وہاں آپ کا کتا، بلی یا کوئی پرندہ مرجائے اور میونسپلٹی یہ بھی نہ بتا سکتی ہو کہ اسے کہاں دفنانا یا دبانا ہے تو ہم اس بارے میں مشکل میں ہیں کہ اس کا کیا کریں اور جیسا کہ میرے ایک دوست کے ساتھ ہوا، ہم کتے کی لاش، بیلچہ، کدال اور اپنا جمعدار لیے خالی جگہ ڈھونڈتے رہے۔خیر، تمھیں شہر سے بالکل باہر جانا پڑے گا، تم جانتے ہو......'' بالکل بغیر کسی وجہ کے میں سوئمنگ پول کے کنارے ایک لاؤنج میں بیٹھی یہ سب باتیں یوسف کو بڑے آرام سے بتاتی ہوں۔لڑکا میری بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا۔ میری کہی باتوں پر کچھ حیران اور استہزا سے وہ ہنستا رہا اور پھر کندھے اچکاتے ہوئے وہ اس کی طرف دوڑ گیا جس کے بارے میں وہ سوچتا رہا ہے، پرانا ٹائپ رائٹر۔ میں نے اسے پکار کر کہا، ''اس مشین میں S کا حرف نہیں ہے، ایک سطر سے دوسری پر آرام سے آگے بھی نہیں بڑھتی اور مزید یہ کہ تم اب بھی ایک ہی انگلی سے ٹائپ کرتے ہو!'' وہ توجہ نہیں دیتا ہے۔ اپنا سر مشین سے اٹھائے بغیر وہ کہتا ہے، ''پہلے میں ایک انگلی سے بھی ٹائپ نہیں کرسکتا تھا۔'' اس جیسی ایک تنہا سی ساحلی جگہ پر جہاں ایک دس یا بارہ سال کے بچے نے ٹائپ رائٹر کو کھلونا بنالیا ہے، یہ بات مجھے کسی وجہ سے پریشان کرتی ہے۔ جب عورت چمٹے میں مردہ پرندہ اٹھائے یہ سوچتی ہے کہ اس کا کیا کرنا ہے، یہ بالکل واضح ہے کہ میں اس مشین کے جو خواندگی کی علامت ہے، ایسے ہاتھوں میں جانے پر بے چینی محسوس کرتی ہوں۔ جہاں تک مردہ پرندے کی بات ہے، وہ اب بھی چمٹے کے سرے پر موجود ہے)۔ آخر کار اس نے پرندے کو پلے بوائے کے شماروں میں سے ایک پر رکھا اور اسے چھوئے بغیر سختی سے لپیٹ دیا۔اس

نے اس پیکیج کو مرکزی دروازے کے سامنے کنکریٹ کی سِل پر رکھا اور خود واپس مڑ گئی۔ واپسی پر اس کا پیر تیراکی کے گندے داغ دار لباس میں اٹک گیا۔ وہ کراہت محسوس کرتے ہوئے وہاں رک گئی۔ خجالت کے احساس کے ساتھ اس نے اپنے پاؤں سے تیراکی کا لباس بھی مردہ پرندے کے ساتھ ڈال دیا۔ وہ گھر میں واپس آ گئی۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور فوراً ہی واپس مڑ گئی۔ پھر وہ اپنی آنکھیں اور منہ بند کر کے جھٹکے سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی خواہش تھی یا نہیں لیکن اس لمحے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

ایک بڑی سی بغیر پینٹ شدہ الماری، جو دروازے کے ساتھ ہی تھی، باتھ روم کو اگلی خواب گاہ سے الگ کرتی تھی۔ الماری کے دروازے اور دراز کھلے تھے۔ اس کے ذاتی زیریں لباس کھڑکی کی چوکھٹ اور باتھ روم کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ پلے بوائے میگزینوں کے درمیانی صفحوں سے پھاڑی گئی عریاں عورتوں والی تصویریں ان کپڑوں کے ساتھ جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ اسے کپڑوں اور تصویروں پر خشک داغ بھی دکھائی دیئے۔

پریشانی۔ شاید خوف...... دو گہری لکیریں جو اس کی پیشانی پر تھیں، بہت سی چھوٹی پتلی لکیروں میں منقسم ہو کر اس کے پورے چہرے پر پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ اسے ابکائی سی آ گئی۔ وہ جھپٹ کر الماری کے برابر موجود پانی کے مرکزی والو کی طرف بڑھی اور اپنی پوری قوت سے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ واقعی بند تھا۔ لمحے بھر کو وہ بے یقینی کے عالم میں رک گئی۔ پھر اس نے والو کو مضبوطی سے گھمایا۔ اس نے نلکا کھولا۔ اس کی کنپٹیوں سے پسینے کے قطرے بہ کر نیچے آ گئے۔ جب وہ نلکا کھول رہی تھی، اس نے مسلسل گہری سانسیں لیتے ہوئے نگاہیں والو پر جمائے رکھیں۔ (ایک شب، جب مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میں اپنے ہوٹل کے بستر میں پہلو بدل رہی تھی، میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا: خجالت، خوف، اندیشہ، پریشانی، اُلجھن، سوالات...... غالباً کیوں کہ میں نے ایسا چہرہ دیکھا تھا، اس لیے میں سو نہیں پائی تھی۔ چاند کچھ دیر کو زرد ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً صبح کا وقت تھا)۔

نلکے سے پانی بہنا شروع ہو چکا تھا۔ یہ آواز سن کر اس نے اپنے حواس بحال کیے۔ اس نے دیر تک اپنے ہاتھ دھوئے۔ پانی اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں لے کر اس نے اپنے چہرے پر

پانی کے کئی چھپا کے مارے۔ اس نے باتھ روم کی کھڑکی زور لگا کر یوں کھولی جیسے اسے توڑ دے گی۔ اس نے کھڑکی کے فریم کے نیچے سے نکل کر بھاگتے کیڑے مکوڑوں، حشرات الارض، مکڑیوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اپنے چہرے پر چپکنے والے مکڑی کے جالے کو اس نے بازو سے پرے ہٹایا اور کھڑکی کے اکیلے کواڑ کو پوری قوت سے دھکیلا۔ رھوڈز فلاور کی نوخیز شاخ اندر آ گئی۔ نوخیز گہری سبز شاخ، جس پر چھوٹے چھوٹے پتے اور تازہ پھول تھے، کھڑکی کے ساتھ دودھیا سفید دیوار سے چپک سی گئی۔ اس کے پھول ابھی دھوپ سے مرجھائے، خشک ہوئے اور جھڑے نہ تھے۔ مرکزی دروازے کے گرد حلقہ بناتے چھت تک پہنچتے رھوڈز فلاور کے مقابلے میں یہ پھول زیادہ گہرے پرپل رنگ کے تھے۔

صنوبر کے درختوں کے سامنے خشک تالاب کے قریب سے یوسف کی آواز دوبارہ آئی، ''ارے! میں باغ سے کوڑا کرکٹ اٹھا رہا ہوں!''

''اچھی بات ہے!'' وہ بولی، ''وہ سب اٹھالو!''

لیکن اس کی آواز زندگی سے عاری اور کمزور تھی، یوسف اسے سن نہ پایا۔

چھوٹی سی چوکور کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مکھیاں، مکڑیاں بھی اندر تاریک کونوں کھدروں کی جانب بھاگیں۔ عورت نے رھوڈز فلاور کی کھڑکی کے فریم سے اندر جھانکتی شاخ کو پکڑا اور جھجکتے ہوئے اسے باہر دھکیل دیا۔ اس نے زمین سے کھڑکی کی سکرین اٹھائی اور اسے کھلی کھڑکی میں لگا دیا۔ شاخ فوراً ہی گرد آلود سبز سکرین کے ساتھ آ کر ٹک گئی۔ وہ ایک خوب صورت تصویر بنا رہی تھی۔ کیڑے اور پتلے سے پروں والی مکھیاں جو اندر نہیں آسکی تھیں، واپس لوٹ گئیں۔ وہ سکرین کی باہری جانب چپک گئیں اور وہیں رکی رہیں۔

عورت ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ دروازے کے پیچھے اسے Swimming Fins دکھائی دیئے جن کے سٹریپ ٹوٹ چکے تھے۔ جبلی طور پر اس نے اپنی پلکیں جھکا لیں۔ یہاں تک کہ کچھ دیر کو وہ منظر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ (ایک اور لمحہ، جب میں اپنے سامنے لگے گلابی زہریلے کنیر کو دیکھ رہی تھی، میں نے دیکھا کہ وہ سب سے کچھ بڑھ کر اپنے چہرے پر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی: تکلیف)۔ وہ دوسری جانب مڑ گئی اور اپنی آنکھیں کھولیں۔ اسے پہلی بار

ٹوائلٹ دکھائی دیا، اس کا ڈھکن اٹھا ہوا تھا۔ وہ خشک انسانی غلاظت سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ٹوائلٹ میں پانی گرایا مگر پانی کی صرف ایک ہلکی سی دھار ہی گری۔ غلاظت جوں کی توں موجود رہی۔

''یوسف!...... اپنی ماں سے کہو میرے بچے کہ پانی بند کر دے۔ اسے کہو کہ کچھ دیر اپنا پانی بند ہی رکھے!......''

''ماں! پانی بند کرو، پانی بند کرو!......'' یوسف نے باہر ہی سے شدت سے حکم دیا۔ اس نے سکرین کے پار عورت کا چہرہ یا سر دیکھنے کی کوشش کی مگر ٹھیک سے دیکھ نہ پایا۔ اس دوران، اس عورت کو کہیں سے ایک پرانا میز پوش مل گیا۔ اس نے وہ زمین پر رکھا اور تمام گندی چیزیں جو وہ تلاش کر پائی، Swimming Fins بھی پیر سے گھسیٹ کر میز پوش پر ڈال دیئے اور اسے کونوں سے تھام کر گرہ لگا کر ایک بڑا سا بنڈل بنا دیا۔ وہ اسے باہر کنکریٹ کی سل تک لے آئی اور اس نے تیراکی کا گندا لباس بھی اس بنڈل میں ڈال دیا۔ وہ واپس باتھ روم میں آ گئی۔ اس نے نلکا کھولا، پانی کی دھار آہستہ آہستہ موٹی ہو گئی۔ اس نے بالٹیاں بھر بھر کر ٹوائلٹ باؤل میں ڈالیں اور ڈھکن گرا دیا۔ اب اس کے چہرے پر کراہت تھی، نہ الجھن، نہ ہی خوف...... کافی دیر بعد، باتھ روم کا فرش، نلکا، ٹوائلٹ باؤل، الماریوں کے دروازے، صابن والے گرم پانی سے دھونے کے بعد اس نے دیر تک اپنے ہاتھ دھوئے، یوں جیسی گندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی ہو۔ (میرا دل آوازوں پر چوکنا ہے لیکن میں صابر ہوں۔ میں کوئی موسیقی، اس کی کوئی داخلی آواز سننے کے لیے تیار رہی۔ وہ کب سنائی دے گی؟ جنگل میں رستے کے کس موڑ پر، کس صبح ساحل پر قدموں کے نشانات پر، نیند کے کس وقت ٹوٹنے پر؟ یا کیا وہ نصف شب کو سنائی دے گی، جب اس عورت کا چہرہ دوسرے غیر واضح چہروں کے ساتھ بار بار ظاہر ہوتا ہے؟ کب؟ دُور، بہت دُور سے، ایک گنگناہٹ سی ابھرتی ہے۔ میں اسے سننے والی ہوں لیکن پھر ادراک ہوتا ہے کہ وہ فریب خیال ہے۔ پھر اچانک مجھے کسی کے خدیجہ یا یوسف سے بات کرنے کی آواز آتی ہے اور اپنے قریب ہی لوگوں کے چلنے کی۔ کوئی ایسی گنگناہٹ جو توقع ہے کہ واضح ہو جائے گی...... شاید یہ زلزلے سے کچھ دیر قبل کی ہے، شاید بارش کی ٹپ ٹپ یا بہار کی ہوا کی سرسراہٹ، میں بتا نہیں سکتی)۔ وہ اب دوبارہ لِونگ روم میں تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی، کمرے کا آدھا کوڑا کرکٹ صاف ہو چکا تھا۔ کمرا بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اب فرشوں، کھڑکیوں کی

صفائی کی باری تھی......

اُس نے کھڑکیوں کی چوکھٹوں میں گھر بنائے کیڑوں کو صاف کرنے کا سوچا اور مکڑیاں جو سب جگہ تھیں، لیکن پھر اس نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا۔ وہ باہر کنکریٹ کی سِل کے پاس گئی اور بنڈل کو گھسیٹ کر ایک پیڑ تلے ڈال دیا۔

''یوسف......''

اس کی آواز درشت تھی۔

کسی وجہ سے، یوسف غائب ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ ''آخر کار!'' (یہ قریب آتی موسیقی کی پہلی نشانی ہے یا کچھ اور؟) اس نے جلدی سے کنکریٹ کی سِل کو صاف کیا۔ اس نے پہلے فرش پر ایک کلم بچھایا اور پھر ایک ایک کر کے اس پر میٹرس کا ڈھیر لگا دیا۔ گھر کے سامنے اور صنوبر کے درختوں پر سے ہوتا ہوا سورج اب آسمان پر اونچا ہو کر اس طرف آ چکا تھا جہاں وہ کھڑی تھی۔ سورج کی شعاعیں اب کنکریٹ کی سِل پر براہِ راست پڑنے والی تھیں۔ اس نے میٹرس دیوار کے ساتھ اس جگہ لگا دیئے جہاں ان پر دھوپ ٹھیک طرح سے پڑتی: غروبِ آفتاب تک ان کی سیلن یا نمی خشک ہو جاتی، ان کی پھپھوندی زدہ بُو ختم ہو جاتی۔ (جب میں نے دل کی دھڑکن سے ملتی جلتی Staccato کی آوازیں پہلی بار سنی ہیں، میں سوئمنگ پول کے آخری سرے پر ہوں۔ میں اسے سننے کے لیے تقریباً سانس روکے پانی میں رکی رہتی ہوں مگر وہ اچانک رک جاتی ہے۔ مجھے مزید اور کچھ سنائی نہیں دیتا)۔ وہ کھڑکیوں کے گرد اور خواب گاہ کی چھت پر لگے مکڑی کے جالے اتارتے ہوئے گھر کی صفائی شروع کر دیتی ہے۔

چیزوں کو ترتیب دیتے ہوئے اسے یاسمین والی کھڑکی سے جھونپڑی دکھائی دی۔ اس نے فوراً ہی نگاہ دوسری کھڑکی کی طرف پھیر لی جہاں سے چھوٹی کھاڑی دکھائی دیتی تھی۔ پانی پر سورج کی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ سمندر کی تہ میں چمکتی ریت میں ننھی منی مچھلیاں یہاں وہاں گھوم رہی تھیں، سمندر کی وقتاً فوقتاً چڑھنے والی ست رنگی لہریں انہیں کیموفلاج کر رہی تھیں۔

باتھ روم صاف ستھرا تھا۔ اب جب کہ اسے دھو کر صاف کیا جا چکا تھا، خواب گاہ، اس کی سفید دیواریں، اس کے لکڑی کے تین خالی بیڈ، کشادہ، سادہ اور اچھے دکھائی دے رہے تھے۔ ہاتھ

سے بنی لیس کے پردے کھڑکیوں پر لٹکے تھے لیکن وہ منظر کی راہ میں حائل نہ ہوتے تھے، کمرے کے اندر ایک کشیدہ کاری والی لائٹ لگی تھی۔ ساحل پرے سے آتی ہوا رک چکی تھی لیکن مغرب سے آتی ہوا نے گیلے فرشوں کو خشک کر دیا تھا۔ دروازے اور کھڑکی سے آتی ہوا سے کوریڈور کی مٹی کمرے میں آ گئی تھی لیکن اسے پرواہ نہ تھی۔ ہوا کمرے کو جلد ہی خشک کر دیتی۔ اس نے میٹرس کی کھڑکی پر سکرین لگا دی۔ دوسری سکرین کو نیچے فرش پر چھوڑ کر وہ واپس باہر دھوپ میں کنکریٹ کی سِل کے قریب چلی آئی۔ پلے بوائے کے صفحے میں لپٹا مردہ پرندہ وہیں پڑا تھا جہاں وہ اسے چھوڑ گئی تھی۔ اس نے اسے تیسری مرتبہ اٹھا لیا اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ اس کا کیا کرے، اسے دوبارہ وہیں چھوڑ دیا۔ ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے اس نے وہ بنڈل سیڑھیوں کے قریب جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں رکھ دیا۔

''یوسف!...... کیا ہمیں اسے دفنا دینا چاہیے؟'' اس نے کہا۔ لیکن اس کی آواز کسی نے نہیں سنی۔

لڑکا جو جب سے وہ ملے تھے اس کی مسلسل جاسوسی کر رہا تھا، اب پہلی بار کہیں بھی نہیں تھا۔ جھونپڑی کے پیچھے دُور نیچے اترتی ڈھلان پر یوسف سٹیل کی سلاخوں اور اینٹوں کے درمیان تعمیراتی جگہ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

''بابا، بابا! ساتھ والے گھر کی عورت آ چکی ہے۔ وہ یہاں ہے!......''

عورت نے اسے بھاگتے دیکھا نہ ہی اپنے باپ کو پکارتے سنا۔ یوسف ساحل کے قریب تعمیراتی جگہ کے آخری حصے پر پہنچ چکا تھا جہاں نیم برہنہ نوجوان جوڑا ایک دوسرے میں مگن تھا (یہ واضح نہیں تھا کہ ان کا تعلق کہاں سے تھا)۔ دوسری جانب یوسف کی نگاہیں اس تعمیراتی جگہ پر صرف اپنے باپ کی تلاش میں تھیں۔ ''ساتھ والی گھر کی عورت آ چکی ہے۔ آپ نے سنا؟''

لکڑی کی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، کیڑوں کا کترا ہوا تنکوں سے بنا ایک ہیٹ، ایک ڈیک چیئر جس کا کپڑا اس کے دھات کے زنگ کے باعث بوسیدہ ہو چکا تھا، اس کا زرد رنگ دھوپ میں اڑ کر سفید ہو چکا تھا۔ عورت یہ اور فرنیچر کی دوسری چیزیں لِونگ روم سے اٹھا کر بجری کے قریب تندور کے پاس لے آئی۔ اس نے کِلم، بھیڑ کی کھال یا پوستین اور کھانے کی میز کا میز پوش باہر ٹیرس پر لا کر جھاڑے۔ اس نے انہیں ہوا میں لکڑی کے جنگلوں کے اوپر پھیلا دیا۔ نیچے کھاڑی پر اب سورج کی

شعاعیں جنوب مغرب سے پڑ رہی تھیں، اس سے پانی جھلملا رہا تھا، یہ جھلملاہٹ کھاڑی کے ساحل پر زیادہ تھی، وہ مچھلی کی پشت کے کھپروں کی طرح چمک رہا تھا۔

لکڑی کے بنچوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اپنا رخسار اپنے بازو سے ٹکا کر اس نے کھاڑی کے لہر در لہر جھلملاتے پانی سے نظریں ہٹائے بغیر آگے دیکھا۔ اس نے نیچے گہرے سمندر پر توجہ مرکوز کر کے اپنا تیسرا سگریٹ سلگایا...... ایک کے بعد ایک کش لیتے ہوئے یہ پہلا سگریٹ تھا جو اپنی آمد کے بعد اس نے پورا ختم کیا۔ جلد ہی اس نے کی نگاہیں فطری طور پر اوپر دائیں جانب پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف چلی گئیں۔ اس نے وہاں بے مقصد نگاہ دوڑائی۔ عمومی ڈھلان کی چوٹی پر بید اور مہندی کے درختوں کے درمیان اسے خیال ہوا کہ اسے بالکل نوجوان گنجا شخص دکھائی دیا تھا۔ (کیا موسیقی تھی جو شروع ہوئی؟ وہی دھن اس کے تحت الشعور سے......) بید کے درختوں کے پتے لمحے بھر کو سرسرائے، پھر مغربی ہواؤں سے الگ تھلگ ڈھلان دوبارہ ساکت ہوگئی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ گھنے جنگلی پودے، پرندے، جھاڑیوں میں گھستی چھپکلیاں، آپ کو مغالطے میں ڈال دیتے۔ ایک ایک کر کے گرتے صنوبر کے مخروطے یا کون یوں تاثر دیتے جیسے کوئی باغ میں سے گزرتے ہوئے گھر کی جانب آرہا تھا۔ (اور آپ نے دیکھا، ایک صبح سویرے جب میں ان ڈھلانوں پر طلوعِ آفتاب دیکھنے گئی تھی تو مجھے بھی یہی محسوس ہوا تھا۔ اور پھر میں الجھ گئی تھی کہ کیا وہ میری کوئی داخلی آواز تھی یا جو عورت نے محسوس کیا تھا۔ وہ کسی غیر مانوس موسیقی جیسا تھا)۔

اس نے سگریٹ کا ٹکڑا پتھر کی سیڑھیوں کی طرف اچھالا اور اندر بھاگ گئی۔

چولہے پر رکھا پانی ابل رہا تھا۔ ہر طرف پانی ابلنے کی آواز پھیلی ہوئی تھی اور بھاپ کے بادل اس چمنی کی طرف اٹھ رہے تھے جو کچن اور لِونگ روم کے آتش دان کی مشترکہ چمنی تھی۔ اس نے گیس بند کر دی اور برتن میں کچھ ٹھنڈا پانی ڈال کر ابلتے پانی کو ٹھنڈا کیا۔ اس نے برتن، پین اور گلاس، گرم پانی اور صابن سے دھوئے، جن میں سے کچھ بری طرح استعمال کیے گئے تھے اور انہیں خشک کیا۔

کچن کی الماریوں میں سے ایک میں قطاروں میں مشروبات کی بوتلیں رکھی گئی تھیں۔ بیشتر بوتلیں خالی تھیں لیکن اس نے دیکھا کہ کونیاک کی دو گہری سبز خوب صورت بوتلیں آدھی بھری

ہوئی تھیں۔اس نے ان کے ڈھکن اٹھا کر انہیں سونگھا۔خوش ہو کر اس نے انہیں الگ رکھ لیا۔اس نے خالی بوتلوں کو ایک جانب رکھا اور باقی کی جھاڑ پونچھ کی۔اپنے بیگز میں سے ایک میں سے اس نے تین اور بوتلیں نکالیں اور انہیں وہسکی اور ووڈکا کی بوتلوں کے برابر رکھ دیا۔اس نے جن کو الگ رہنے دیا اور اپنے لیے ایک گلاس بھر لیا۔اس نے کاؤنٹر کے نیچے بنی الماریوں کو کھنگالا، لیکن وہاں کوئی ٹانک یا کاربونیٹڈ واٹر موجود نہ تھا۔اس نے چھوٹے سے پروپین ریفریجریٹر کو دیکھا جہاں اسے دروازے کی شیلف میں ٹانک واٹر کی دو اور ایک پیپسی کولا کی بوتل مل گئی۔اس نے ٹانک واٹر کی بوتل کھولی۔اس کی گیس ختم ہو چکی تھی اور وہ گرم تھی لیکن اس نے اسے جن میں ڈالا اور پینے لگی۔اس کا منہ بن گیا لیکن دوسرا گھونٹ لینے پر وہ گویا اس کے برے ذائقے کی عادی ہو گئی۔(کیسی بدقسمتی ہے، میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی!) وہ ریفریجریٹر کا سوئچ ڈھونڈنے کے لیے فرش پر جھکی اور اسے آن کر دیا۔اس نے گیس آن کر دی۔ریفریجریٹر کام کرنے لگا۔وہ سیدھی ہو گئی۔

جن اور نیچے تقریباً لیٹ کر گیس جلانے کی وجہ سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔اس کی طاقت جو باہر ٹیرس پر لکڑی کے بنچ پر اپنے بازو سے رخسار ٹکا کر بیٹھے ہوئے غائب تھی، اب بحال ہو گئی تھی۔وہ متواتر اس جانب دیکھتی رہی جہاں اس کے خیال میں اس نے گنجے سر والے کسی ٹین ایجر کو دیکھا تھا۔اب اس نے اپنے سامان میں سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا۔اس نے اس میں کیسٹ لگائی اور مردانہ آواز میں ایک فرانسیسی گیت بجنے لگا۔یوں جیسے وہ کسی اور کی چیز کی تلاش میں تھی، گیت نے اسے حیران کر دیا۔

گیت کے بول لکڑی کے فرش سے زیادہ چھت سے ٹکرا کر گونجنے لگے۔اس نے کچن کا دروازہ بند کر دیا۔وہ اس کی نچلی چٹخنی بند کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی جگہ سے ہل چکی تھی۔اس نے چند بار کوشش کی۔چٹخنی کچھ دیر اپنی جگہ پر رہتی پھر کھل جاتی۔اس نے اسے چھوڑ دیا۔

گلاس ہاتھ میں پکڑے آگے بڑھ کر اس نے اس گہرے داغ کو دیکھا جو مردہ پرندہ آرام کرسی پر چھوڑ گیا تھا۔پھر اس نے اپنا رخ موڑا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

ٹیپ پر بجنے والا گیت ختم ہوا اور ساتھ ہی دوسرا شروع ہو گیا۔وہ اس سے پچھلے فرانسیسی گیت اور بعد میں آنے والے احمقانہ گیت دونوں سے مختلف تھا، یوں جیسے اسے جانتے بوجھتے

شرارت کی نیت سے ان دونوں گیتوں کے درمیان ریکارڈ کیا گیا ہو:

Now you're far away / The heart is filled with grief ....

وہ ایسا ترک گیت تھا جس میں آہنگ کے ساتھ مقام تھے۔ گیت ختم ہونے تک وہ کمرے کی جانب پشت کر کے کھڑکی میں کھڑی جِن کی چسکیاں لیتی رہی۔ مشرق میں دُور بہت فاصلے پر کہر زدہ آسمان تلے پہاڑوں کا خاکہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ مغرب سے آتی ہوا نے سمندر کی نمی کو اس سمت میں دھکیل دیا تھا۔ ساحل کی رنگت اخروٹ کے خشک خول جیسی تھی۔ سمندر کی لہریں گھرے پرے جنگل کے ساحل سے ہولے ہولے ٹکرا رہی تھیں۔ صبح کے سمندر کی نقرئی جھاگ اب دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ ساحل پر موجود جوڑا اب وہاں نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں سمندر نگل گیا تھا۔ افق پر موجود پانی کی سطح پر موجود دو گہرے داغوں کی طرح وہ وقتاً فوقتاً اس کی توجہ حاصل کرتے تھے۔

Just when I said I can never part / It became a dream to reunite...

پھر گیت ختم ہو گیا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا۔ سمندر کی لہروں کی آواز اب مزید پس منظر کی موسیقی نہ تھی۔ وہ آواز سامنے آ گئی، کھڑکیوں سے ٹکرائی، کمرے کو بھر دیا۔ پھول دار کپڑے کے غلاف والی دوسری آرام کرسی جو اس کے گھر میں داخل ہوتے وقت سے کھڑی تھی، ایک طرف گر گئی۔ اسے سیدھا کر کے رکھتے ہوئے اسے آتش دان میں کچھ شور سنائی دیا۔ آتش دان جس کی دیواریں کالک زدہ تھیں اس کی راکھ میں ایک موٹی سی چھپکلی تیزی سے رینگتی ہوئی چمنی کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ عورت نے جھک کر اندر جھانکا، آتش دان کا دُودکش کھلا ہوا تھا۔

''پرندہ ضرور اس راستے سے اندر آیا ہو گا۔'' عورت نے بلند آواز میں کہا۔

اس نے دُودکش بند کر دیا۔

خواب گاہ کی کھڑکی پر ایک اور چھپکلی چڑھ آئی۔

(ایک عجیب صورت حال۔ کئی ''میں'' گھات لگائے انتظار کر رہی ہیں...... ایک طرح سے میں ہر جگہ ہوں۔ جنگل میں، چونے کی چٹانوں پر، سمندر کنارے، سوئمنگ پول پر، اکثر حتیٰ کہ شہر میں، شہر کی گلیوں میں۔ پھر میری چھٹیوں میں بالکنی میں بیگونیا کے سامنے خاموشی سے اونگھتے ہوئے سامنے پہاڑوں کے پیچھے سے چاند کو طلوع ہوتے دیکھتے یا گاؤں کے مرکز میں آتی مین روڈ کو پار کرنے

کی کوشش کرتے ہوئے۔ سو میرے وجود میں، مَیں ہر جگہ ہوں، ہر وقت، لیکن یوں ہے جیسے میں نے اپنا کھلونا کیمرا ہر وقت پکڑ رکھا ہے۔ یوں ہے جیسے میں اس تصویر میں مقید ہوں جو میرے سامنے سوراخ سے جس سے میں آنکھ جمائے ہوئے ہوں، میرے سامنے آتی ہے۔ اگر چہ میں اس تصویر سے بعض اوقات نگاہ دائیں یا بائیں پھیر لیتی ہوں اور میں وقت میں ایک چھوٹی سی چھلانگ لگاتی ہوں، لیکن مجھے اِدھر اُدھر گھوم کر واپس آنا پڑتا ہے یوں جیسے اسی کسی جگہ کے سحر میں گرفتار۔ آپ جانتے ہیں یہ بالکل واضح ہے، ایک قسم کی کشش مجھ پر اپنی گرفت کر چکی ہے۔ جب تک کہ میں اس تصویر میں لمحاتی تبدیلیوں کو مس نہیں کرتی، توقع ہے کہ میں اس کی داخلی آواز...... موسیقی تک بھی...... پہنچ جاؤں گی۔ میرا وجود اس احساس کی گرفت میں ہے کہ ایک کمزور سی گنگناہٹ ابھرے گی اور پوری طرح سنائی دے گی...... بالکنی کے دروازے کے اوپر ایک چھپکلی رینگ رہی ہے...... آپ جانتے ہیں، جب ہم بچے تھے، تو ہم کیسے اپنے کان زمین یا کسی یوٹیلیٹی پول سے لگا لیتے، ہم سانس روکے انتظار کیا کرتے، ہم سنتے اور سنتے ہی رہتے، زمین یا پول ہم سے باتیں کیا کرتے، ہمیں چیزیں بتایا کرتے تھے)۔

پانی کو کسی نفیس ریشمی چادر کی طرح خود پر اوڑھے ہوئے وہ اپنی پشت کے بل سمندر میں لیٹی ہوئی تھی۔

سورج کی کرنیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ وہ چند گھنٹے پہلے کی طرح اب پانی سے منعکس نہیں ہو رہی تھیں۔ سمندر تک اترتی ڈھلان، جنگلی جھاڑیاں اور پتھر کی سیڑھیوں کی دونوں جانب لگے صنوبر کے درخت تاریک سایوں میں گھرے ہوئے تھے جو درختوں کی سب سے اوپری شاخوں کو چھوتی روشنی سے بالکل الگ دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد کھاڑی بھی تاریک سائے میں ہوگی۔ پانی کا رنگ ہلکے سنہری سے گہرا سبز ہو جائے گا۔ چھوٹی سی جھیل بالکل پُرسکون تھی اور چٹانوں کے سروں پر موجود تمام چھوٹے چھوٹے تالاب بالکل خالی تھے۔ بڑی بڑی سمندری جھاڑیاں پانی کے شاہ بلوط کو کبھی چھپا اور کبھی سامنے لا رہی تھیں۔ کھاڑی کے سامنے تنگ سے ساحل پر سمندری مکڑیاں تیز تیز بھاگ رہی تھیں، وہ ہوا میں اڑتے بالوں کی یاد دلا رہی تھیں اور وہ جیسے ہی سمندر سے باہر نکلتیں، ریت کے ننھے ننھے سوراخوں میں غائب ہو جاتیں۔ کھاڑی کی دونوں جانب موجود پتھریلی ڈھلانوں پر سورج کی نرم کرنیں پڑ رہی

تھیں، جیسے کسی نیم تاریک کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی سے ہچکچاہٹ زدہ سنہری کرنیں اندر جھانک رہی ہوں۔ (...... ''بڑے فنکاروں کی بنائی گئی Flemish پینٹنگز میں چہروں کے واضح دکھائی دینے کے لیے نیم روشنی ہی کی ضرورت ہوتی تھی۔'' بالزاک۔ چوں کہ الگ تھلگ علاقے گہرے سایوں میں ہیں اور تقریباً نیم تاریک یا دھندلے دکھائی دیتے ہیں، جنگلی جھاڑیوں کے اوپر حصوں اور راس پر پڑنے والی نرم سنہری روشنی اسے اصل سے زیادہ واضح اور چمک دار دکھا رہی ہے اور حتیٰ کہ وقتاً فوقتاً عورت کی موجودگی کو......) پانی گرم تھا۔ تیرتے ہوئے وہ بعض اوقات تازہ پانی کی لہروں تک بھی آئی جس سے اس کی کمر اور ٹانگوں پر کپکپی سی طاری ہوئی۔ جہاں تازہ پانی سمندر سے ملتا تھا، وہاں سرکنڈے اُگ آئے تھے جن کے اوپری حصے گرمیوں کے دوران خشک ہو چکے تھے۔ اب نئی شاخیں پھوٹ رہی تھیں۔ چٹانوں میں اُگی بوٹیوں کے پتے موٹے ہو کر سخت ہو چکے تھے۔ سمندری جڑی بوٹیوں کی سونف کی سی خوشبو کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔

مقامی معماروں کی تعمیراتی خامیوں کے باوجود، گھر، اس کے لکڑی کے شٹر، اس کی سفید دیواریں، اس کا ٹیرس جس میں کچن کی کھڑکی کے آگے نکلے ہوئے چھجے کے سائے، سب کھاڑی سے بے حد خوب صورت دکھائی دیتا تھا۔ پردوں سے جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔ کھڑکیاں بالکل صاف اور نئی تھیں، جن سے صنوبر کے درختوں کی سراسراتی شاخیں منعکس ہو رہی تھیں۔ نیچے سے دکھائی دینے والے گھر کے منظر میں اس کے ساتھ تعمیر کیا جانے والا بڑا موٹل شامل نہیں تھا...... نہ ہی جھونپڑی وہاں سے دیکھی جا سکتی تھی۔

اس نے اپنا چہرہ پانی میں کر لیا۔ آنکھیں سختی سے بند کر کے اس نے گہرا غوطہ لگایا۔ منہ سے پانی باہر نکالتے ہوئے وہ ایک غیر متوقع لمحے سطح پر آئی: وہ اب آ سکتے ہیں!

(میں نے سنا! میں سن چکی تھی...... کسی دھڑکن کی طرح گہری تمنا سے معمور میں اس کی داخلی آواز سن چکی تھی۔ اب وہ خاصی مختلف اور جدا ہے۔ اس کا لہجہ اور سورس بالکل واضح ہیں۔ یہ آواز پانی کی سطح پر پھیل چکی ہے، دونوں جانب چٹانوں سے ٹکرا کر گونجتی اور مجھ تک پہنچتی ہوئی: اب وہ آ سکتے ہیں!

جس لمحے میں نے یہ سنی، میں ان ساحلوں سے بہت دُور تھی! میں کیچڑ کی ایک پتلی سی تہ

سے ڈھکی برف آلود سڑک پر پھسلنے اور اپنا کوئی بازو یا ٹانگ تڑوا لینے سے بچنے کی پوری قوت سے کوشش کر رہی تھی۔طویل تھکا دینے والا موسم سرما لگتا تھا کہ کبھی ختم ہی نہیں ہوگا)۔

گھر تیار تھا۔اس نے ڈھائی برسوں کی دھول مٹی اور کوڑا کرکٹ صاف کر دیا تھا اور ان لوگوں کا پھیلاوا بھی جو گھر میں آ گھسے تھے اور یہاں اپنی مختلف خواہشوں کی تسکین کی کوشش کی تھی اور تمام حشرات الارض کے گھر اور چیونٹیاں بھی۔اب بس میٹرس اندر لے جانا اور بستر درست کرنا باقی رہ گیا تھا۔چند گھنٹے پہلے وہ اپنے احساسات کو زبان دینا چاہتی تھی، اسے کہہ دینا، کسی گوشے میں بیٹھنا اور اپنے دل کی ہر بات کہہ دینا چاہتی تھی۔لیکن کوئی وقت نہ تھا۔وہ ٹھنڈے پانیوں میں غوطہ لگانا بھی چاہتی تھی۔وہ تھک چکی تھی۔

گرم پانی اور پھر تازہ پانی کا بہاؤ یا لہریں پُرسکون کرنے والے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے وہ رات بھر کے طویل سفر، اپنی بے خوابی، اپنی آمد کے ساتھ گھر کی تمام تر صفائی اور تیاری سے ملنے والی تھکن اور اس سے پہلے جمع ہونے والی تمام تھکن کا مقابلہ کر رہی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے وہ جھاڑ پونچھ کر اپنے غم، اپنی ماندگی، درد و تکلیف، خون اور پھپھوندی کی بُو کو صاف کر رہی تھی۔اس گھر کی طرح جسے اس نے اوپر سے لے کر نیچے تک صاف کیا، رگڑ کر دھویا اور چمکا دیا تھا، وہ خود بھی صاف ہو رہی تھی۔(میں یہ کیسے جانتی ہوں؟ وہ اس برف آلود، کیچڑ زدہ سڑک پر ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے)۔تبھی اس کی سمندر میں غوطہ لگانے کی خواہش میں شدت آ گئی تھی۔سورج کے ڈھلنے سے پہلے گرم پانیوں میں غوطہ لگانا...... جب وہ لیس لگا میز پوش ڈائننگ ٹیبل پر بچھا رہی تھی، کسی نے کچن کے دروازے پر دستک دی اور اس سے پہلے کہ اسے جواب دینے کا موقع ملتا، دروازہ کھول لیا۔

خدیجہ اپنے ایک بچے کو گود میں اٹھائے اور دوسرے کا ہاتھ تھامے دہلیز پر کھڑی تھی۔اس کے پاس ایک چھوٹی سی باسکٹ بھی تھی۔اگرچہ اس نے خود کو اندر داخل ہونے سے روکے رکھا لیکن وہ اپنی متجسس نگاہ اِدھر اُدھر گھمانے سے خود کو باز نہ رکھ پائی۔''آپ کو میری مدد نہیں چاہیے؟''

اس کی نگاہوں نے اندر کا جائزہ لیا۔وہ جلدی اور تفصیل سے سب کچھ دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا،''میں پہلے ہی ان چیزوں کی دیکھ بھال کرنا چاہتی تھی لیکن میرے شوہر نے منع کر دیا......''

وہ عورت کے اسے اندر بلانے تک وہیں جمی کھڑی رہی۔

''واہ......''اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا،''آپ نے تو پہلے ہی سب کچھ ٹھیک کر لیا ہے۔اب کم سے کم دھلائی کا کام مجھے کرنے دیں۔''

''ٹھیک ہے۔''وہ بولی،''یوسف نے باغ سے کاغذ اور کچرا وغیرہ اٹھایا تو تھا مگر اور بھی ہے۔ٹیرس بھی دھلنے والا ہے۔''

''میں اسے دھودوں گی۔میں اسے کل آپ کے جاگنے سے پہلے دھولوں گی۔اب خاصی دیر ہو چکی ہے۔اگر میں نے اب دھویا تو وہ خشک نہیں ہوگا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ ایک گوشے میں رکھے تخت پر بیٹھ گئی،اس کی نگاہیں پردوں سے پھسلتی ہوئی، بک کیس کے سامنے رکھی میز، میز پر رکھے ٹائپ رائٹر جس کا ڈھکن اٹھا ہوا تھا، پھول دار کپڑے والی آرام کرسیوں، دیوار پر لگی دو پینٹنگز......ایک تصویر میں مچھلیوں سے بھرا اور سجا سمندر دکھایا گیا تھا جو جھلملاتے ستاروں بھرے آسمان سے اس قدر مشابہ تھا کہ کسی کو خیال ہی نہ آتا ہوگا کہ وہ کوئی بحری نظارہ تھا......اور کچن کی الماریوں پر پڑی۔شدمان نے اپنا کیلا تخت کے کپڑے پر لیپ دیا اور پھر تکیے کے ہاتھ سے بنے غلافوں سے اپنی ناک صاف کی۔عثمان رونے لگا،خدیجہ نے بچے کو یہ کہتے ہوئے گود میں لے لیا کہ''میرا خیال ہے اسے پیشاب کرنا ہے۔''

وہ اسے باتھ روم میں لے آئیں جہاں خدیجہ نے اسے فرش پر بٹھا کر پیشاب کروایا جسے کچھ دیر پہلے دھو کر صاف کیا گیا تھا۔وہ بچے کو نہیں بلکہ الماری، صاف چمکتے ہوئے سنک، نہانے کی جگہ کے فرش اور شاور کے پھول دار پردے کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ کافی سفر کر کے آئی ہیں سو میں آپ کے لیے یہ لائی تھی۔''اس نے اسے باسکٹ دیتے ہوئے کہا۔

اس میں کیلوں کا ایک چھوٹا سا گچھا، کچھ آلو اور پیاز تھے۔جب عورت نے انہیں نکال کر کاؤنٹر پر رکھا تو اسے خدیجہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔اسے اس کا شکریہ ادا کرنا تھا جب کہ اسے خدیجہ پر غصہ بھی آرہا تھا جو ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی اور مسلسل بلا وجہ بولے چلی جارہی تھی اور جس کے بچے نے فرش گندا کر دیا تھا جو اس نے اتنی محنت سے صاف کیا تھا۔جب خدیجہ نے اپنے بچے کو باتھ روم کے فرش پر پیشاب کرنے دیا تو عورت غصے میں آگئی تھی اور ان کے

جاتے ہی اس نے بڑبڑاتے ہوئے بہت سا صابن والا گرم پانی ڈال کر فرش کو دوبارہ دھویا۔ اپنے دروازے پر اس عورت کے آنے سے پہلے ہی وہ خود کو میلا اور گندا محسوس کر رہی تھی اور تھکا ہوا۔ اچانک اسے اتنی تھکن محسوس ہوئی کہ اس کا خیال نہیں تھا کہ وہ کھڑی بھی ہو سکے گی۔ وہ اپنا وجود جس قدر جلدی ممکن ہوتا سمندر، کھاڑی کے پُرسکون پانیوں کے حوالے کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن پھر خدیجہ اپنے دونوں بچوں کو لیے آ گئی اور جانے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

''اچھا، اب مہمان آسکتے ہیں۔ گھر بے داغ ہے۔'' خدیجہ بولی۔

اس نے دوبارہ پوچھا،'' آپ کے شوہر کب آئیں گے؟''

''مجھے ٹھیک سے نہیں پتا...... لیکن وہ آنے کی کوشش کریں گے...... وہ خاصی دُور ہیں...... اگر وہ ایک ہفتے تک اپنی جاب چھوڑ سکے تو وہ آج روانہ ہونے والے تھے......''

یہ کہہ چکنے کے فوراً بعد وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

حسن، اس نے سوچا۔ آج سے پہلے ہم یہاں کتنی مرتبہ آ چکے ہیں؟......

(جب میں نے اسے اچانک کھاڑی کے پانی میں تیرتے دیکھا، میں نے اپنے آپ سے کہا، کون جانتا ہے کہ اسے آج کتنی بار تکلیف دہ طور پر حسن کی یاد دلائی گئی ہوگی، وہ شوہر جس سے وہ پچھلے تین برسوں سے علیحدگی اختیار کر چکی ہے اور گونے (Güney) اس کے بیٹے کی جو ڈھائی سال قبل غائب ہو گیا تھا۔ وہ بھی وہاں پانی کی گہرائیوں میں، تاریکی میں، اس کی بند آنکھوں کے پیچھے رہے ہوں گے۔ ہر بار جب روشنی کا جھماکا ہوا، وہ دونوں وہاں موجود رہے ہوں گے۔ حتیٰ کہ اس کی ماں۔ اپنی نوجوانی میں ان لیس والے پردوں کو بناتے ہوئے اس کی ماں کی آنکھیں دُکھ گئی تھیں...... پردے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے ابھی ابھی صندوق سے نکالے گئے ہوں...... اور پھر اس کے مہمان جو آنے والے تھے، ایک ایک کر کے آ گئے ہوں گے۔ کیچڑ کی ہلکی سی تہ والی برف آلود سڑک پر میں ضرور کسی ایسے کے ساتھ چل رہی تھی جسے میں بہ خوبی جانتی تھی، اس عورت کے ساتھ۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ پانی میں غوطہ لگاتی ہے۔ نمکین پانی اس کی آنکھیں جلا دیتا ہے۔ میں اسے روتے دیکھتی ہوں)۔

نہ رونے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سمندر کی تہ میں ریت میں کھیلتی مچھلیوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک دھاری دار تھی۔ انگلی برابر جسامت کی۔ تب گونے آٹھ یا دس سال کا تھا، پہلا موسم

بہار جب وہ یہاں آئے تھے:

''مام! یہ پاجامہ پہنے مچھلی میرا پیچھا کر رہی ہے!...... یہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑ رہی!''

وہ چیختے ہوئے پانی سے باہر بھاگ آیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر سمندر کی کھاری جھاگ لگی تھی۔ اس کے گھنے ہلکے بھورے بال اس کی پیشانی اور کنپٹیوں سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوب صورت تھا...... کیا وہ نیلی ڈینم کے رنگ کا تیراکی کا لباس پہنے ہوئے تھا؟

اب سمندر اس رنگ کا تھا۔ سبز رنگ مدھم پڑ چکا تھا۔

خدیجہ ہر وقت اس کے قریب رہنا چاہتی تھی، زیادہ سوال پوچھنے کے لیے، زیادہ جاننے کے لیے، مسلسل بولنے کے لیے۔ وہ اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر اس والے کے ساتھ بھاگ آئی تھی جس کا نام قادر تھا۔ قادر بھی پہلے سے شادی شدہ تھا۔ تینوں بچوں میں بڑے، یوسف کا باپ وہ شخص تھا جسے خدیجہ چھوڑ آئی تھی۔ چوں کہ خدیجہ اور قادر دونوں ہی پہلے سے شادی شدہ تھے، اس لیے وہ اپنے یا کسی قریبی گاؤں میں نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لیے وہ جگہ جگہ گھومتے پھرے، یہاں تک کہ قادر اسے یہاں اس جگہ لے آیا۔

''قادر سے میرے دو بچے ہیں۔'' اس نے بتایا، ''لیکن اس کی بیوی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ قادر طلاق لینا چاہتا ہے لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوتی۔ اس نے قادر پر مقدمہ کر رکھا تھا، اسے سمن جاری ہو چکا تھا۔ ایک بار شروع میں انہوں نے ہمیں جیل میں بھی ڈال دیا تھا...... قادر، یوسف اور مجھے۔ یوسف تب چار سال کا بھی نہیں تھا، لیکن اس کے جیل میں بہت سے دوست بن گئے تھے۔ وہ ٹھیک تھا۔ یہاں وہ اکیلا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ عورت ہمیں دوبارہ گرفتار کروا دے گی۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ہم دونوں یہاں اکٹھے رہ رہے ہیں، تو وہ یہ بھی کر گزرے گی۔ اسے کرنے دو۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

چوکیدار قادر نے یہ سب شہر میں سنا تھا۔ اس کی پہلی بیوی کہہ رہی تھی کہ جلد یا بدیر وہ ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لے گی۔

خدیجہ کے مطابق اگر انہیں جیل جانا ہی تھی تو جس قدر جلد ممکن ہوتا انہیں جیل جا کر واپس آ جانا چاہیے تھا۔ انہیں اپنی مدت پوری کر کے یہ معاملہ ختم کرنا چاہیے اور پھر وہ اپنی زندگی گزاریں گے۔

''بہت ہو چکی یہ خانہ بدوشی کی زندگی۔'' اس نے کہا، ''اگر ہم آزادی سے کہیں جا سکیں تو میں اپنے نئے دانت لگواؤں گی۔ سونے کے۔ وہ دوسری عورت کہتی ہے کہ اگر ہم اسے 80 ہزار دے دیں تو وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے گی۔ وہ کہتی ہے کہ میں طلاق دے کر اپنا رستہ لوں گی، لیکن وہ گاؤں والا کھیت اور گھر بھی اپنے نام لکھوانا چاہتی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے قادر وہ گھر اور زمین اسے نہیں دے گا، لیکن اگر وہ راضی ہو سکتے ہیں تو اوز بے ہمیں 80 ہزار دے دیں گے اور قادر اس عورت کو یہ رقم دے دے گا، لیکن اگر یہ اس معاملے کو ختم کرنے کو کافی ہو...... پھر ہم یہاں کام کریں گے اور تھوڑا تھوڑا کر کے اوز بے کا ادھار چکا دیں گے۔ وہ ہمارے لیے نیا گھر بھی بنائے گا۔ ہم اس موٹل میں ہی کام کرتے رہیں گے۔ ابھی ہم جس گھر میں رہتے ہیں وہ عارضی ہے۔ وہ ریسٹورنٹ کی جگہ ہے۔ اسے گرا دیا جائے گا۔ ہم مزید پچھلی طرف اپنا گھر بنائیں گے۔ میرا شوہر یہ کام کر سکتا ہے۔ وہ ہر طرح کا کام کر لیتا ہے۔ آپ جانیں، اگر اس کے پاس وقت ہوتا تو وہ پودے لگاتا، کانٹ چھانٹ کرتا، اس جگہ کو پانی دیتا اور اسے بڑی اچھی جگہ بنا دیتا، لیکن......''

خدیجہ نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا، حتیٰ کہ اپنا مستقبل بھی۔ جیل سے ایک گھر تک جہاں اس کے پاس برتن ہوتے اور پھر، سونے کے دانت۔ وہ عثمان کو اپنی بانہوں میں جھولا جھلاتے ہوئے تخت پر بیٹھی تھی اور اس کا اٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس نے گھر کا اندرونی حصہ دیکھ لیا تھا لیکن وہ ابھی تک گھر کے مالکوں کے بارے میں وہ سب کچھ نہیں جان پائی تھی جو وہ جاننا چاہتی تھی۔

''گاؤں والوں نے ہمیں بتایا تھا کہ آپ کے شوہر ہر جگہ بجلی کے کھمبے لگا کر پہاڑوں اور دیہات تک بجلی لاتے ہیں۔ کیا ایسا ہی ہے؟ تو پھر وہ یہاں آپ کے اپنے گھر تک بجلی کیوں نہیں لاتے؟ کیا کوئی شخص پہلے اپنی جگہ کو روشن نہیں کرتا؟''

اس کا جواب اسے خود ہی مل گیا: ''جب آپ کے بیٹے کے ساتھ یہ سب ہوا...... آپ جانتی ہیں، خدایا، کوئی کیا کہہ سکتا ہے...... آپ واپس یہاں نہیں آئیں۔ لیکن یہاں آنا آپ کے لیے اچھا ہو سکتا تھا۔ کیا بہت سے مہمان آ رہے ہیں؟ عورتیں بھی؟ کیا ہفتہ دس دن کافی ہوں گے؟ یا کیا آپ بھی جاب کرتی ہیں؟ آپ کیا کرتی ہیں؟ کیا آپ کا کوئی اور بچہ نہیں؟ یا آپ اور بچے چاہتی نہیں تھیں؟ کیوں نہیں چاہتی تھیں آپ؟ خیر یہ آپ کا فیصلہ ہوتا بھی نہیں۔ جب یہ ہونا ہوتا ہے، ہو جاتا ہے......''

خدیجہ کے بیشتر سوالوں کو کوئی جواب نہ ملا۔ اسے اس عورت کی مسکراہٹوں، اس کے کھنکارنے اور اٹک کر بولنے، اس کی لاتعلق نگاہ سے کم ہی کچھ سمجھ آسکی تھی۔ حقیقت میں کچھ بھی نیا یا انوکھا نہیں تھا: حسن اس کا شوہر تھا۔ دوسرے لوگ جو آرہے تھے، وہ تھے جن سے اسے بے حد محبت تھی۔ اس کے دوست، اس کا بھائی اور......

''وہ سب بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ہم یہاں مل کر کچھ دن سکون سے رہیں گے۔ ہاں، ایک عورت بھی ہے۔ وہ نوجوان لڑکی ہے...... ہمارے ایک دوست کی منگیتر...... وہ ساتھ آئیں گے......''

وہ بولتے ہوئے اچانک رک گئی تھی۔ خدیجہ شک اور تجسس کے عالم میں ہنس دی۔ ''آپ کا مطلب ہے وہ آدمی، لڑکی کو ''اغوا'' کر رہا ہے، ہے ناں؟'' وہ یوں ہوشیار دکھائی دے رہی تھی جیسے اسے سب جواب معلوم تھے۔

کھاڑی کے اوپر سورج ڈھل رہا تھا، کمرے کی مغربی کھڑکیوں پر پڑنے والی دھوپ کی کرنیں سنہری تھیں۔ عورت کے چہرے سے ضرور صاف دکھائی دے رہا ہوگا کہ خدیجہ کے سوال دَم گھونٹ دینے والے تھے۔ اس کی جس قدر جلد ممکن ہو سمندر میں غوطہ لگانے اور شام کی آخری دھوپ کو مِس نہ کرنے کی خواہش اس قدر غلبہ پالینے والی یا طاقت ور تھی کہ آخر اس نے بڑی خجالت سے کہہ ہی دیا، ''میں اندھیرا پھیلنے سے پہلے کچھ دیر تیراکی کرنا چاہتی ہوں۔''

اس کے سوالوں کی طرح، خدیجہ کی باتوں کا بھی کوئی آخر یا اختتام نہیں تھا۔ اس کا سب سے پہلے وہ کچھ پوچھنا جو آخر میں پوچھنا چاہیے تھا اور جو پہلے پوچھنا چاہیے تھا اسے سب سے آخر میں پوچھنا، اس کے جب چاہے گھر اور باغ میں گھس آنے کی طرح تھا۔ اسے آداب وغیرہ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ (جہاں تک ان کی بات ہے جو اپنی زندگی میں آداب و اخلاقیات کی بہت پرواہ کرتے ہیں، وہ آداب اور اخلاقیات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے صرف ان جگہوں اور وقتوں میں گھس آتے ہیں، جن سے ان کا تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، جنگل، برف سے ڈھکی سڑکوں پر میری سیر، کھڑکی جہاں ریسٹورنٹ میں مَیں تھی، سورج غروب ہوتے وقت، سوئمنگ پول کے کنارے، پانیوں کی تہ میں، وغیرہ وغیرہ......)

''آپ کا نام......؟''

''نوین۔''

(وہ لمحہ جب میں نے خدیجہ کے سوالوں کے نتیجے میں اس عورت کا نام جانا، میں اپنے ناخن کتر رہی تھی)۔

اپنے منہ میں جمع کھارے پانی کی کلی کرتے ہوئے نوین سطح پر ابھری۔ اس نے اپنی پشت گھر کی جانب کر لی اور ساحل اور صنوبر کے جنگل کی جانب رخ موڑ لیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ سورج اچانک سمندر میں ڈوب گیا تھا، اس کی کرنیں اس کے سامنے موجود پہاڑوں، صنوبر کے درختوں سے ڈھکے جزیرہ نما اور انار کے رنگوں والے ساحل پر پڑ رہی تھیں۔ آسمان اور ساحل پر سورج کی نارنجی، گلابی، قرمزی شعاعوں کا عکس بہت دیر تک باقی رہا۔

جب وہ سمندر سے باہر آئی تقریباً دھندلکا پھیل چکا تھا۔ کھاڑی پر پوری طرح سائے پھیل چکے تھے۔ اس نے کٹی پھٹی ناہموار چٹانوں کو پکڑا جن کے تالاب اب آہستہ آہستہ بھرنے لگے تھے۔ اسے سمندری صدف دکھائی دیئے۔ کس قدر بڑے صدف؟ جلد ہی چاند مکمل ہوجائے گا۔ ان کے اندرونی حصے بھر جائیں گے۔ پھر وہ سمندری صدف چٹانوں پر لے آئیں گے۔ وہ انہیں بالٹی بھر کھارے نمکین پانی میں بھر کر ٹیرس پر لے آئیں گے۔ وہ ان کے نرم پیٹ چاقو سے صاف کریں گے۔ وہ خول میں موجود گوشت کے چھوٹے سے ٹکڑے پر لیموں چھڑکیں گے اور اپنے فورک سے اسے اٹھا کر منہ میں رکھ لیں گے۔ اس کے ساتھ وہ ٹھنڈی وائن پئیں گے۔ صبح سویرے اسے شہر جانا چاہیے...... الانیا۔ اسے سفید وائن اور کچھ دوسری چیزیں خریدنی چاہئیں، خصوصاً ٹانک واٹر۔ جب فواد، اس کا بھائی آتا ہے...... وہ سب سے پہلے آئے گا۔ شاید۔ حسن اور نہ ہی وہ شام سے پہلے آپائیں گے۔ اس کے پاس وقت تھا۔ تو لیے تب تک تیار نہ ہوں گے۔ اسے کچھ تولیے بھی خریدنے چاہئیں۔ اس نے میز پوش میں بندھی چیزیں خدیجہ کو دے دی تھیں جو بلاشبہ بہت دیر بیٹھی رہتی، لیکن یوسف پھولی ہوئی سانس کے ساتھ آ گیا، ''بابا بلا رہے ہیں، جلدی آؤ۔''

تیراکی کے بعد پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اسے کنویں کے پمپ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ سمندری صدف اور جڑی بوٹیوں کے بعد، جو اس کے خیال میں اس نے کچھ دیر پہلے چکھی تھیں، وہ

اب ڈیزل اور آئیوڈین کا امتزاج بھی چکھ سکتی تھی۔

وہ باغ میں نہا رہی تھی۔ شمال مغرب سے آتی ہلکی سی ہوا سے اسے ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ ٹھنڈے پانی کے نیچے اپنی سانس روکتے ہوئے اس نے خود پر سے نمک صاف کرنے کی کوشش کی۔ بجری کے راستے سے پرے جھاڑیوں میں سے چر چراہٹ کی آواز آئی۔ کنویں کے پمپ سے آنے والا شور جاری رہا مگر جھاڑیوں میں ہونے والی حرکت نے اسے وہ آواز بھلا دیا۔ کپکپاتے ہوئے اس نے اپنے سر پر ہونے والی پانی کی پھوار سے پرے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کسی کو نہ دیکھ پائی۔ پھر بھی اس نے سخت آواز میں پکارا، ''یوسف! باہر، سامنے آؤ!''

چر چراہٹ کی آواز فوراً رک گئی۔ حرکت رک گئی۔ لیکن کوئی بھی سامنے نہ آیا۔ نوین کی آواز دوبارہ سنائی دی، وہ پیچھا کیے جانے اور خود پر نظر رکھے جانے سے تنگ آ چکی تھی۔ ''دیکھو یوسف، اگر تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے، تو سامنے آؤ اور کہو۔ مزید کوئی جاسوسی نہیں اور بلا وجہ ہی مت آجایا کرو، ٹھیک ہے؟''

کوئی جواب نہ ملا اور کوئی دکھائی بھی نہ دیا۔ وہ کانپنے لگی۔ خود کو تولیے میں لپیٹتے ہوئے وہ اس جگہ سے گزری جہاں بجری کا راستہ جھاڑیوں اور چٹانوں سے ملتا تھا۔ ہر طرح سے پُرامن رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے اپنی آواز کو کچھ نرم بنایا، ''یوسف، میں جانتی ہوں کہ تم یہاں ہو۔'' اس نے کہا، ''کل دوسرے لوگ بھی آجائیں گے اور پھر سب ہی یہاں شاور لیا کریں گے۔ تم سمجھتے ہو کہ کیا اس طرح لوگوں کی جاسوسی کرنا ٹھیک ہوگا؟ اگر تمہیں کچھ کہنا ہے یا تم کچھ چاہتے ہو تو مجھے بتاؤ، ٹھیک ہے؟ لیکن یہاں ٹھہرے رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نہ ہی تمہارے متجسس ہونے کی کوئی چیز ہے۔ دیکھو، تمہارے ہمسائے آگئے ہیں۔ تمام ہمسایوں کی طرح...... بس مجھے اکیلا چھوڑ دو، پیارے یوسف......''

کوئی آواز، کوئی سرسراہٹ بھی سنائی نہ دی۔ نوین کا غصہ اور بے چینی ختم ہو چکے تھے۔ پھر وہ مسکرا دی۔ یہ بس یوسف کا بچگانہ تجسس تھا۔

وہ بجری کا رستہ پار کر کے گھر میں داخل ہوگئی۔

اندر نیم تاریکی ہے۔ ایک لیمپ میں کچھ مٹی کا تیل یا کیروسین باقی تھا۔ اس نے اسے فوراً

نہیں جلایا بلکہ رات کے لیے بچالیا۔ ابھی اس کے اردگرد پوری طرح تاریکی نہیں پھیلی تھی۔ ایک گہری ارغوانی شام نے کمرے کو اپنے رنگ سے بھر دیا تھا۔

سب اچھا تھا۔ صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز ترتیب سے اپنی جگہ پر تھی۔ وہ سب اسے ضرور پسند کرتے۔ دوآن (Doğan) کا شاعر دل ضرور دیوانہ ہو جاتا۔ کمرے کی صفائی حد سے زیادہ نہیں تھی۔ مغربی کھڑکیوں سے مدھم زرد روشنی تخت پر پڑ رہی تھی، جہاں دو لوگ آسانی سے سو سکتے تھے۔ سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا نے جنوبی کھڑکی کا شٹر آدھا بند کر دیا تھا۔ سفید لیس والے میز پوش والی ڈائننگ ٹیبل تاریکی میں تھی۔ اس نے میز پر قطاہیا(Kütahya) کا سرامک فروٹ باؤل رکھ کر اس میں خدیجہ کے لائے کیلے اور دو سیب سجا رکھے تھے۔ مدھم روشنی میں فروٹ باؤل کسی ساکت تصویر کی خوب صورت ڈرائنگ لگ رہا تھا۔ ایک بڑے مٹی کے پالش شدہ برتن میں رھوڈ ز فلاور کی میرون پھولوں والی تازہ توڑی گئی شاخ سجائی گئی تھی۔ سفید دیوار کے پس منظر اور خصوصاً اس نیم تاریکی میں پھول بے حد خوب صورت لگ رہے تھے: اب وہ وہاں سائے میں مرجھا جائیں گے۔ (اسے یہ جاتے ہوئے میرچ(Meriç) کو تحفے میں دے دینے چاہئیں......دوآن، میرچ......ایک مرتبہ شروع کر لیں تو نام دینا آسان ہو جاتا ہے......) اداسی کی بات ہے کہ دوآن اور میرچ صرف ایک ہفتہ ہی ٹھہر پائیں گے، لیکن رھوڈ ز فلاور ایک مرتبہ خشک ہو جائیں تو سال بھر باقی رہیں گے۔ وہ اپنا رنگ وروپ کھوئیں گے نہ ہی ان کی ٹہنیاں جھڑیں گی......

اس کے چہرے پر ایک سایہ سالہرا جاتا ہے: اگرچہ اس نے کسی بھی چیز کو زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان نہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی ایک چیز کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہو؟

وہ اپنا سر جھٹکتی ہے، اسے صبح یاسمین کی کانٹ چھانٹ کرنی چاہیے۔ اسے اب میٹرس اندر لے جانے چاہئیں، شام کی شبنم اب گرنی شروع ہونے والی ہے۔

وہ اچھے لوگ ہوں گے۔ کیسا ہو اگر حسن اپنا کام ختم کر لے اور باقی سب کے آنے سے پہلے یہاں پہنچ جائے؟ کیا ہو اگر وہ اس پرانی جگہ پر سونا چاہے؟ خیر، اگر وہ چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے۔ ان کی علیحدگی کے بعد بھی وہ شہر والے گھر میں بہت مرتبہ ساتھ رہے تھے۔ ایسی بہت سی راتیں تھیں جب وہ ساتھ تھے۔ ایک عرصہ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس کے باوجود، یہ حسن تھا جو عرصہ

ہوا اپنی ''نا اہلیت'' بھلا چکا تھا۔ کوئی سبکی یا ذلت محسوس کرنے یا غصے میں آنے کا رحجان رکھے بغیر۔ اسے کوئی خامی کا احساس تھا نہ ہی اس سب سے باہر نکلنے کی، اپنی اس حالت پر کوئی عذر تلاش کرنے کی کوئی کوشش۔ یوں جیسے اسے کوئی پناہ گاہ مل گئی تھی اور وہ وہیں مقیم تھا۔ اپنی زندگی کے اس حصے میں وہ اپنی جگہ پر، بے حرکت کھڑا ہوا، منتظر رہا۔ (میرون پھول جو سائے میں خشک ہو چکے تھے......) اس کی جنسیت میں شامل تمام پریشانیاں یا تناؤ اپنی قدر کھو چکی تھیں۔ اس جیسی اور کوئی پریشانیاں نہ تھیں بلکہ وہاں کچھ اور تھا، کچھ مختلف...... یوں تھا جیسے اس کے پاس نئی امید تھی، نئی خواہش خصوصاً جب معاملہ خود حسن کا تھا۔ جو کبھی سطح پر تھا، اب بالکل تہ میں جا کر حقیقت میں غائب ہو چکا تھا اور وہ جو تہ میں تھا اب مکمل طور پر سطح پر ابھر چکا تھا۔ حسن کا فطرت سے عشق اچانک خود کو ظاہر کرتے ہوئے بہت سی دوسری چیزوں سے بدل گیا تھا...... تقریباً ہر چیز سے۔ یوں اس کی نوکری مقدم ہو گئی تھی، پہاڑ، ڈھلانیں، طویل سڑکیں، مشرق، موسم سرما کے دورے...... (حسن تین مہینے بے روزگار رہا تھا)۔ اس میں مزید خود پر اعتماد کی کمی نہیں تھی...... یا جو نوین کے لیے ناقابل معافی تھا...... اس کی نامردی۔ اب حسن میں ویسا کچھ نہیں تھا جو اس کے بے روزگار ہونے کے بعد اس میں پھوٹا تھا، وہ اچانک ان کی آخری چھٹیوں کے دوران حسن کو اس کی جانی پہچانی ''نا اہلیوں'' کی طرف دھکیلتے ہوئے ظاہر ہوا تھا، نوین کو حیران کرتے، تکلیف دیتے، پریشان کرتے، حتیٰ کہ غصہ دلاتے ہوئے...... لیکن حسن ان پریشانیوں اور خجالت یا شرمندگی سے جو اسے اپنی ''نا اہلی'' پر تھی، آخری بار شہر والے گھر میں نوین سے ملنے کے بعد گزر گیا تھا...... آہ حسن، اگر یہ کسی قسم کی بحالی تھی تو کیا موت اس کے لیے ضروری تھی؟...... اب ایک بالکل نئی تمنا۔ ایک بالکل نئی اور تازہ کشادگی: فطرت۔ اس نے اب مسلسل ان پہاڑوں کے متعلق بات کی تھی، جہاں ان کے سروں کے گرد بادلوں کا حلقہ ہوتا تھا، ان پہاڑوں اور خاموش برفوں میں اس کی نوکری۔

اس ساحل پر ایک از سر نو ملاپ ہوگا۔ وہ فطرت کے دل کے عین بیچ میں ہوں گے۔ تنہا ریتلے ساحل، اناروں کے سایوں اور رنگوں میں شامیں...... نہیں، یہ تمنا کوئی کھنڈر نہیں ہے۔ یہ ساحلی شہر ہے جو اب مضبوط تعمیر کیا جائے گا، جسے یقیناً تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ نوین کی تجویز تھی۔ لیکن اس سے سب بہت خوش ہوئے۔ ایک تو دارالحکومت سے آئے

گا۔فواد، اس کا بھائی...... وہ ڈینٹسٹ چیئرز بناتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا وہ کافی مے نوشی کرنے لگا ہے۔ وہ 35 برس کا ہے۔ اس نے شادی نہیں کی۔ وہ واضح طور پر نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کی نوکری بہت تھکا دینے والی اور محنت طلب ہے۔ حتیٰ کہ بے معنی بھی، لیکن صرف یہی نہیں ہے۔ اس نے نوین کو فون پر بتایا تھا، ''میں زندہ رہتے تھک چکا ہوں نوین۔ میں آؤں گا۔ مجھے آنا ہوگا۔ میں ایک ہفتے یا شاید دس روز کے لیے اپنا بزنس اپنے پارٹنر کے حوالے کر آؤں گا۔ پہلا موقع ملتے ہی میں آ جاؤں گا۔ بالکل صحیح وقت پر آگے بڑھنا جاری رکھنے کے لیے تم نے مجھے تھامنے کو، سہارا لینے کو کچھ دیا ہے۔ کتنا اچھا ہوا کہ تم نے یہ سوچا، کتنا اچھا ہوا کہ تم نے سوچا!''

اسے یاد آتا ہے کہ وہ بھی اس سے اچھی باتیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے ایسی خلوص بھری باتیں اس سے کی تھیں کہ فون پر فواد کی آواز گرم جوش ہوگئی اور بھرا گئی تھی۔ آخر میں فواد کی آواز خوشی سے گویا پھٹ پڑی، ''ہم ایک دوسرے کو تقریباً بھول چکے تھے۔ یوں جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے کبھی وجود ہی نہیں رکھتے تھے، یوں جیسے ہم کبھی وجود رکھنے والے ہی نہ تھے!'' اس نے کہا، ''سنو نوین، تمہیں حسن کو بھی ڈھونڈنا چاہیے۔ یقیناً اسے بھی آنا چاہیے۔''

فواد ہنس رہا تھا۔ وہ اس طرح ہنس رہا تھا جیسے وہ ایک لمبے عرصے سے نہ ہنسا تھا۔ مسلسل: ''کتنا اچھا ہوا تم نے سوچا، تم نے کتنا اچھا سوچا!'' وہ کہہ رہا تھا، ''دیکھو موت کی نہیں بلکہ زندگی کی سائیڈ پر رہنا، زندگی کی وہ باریکیاں ہمارے ذہنوں سے کبھی نہیں گزریں۔ ہم نے کبھی اس گڑھے سے باہر آنے کا سوچا ہی نہیں، جس میں ہم گر چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر، حسن...... اس نے ہار مان لی، اس نے سب کو وہیں سویا رہنے دیا، جہاں وہ تھے......''

یہ سچ تھا۔ حسن اس آفیشل ڈیسک پر سو چکا تھا، خصوصاً جب وہ اس سے محروم ہوا تھا! اس نے نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی وہیں چھوڑ دیا جہاں وہ تھا۔ حتیٰ کہ گونے کے غم سے پہلے بھی، یوں تھا جیسے اس کے پاس بانٹنے یا بتانے کو کچھ نہ بچا تھا۔ وہ پوری طرح اپنے خول میں واپس گم ہو چکا تھا۔ اس کا اور نوین کا ملن ایک خاموش تاریک غلام گردش تھا۔ وہ تھکا دینے والا تھا۔ وہ اپنے راستے کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ یہ جاننا ناممکن تھا کہ کون کسے اٹھائے ہوئے تھا، کون کس کا بوجھ ڈھو رہا تھا۔ کسی وجہ سے بوجھ کو، بے معنی پن کو ختم کرنا مشکل تھا: فکر مت کرو حسن، یقیناً تمہیں نئی نوکری

مل جائے گی...... ہم اپنے بیٹے کی دیکھ بھال کریں گے...... خود کو اپنے حال پر مت چھوڑ دو...... میں زیادہ تراجم کروں گی، زیادہ لیکچر دوں گی، اس سے سب ٹھیک ہو جائے گا...... ہم راتوں کو بھی کام کریں گے، تم میری مدد کرو گے، میں تمہاری مدد کروں گی، ہم ان چیزوں پر قابو پا لیں گے۔ شاید تمہیں ایک نئی نوکری مل جائے گی، ایک نیا اُفق۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم پھر سے دوبارہ آغاز کریں گے۔ ہم اپنے بیٹے کی پرورش کریں گے۔ لیکن تم اگر اپنے آپ میں اس طرح دبک کر بیٹھ گئے، میں نہیں جانتی، کیا گو نے ہمیں زندگی کا سامنا کرنے میں بزدلی کا الزام نہیں دے گا؟

کیا اس نے یہ سب باتیں اسی طرح لفظ بہ لفظ حسن سے نہیں کہی تھیں؟ کیا وہ یہ سب باتیں کہہ پائی تھی؟ یا بالکل تب جب اس نے یہ سب کچھ کہنا چاہا تھا، وہ پیچھے ہٹ گیا تھا، طویل خاموشیوں کو بھی نہ بانٹتے ہوئے، کیا وہ خود اپنے بل بوتے پر کھڑے ہونے کا انتخاب کرتے ہوئے اس سے دست بردار ہو گئی تھی؟

وہ الگ ہو گئے۔ حسن کے پاس اب نوکری تھی، وہ نئی نوکری، پھر بھی وہ الگ ہو گئے۔ یوں تھا جیسے ان دونوں نے اپنی تکلیفوں یا بوجھ میں ایک دوسرے کو ملوث کیے بغیر تنہا رہنے انتخاب کر لیا تھا۔ یہ کچھ بہتر تھا۔ وہ الزامات سے پرے رہ سکتے تھے...... الزام جو واضح اور ظاہر تھے، چاہے ان کا مظاہرہ نہ بھی کیا جاتا...... لیکن اس کے بعد، گو نے کی خبر...... گو نے، دوآن کے ''شکست خوردہ بازنطین'' میں، اس استنبول میں، اپنے کالج کے پہلے سال میں...... اس کے بعد سے سب کچھ آپس میں گڈ مڈ ہو گیا تھا: آخری سال پہلے دنوں میں، پہلے دن آخری برسوں میں...... (اپنی چھٹیوں کے اختتام پر میری نگاہیں لمحے بھر کو ایک بار پھر اس اجاڑ گھر پر پڑیں۔ جیسے ہی مجھے ادراک ہوا کہ میں اس زرد لباس والی عورت کے زمانے سے گزر رہی تھی، جس کا نام نوین تھا، میں لڑکھڑا گئی...... اور یہ کہ میں ایسے سفر پر اس کے ساتھ مزید آگے چلی گئی تھی۔ میرے اندر کہیں ایک تلخ مسکراہٹ ہے جو میں دنیا کو نہیں دکھا سکتی ہوں۔ میرے سامنے میری شکست خوردہ حالات۔ ہتھیار ڈالنے، کھو دینے اور حتیٰ کہ...... کون جانتا ہے...... جیتنے کا احساس...... یہ کہ سادہ نگاہ کے سامنے وہاں ایک قید خانہ ہے، میں اس سے آگاہ ہوں۔ لیکن کون کس کا قیدی ہے؟ کیا، کس وقت میں؟ شاید وہ جو ہمیں اسیر کر لیتا ہے، وہ ان ساحلوں پر مشاہدہ کیا جانے والا وقت ہے)۔

کپڑے پہنتے ہوئے نوین پوچھتی ہے: کیا اس شام شہروالے گھر میں کافی کے لیے آئے حسن کو اس کی دعوت نے امید نہیں دلا دی تھی؟ یا اس نے سوچا تھا کہ وہ اسی چھت کے نیچے دوبارہ اکٹھے رہنے والے تھے، جب وہ ان چھٹیوں پر شہر واپس آئے تھے؟ اس کے چہرے پر ایسی شرمیلی مسکراہٹ تھی۔نہیں، بلکہ ایسی مسکراہٹ جسے وہ نہیں پہچانتی، جیسے وہ کوئی نام نہ دے پائی۔ایک بے حد خوبی سے چھپا ہوا حسن۔اس کے باوجود: اس نے کہا تھا: ''مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی کہ تم وہاں جانا چاہتی ہو نوین۔ہمیں اس چیز سے بہت پہلے گزر جانا چاہیے تھا۔یہ نئی رکاوٹ جو ہم نے خود اپنے آپ پر عائد کر دی تھی......''

اس وقت اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ حسن نے گونے اور اس کی یہاں سے وابستہ یادوں کی وجہ سے اس طرح بات کی تھی۔بلاشبہ یہ بھی ایک وجہ تھی۔لیکن اب وہ ہلکا سا فرق کرتی ہے: شاید حسن نے خیال کیا تھا کہ تین برسوں کے اختتام پر وہ بھی اپنی طاقت کھو چکی تھی اور اب پہلے کی طرح مل کر رہنے کا کوئی راستہ تلاش کر رہی تھی۔لیکن نہیں، بالکل ایسا بھی نہیں تھا۔اسے جس چیز کی توقع تھی وہ صرف اکٹھے رہنا نہیں تھا۔وہ کیا تھا؟ کچھ اور......ڈراؤنے خوابوں سے جنم لینے والی ایک چاہ جس نے ہر کسی کو جسے وہ جانتے تھے، گلے لگا لیا تھا، ڈوبتے ہوئے بحری جہاز کے مسافروں کی طرح جو ایک دوسرے کو گلے لگا لیتے ہیں، اچانک ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں، یوں جیسے وہ دوست بننے کو مرے جا رہے تھے۔شکست کی دہلیز پر اس کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے۔خیر، کیا حسن چیزوں کو اس طور جانتا تھا؟ کہ نوین کی ان ساحلوں پر دوبارہ اکٹھے ہونے کی تمنا، تعاون کی ثبوت کی نئی تلاش تھی، ماضی کو کریدنے کے لیے نہیں بلکہ مستقبل کو برداشت کرنے کے لیے؟

نوین نے جھرجھری لی۔وہ نیم روشن کمرے کے آئینے میں ان کے عکس پر نظریں جمائے کھڑی ہے۔نہیں، مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ہر کسی کو، سب جنہیں میں قریب سمجھتی ہوں، یا وہ جن کے ساتھ میں کبھی قریب رہی تھی، ہم سب کو، ہم سب کو اس طرح نئے ملن کی ضرورت ہے۔خود کو چھپائے بغیر، فرار ہوئے بغیر، تلاش کو چھوڑے بغیر، نہ صرف میں بلکہ ہم سب ہی صبر وضبط کی طاقت کھو چکے ہیں۔

دوآن ہی کو لے لو۔وہ اپنے شکست خوردہ بازنطین سے لکھا کرتا تھا۔حالیہ برسوں میں وہ ایسی حالت میں تھا کہ وہ اپنے خوب صورت اشعار کو زبان نہ دے سکا تھا، اسے انہیں جمع کرنے، ان

کی تخلیق کے لیے وقت نہ مل پایا تھا۔ خود کو سپورٹ کرنے کی خاطر کئی نوکریوں کے ساتھ ساتھ اپنے معذور باپ کی ذمے داری بھی اسی پر تھی۔ اب وہ خود زندہ رہنے اور دوسرے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ وہ اسے مزید نہیں جھیل سکتا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس نے کیا کیا اور کیوں کیا۔ اس نے کہا کہ وہ یقیناً زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاتا، اگر وہ جانتا کہ وہ کیا کر رہا تھا اور کیوں کر رہا تھا...... اس نے اپنے معذور باپ کی بھی دیکھ بھال کیوں کی تھی...... اگر ان تمام چیزوں کا کوئی کل تھا، اگر وہ افق پر کوئی جوش وولولہ یا زندہ دلی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن افق پر تو روشنی کا کوئی چھوٹا سا ذرہ بھی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنے قتل وخون اور نوجوانوں کی جاری گم شدگیوں کے بیچ ایک بوڑھے معذور شخص کے ابھی تک سانس لیے جانے پر پریشان تھا...... گو نے سمیت، آپ جانتے ہیں... اور پھر اس سوچ کا اس کے دل کو ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا۔ اس نے مختصر عرصے کے فرار اور پناہ کے طور پر یہاں آنے کی دعوت قبول کی تھی۔ ''میں نے کہیں سے رقم ادھار لی۔ میں نے اپنے والد کے لیے ایک کیئر ٹیکر کا انتظام کیا۔ جنہوں نے اس خاتون کیئر ٹیکر کی سفارش کی تھی، انہوں نے کہا کہ میں اطمینان رکھوں کہ وہ اچھے ہاتھوں میں تھے۔ اس ہفتے کا آزمائشی دورانیہ تو حوصلہ افزا تھا۔ میں بھی اس سب سے بس نکلنا چاہتا تھا۔'' اس نے لکھا، ''تمہارا مشورہ، تمہاری دعوت بالکل صحیح وقت پر مجھے بچانے آئی! میں جاتا، کسی جگہ پناہ ڈھونڈنا چاہتا تھا، اخبار، اپنی نظموں اور سب سے بڑھ کر اپنے والد کو ایک طرف رکھ کر...... اس سب سے بڑھ کر میری نہیں بلکہ ان کی مذمت کریں...... فرار ہونا چاہتا تھا۔ میں ایسا چاہتا تو تھا لیکن میرے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ میں کسی ساحل سمندر، پہاڑ، جھیل، صحرا کہیں بھی کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا متحمل ہو سکتا۔ میں ہر چیز کا اختتام تھا نوین۔ مجھ سے ناراض مت ہو۔ میں یقیناً تمہاری بھی کمی محسوس کرتا رہا ہوں۔ میں نے تمہاری بے حد کمی محسوس کی لیکن میں نے ساحل سمندر کی زیادہ کمی محسوس کی۔ بس پانی میں غوطہ لگانا...... غوطہ لگانا...... کیا تم جانتی ہو...... بالکل تم جانتی ہو...... میں نے پانچ برسوں میں ایک دن کی بھی چھٹی نہیں لی؟ ویسے کیا میں میرچ کو بھی لا سکتا ہوں؟ تم نے کہا تھا کہ وہ پہلی ملاقات میں ہی تمہیں اچھی لگی تھی۔ وہ راتیں جب میں اخبار میں ڈیوٹی پر ہوتا تھا، وہ ہمیشہ میرے والد کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ اتنی بے غرض لڑکی ہے۔ وہ ابھی بھی یہاں میرے قریب میز پر بیٹھی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں اپنے سامنے کے دانت کو اپنی انگلی سے چھو رہی ہے۔ اس کی ایک

انگلی تقریباً ہمیشہ اس کے سامنے کے دانت کو دبا رہی ہوتی ہے۔ میں اسے دیکھ کر مسکراتا ہوں۔ ایک لڑکی جو مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے، جو حتیٰ کہ مجھے کسی عورت کے وجود کی آرزو بھی دیتی ہے...... کسی وجہ سے جب وہ اپنے سامنے کے دانت سے کھیل رہی ہوتی ہے تو میں اس کی آرزو کرنے لگتا ہوں...... جو مجھے محسوس کرواتی ہے کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ کیا وہ بھی میرے ساتھ آسکتی ہے؟''

اور اس نے دوآن کو جواب میں کہا، تم جسے بھی چاہو، جو بھی پسند کرو، لا سکتے ہو۔ اس کی واحد خواہش: وہ سب، وہ سب جن سے وہ محبت کرتی ہے، وہ سب جن سے وہ محبت کرنا چاہتی ہے، اپنے ساتھ وہ سب کچھ لائیں جنہیں وہ پسند کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ سب کچھ جو اُن چاہا تھا، جو انہیں کھا رہا تھا، وہ کہیں پیچھے رہ جائے۔ یہ شرط یہ کہ تم وہ سب کچھ اپنے پیچھے چھوڑ آؤ، جس نے ہمارے ایام کو تقسیم کر دیا، ہماری معمول کی زندگیوں کو تاریک تر کر دیا، ہمیں ہمیشہ نامعلوم کی طرف گھسیٹتے ہوئے اس شبے میں ڈال دیا کہ ہم زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد دوآن نے لکھا کہ آنے والے روز کی شب وہ اور میرچ جنوب کی طرف روانہ ہونے والی بس پر سوار ہونے والے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ 48 گھنٹے میں وہ یہاں ہوں گے، حسن سے پہلے یا اس کے آنے کے فوراً بعد۔ دوآن نے کہا تھا کہ اگر کل رات نہیں تو وہ اس سے اگلی رات ضرور بس پکڑ لیں گے۔ واحد چیز جو مجھے روک سکتی ہے وہ میرے والد کی وفات ہے اور کچھ نہیں اور وہ بہر صورت نہ مرنے پر مصر ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے اس خود پر شرمندگی ہوئی ہوگی، حتیٰ کہ وہ رویا بھی ہوگا، جیسا کہ نوین جانتی ہے۔

فواد اور وہ مل کر ان کے لیے بڑی اچھی میز لگائیں گے۔ سفید وائن برف جتنی ٹھنڈی کرنی ہوگی۔ حسن کس راستے سے آئے گا، مجھے حیرت ہے۔ انہوں نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ادھر آنے والی ساحلی سڑک کے لیے کیا وہ جنوب مشرق کا راستہ لے گا، جو اسے اس قدر پسند تھا؟ اسے تیز موڑ، عمودی ڈھلانیں بری نہیں لگتیں۔ مہارت اور آہستگی سے وہ تیز موڑ کاٹتے ہوئے، اسے وہ خود اعتمادی مل جائے گی، جو وہ سڑک پر ملنے والے خطرات اور رکاوٹوں کے لیے اپنی زندگی میں تلاش نہیں کر پایا۔ وہ ایک بے حد اچھا ڈرائیور تھا۔ وہ ایسا کیوں سوچتی ہے؟ لمبے عرصے سے حسن زندگی کا سامنا کرتے ہوئے خود اعتماد اور خود انحصار رہا ہے۔ کیا وہ اس لیے خوف سے دبک گیا اور جھک گیا کہ وہ

نامردی کو اہم سمجھتا تھا، کیا اس نے اس لیے اپنی طاقت کھو دی کہ وہ زندگی کا سامنا کرنے پر اپنے خول میں واپس گھس جانے پر مجبور ہو گیا تھا؟ پہلے کیا ہوا تھا؟ یہ دونوں، یہ دونوں ہی۔ بہت سے برسوں تک وہ کتنے اچھے طریقے سے اپنی زندگی جاری رکھے ہوئے تھے۔ جرأت سے، ایک بار بھی چیخے بغیر، فطری طور پر...... اپنی ڈرائیونگ کی طرح۔ وہ جس بھی راستے سے آئے اور وہ جس طرح بھی اپنی گاڑی چلائے، وہ یقیناً بے حد تھکا ہوا آئے گا۔ لیکن یہ ٹھیک ہے۔ آخر میں یہاں سب کچھ بہت خوب صورت ہو گا۔ سب کچھ بے حد سکون آور، تبدیل کر دینے والا ہو گا اور واپس بھاگ جانے کی کوئی پریشانی، پچھتاوا اور خواہش نہیں ہو گی، ان وقتوں کی طرح جب انہوں نے یہاں عائلہ (Ayla) اور صفوت (Saffet) کی میزبانی کی تھی...... میرے خدا، کیا ہو گا اگر ویسا ہی کچھ دوبارہ ہوا، اگر؟...... عائلہ نے صفوت کی مسلسل تحقیر کی تھی۔ انہوں نے اس سے پہلے ایسا کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کا رشتہ کس قدر بدصورت تھا! عائلہ خود شدت پسند تھی۔ وہ دن اب پوری طرح نوین کی آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔ اب یوں تھا جیسے عائلہ اور صفوت، اسی کمرے میں، اسی ٹیرس پر تھے۔ ہاں بالکل، عائلہ خود جذباتی تھی۔ صفوت نے اس جذباتیت اور شدت پسندی کو دعوت اور بڑھاوا دیا تھا اور اسی وجہ سے اسے ہی چوٹ آئی تھی۔ اس کی بیوی کے لفظوں، برتاؤ، نگاہوں نے اسے اس قدر ذلیل کیا تھا اور وہ اس کے جواب میں اتنا دبا ہوا رہا تھا کہ حسن اور اسے دونوں کو گھٹن ہونے لگی تھی۔ ہر لمحے اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ میز کے نیچے، بنچوں کے پیچھے چھپ جائے یا بھاگ کر جنگل میں چلی جائے، صنوبر کے درختوں کے بیچ غائب ہو جائے یا سمندر میں غرق ہو جائے...... اسے یاد آتا ہے کہ وہ مسلسل اپنا کوئی حصہ کھو رہی تھی، مسلسل خود اپنی آنکھوں میں چھوٹی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ چھٹیاں جتنی جلد ممکن ہو ختم ہو جائیں۔ حتیٰ کہ گو نے بھی ہنسنا بھول گیا تھا۔ وہ بے معنی ناقابل تصور چیزوں کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ تب گو نے چھے یا سات برس کا تھا...... ہاں، اسے اچھی طرح یاد ہے: وہ حتیٰ کہ ایک لمحہ بھی نہیں بھولی......

اس نے پانی کے پمپ کی آواز کی طرف توجہ دی۔ وہ رک چکا تھا۔

کیا بہتر تھا کہ اگر شور نہ رکتا؟

کیا وہ حسن ہے یا محمت، جسے زیادہ لمبا سفر کرنا ہے؟ محمت اب اپنی عمر کی دوسری دہائی میں

ہے،اس کے بیٹے کا پیارا دوست، اس کا بیٹا جو اسے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ (محمت، سٹاک ہوم سے آئے گا، جہاں وہ سوشیالوجی آف آرٹ کی تعلیم لے رہا ہے)۔ وہ پہلی بار گو نے کے بغیر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ گو نے اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ان کی آخری ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ پانی کے اس فوارے کے سامنے۔ (یاد ہے، وہ فوارہ جہاں ساحل پر ''تم جیسوں کے ساتھ'' پڑھنے کے بعد میں نے اپنے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے تھے۔ سیدہ کے کے مرکزی گیٹ کے ساتھ پانی کے فوارے کے جیسا، جسے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ معلوم کرنا آسان نہ تھا کہ وہ پرانا فوارہ کیا تھا اور یہ کہ نوین نامی ایک عورت وہاں بس سے اتری تھی، عمودی ڈھلان کے آغاز میں، لیکن گو نے اور محمت کی طرح میں بھی کبھی کبھار وہاں آتی جاتی تھی۔ میں وہاں کچھ لوگوں سے ملی اور کچھ لوگوں سے جدا ہوئی تھی۔ ان میں وائن گاڈز، کارواں لیڈرز اور رومی سینیٹرز شامل تھے)۔ گو نے بضد رہا تھا، تم اگلی گرمیوں میں یہاں آؤ گے، بھولنا مت، وہ محمت کو جہاز تک لے جانی والی بس کے پیچھے دیر تک ہاتھ ہلاتا رہا تھا۔ پھر کوئی بھی وہاں نہ آیا، نہ گو نے، نہ محمت اور نہ وہ خود۔

وہ کپڑے بدل لیتی ہے۔ اس نے ابھی تک مٹی کے تیل کا لیمپ نہیں جلایا۔ اس نے اپنے لیے ایک اور جِن تیار کی۔ اب ریفریجریٹر اندر سے کافی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ فریزر میں رکھا پانی پہلے ہی جمنے لگا تھا۔

اس نے تھوڑا سا پانی جِن میں ملایا۔ اس نے ٹانک واٹر کی دوسری بوتل کھول لی۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ اس تمام عرصہ سختی سے بند/ سیل رہی تھی۔ انڈیلنے کے دوران اس سے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ نوین کچھ خوش ہوگئی۔ اس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور کنکریٹ کی سلیب سے میٹرس اٹھا کر اندر لانے کے لیے باہر چلی گئی۔

باہر قرمزی رنگ گہرے سرمئی میں تبدیل ہو چکا تھا...... میٹرس بے حد گرم ہو چکے تھے۔ چھپکلیاں اب دکھائی نہ دے رہی تھیں۔ دُور سے اونٹ کی گھنٹی کی آواز سنی جا سکتی تھی، گاؤں کا مینارہ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے اسے سمندر سے قریب کر دیا ہو۔ جھونپڑی میں کوئی حرکت تھی نہ کوئی آواز۔ کیا یوسف شرمندہ ہو گیا تھا، اسے حیرت ہوئی۔ وہ اس سے سختی سے پیش آئی تھی اور اس کے نتیجے میں اس نے کوئی آواز تک نہ نکالی تھی بلکہ وہاں سرسراہٹ کی ایک نئی آواز تھی۔ نوین خوف زدہ نہ ہوئی

تھی۔ وہ کچھ غصے میں آ گئی تھی اور بس۔ یوں تھا جیسے یوسف کہہ رہا تھا، میں بھی آؤں گا، میں بھی دیکھوں گا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے قریب نہ جا سکی تھی کہ شور کہاں اور کس سے اٹھ رہا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر جھاڑیوں سے باہر نہ گھسیٹ سکی تھی۔ دھوپ ڈھل چکی تھی اور وہ تیراکی کے گیلے لباس میں تھی۔ اسے سردی لگ رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے دماغ سے یہ خیال نہیں گزرا تھا۔ وہ جھاڑیوں میں گھس کر اسے بازو سے پکڑنا، کھینچ کر باہر لانا اور اسے دکھانا چاہتی تھی کہ وہ یہ کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ کیا وہ واقعی غصہ تھا یا کیوں کہ وہ تھکی ہوئی تھی یا وہ خوف زدہ ہو رہی تھی؟ وہ ایسے متضاد احساسات میں گھری ہوئی تھی۔ یوں تھا جیسے وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور اپنے نہانے کے گیلے لباس میں ہونے کو اس نے اس کے پیچھے جانے سے رکنے کا بہانہ بنایا تھا، ان ساحلوں پر ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنے کا بہانہ۔ چاہے وہ گھبرا ہی گئی تھی، تب بھی وہ بالکل تھوڑی سی دیر کو ہوا تھا۔ لمحے بھر کو۔ ایک احساس جو کافی دیر اس پر طاری نہ رہا، اچانک کم ہوتے ہوئے تیزی سے پوری طرح مٹ گیا......

یوسف کا جاسوسی کرنا ایک طرف، بچوں کا رونا، خدیجہ کا موقع ملتے ہی آ دھمکنا، اس کا دیر تک بولتے رہنا، لمبی باتیں، اس کے سوالات، پمپ کا شور، نئی عمارتیں جو نیچے تعمیر کی جا رہی تھیں، مزدور جوان عمارتوں سے آگے نیچے ساحل پر سمندر کنارے نہانے دھونے کے لیے جاتے تھے، اس کا محسوس کرنا کہ مزدور پتھروں کے عقب سے عرصے بعد گھر کا کھلنا دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے، یہ نئی دلچسپی محسوس کی جا سکتی تھی، آپ جانتے ہیں ان سب باتوں نے مل کر اسے واقعی پریشان اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ گھر اور اس کے گرد و پیش میں اب وہ مکمل خاموشی نہیں تھی جس سے وہ پچھلے اتنے عرصے سے واقف تھی، دنیا کو اب بادلوں کے اوپر سے دیکھنے کا احساس باقی نہ تھا...... وہ احساس جس کی وہ وقتاً فوقتاً بے حد کمی محسوس کرتی تھی۔ سو ایسا ہے۔ اب ضروری ہے کہ دوسروں سے فاصلہ رکھا جائے اور اس کی حفاظت کے لیے جو کچھ بن پڑے کیا جائے۔ وہ پہلا اہم قدم بھی اٹھا چکی تھی۔ وہ خدیجہ کے تمام سوالوں کے جواب نہیں دے رہی تھی اور اس نے جھاڑیوں میں چھپے یوسف سے کھل کر بات کی تھی۔ اس نے اپنی جاسوسی کیے جانے پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا تھا اور اس سے فائدہ بھی ہوا تھا۔ اب ساتھ والی جھونپڑی محض اپنی دیواروں، کیلے کے درختوں کے ساتھ وہاں موجود تھی اور بس۔ ہاں ہاں، وہ یقیناً اس دنیا میں ہوتے جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کی تھی، تنہائی میں انہوں نے جس کی تمنا کی تھی۔

فولڈنگ بیڈ کو اندر لے جاتے ہوئے جھونپڑی کے سامنے اسے دھوئیں کی پتلی سی لکیر دکھائی دی۔ سفید گلاب کے گچھے کے ساتھ سرمئی آسمان کی طرف اٹھتی دھوئیں کی لکیر، شام کی تاریکی میں ضم ہوتی ہوئی۔ بلاشبہ۔ کسی کو بے آرام کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے ہمسایوں کی وہاں اس کے بالکل برابر میں موجودگی گویا اطمینان بخش تھی۔ اس کتے کے برابر تسلی دینے والی۔ سبزی باڑی۔ اٹھتا ہوا دھواں۔ بچوں کا رونا کب کا رک چکا تھا۔

خاصی تاریکی پھیل چکی تھی۔

گھر کے اندر، باہر سے زیادہ تاریکی تھی۔

اسے اب مٹی کے تیل کا لیمپ جلا لینا چاہیے۔ اگر ٹن کے کنٹینر میں مٹی کا تیل باقی ہے تو اسے لیمپ دوبارہ بھر لینے چاہئیں۔ اس آتش دان کے لیے کچھ سوکھی ٹہنیاں اور صنوبر کے مخروطے بھی جمع کر لینے چاہئیں۔ کچھ دیر پہلے، باغ میں شاور لیتے ہوئے اسے خواہش ہوئی تھی کہ اندر آتش دان میں آگ روشن ہو۔ شاید اندر آتش دان کو روشن کرنے کے لیے کافی وقت نہ ہوتا۔ شاید کوئی ایسا نہ چاہتا۔ شمالی ہوا کا زور کم پڑ چکا تھا۔ ایک گرم خوب صورت رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ آسمان پر کوئی بادل نہ تھا اور ایسی کوئی علامت بھی نہ تھی کہ ہوتا۔

یوں جیسے بارشیں کبھی نہ ہوں گی۔

لیمپس تیار ہیں۔ اس نے کچن کی کھڑکی میں ایک روشن کیا اور بتی نیچی کر دی۔ اس نے اپنے لیے دوسری ڈرنک تیار نہ کی۔ فلیش لائٹ لے کر وہ واک کے لیے باہر چلی گئی۔

اس نے مغرب کا رخ کیا۔ خالی تالاب کے قریب پہنچ کر اس نے اوپر نگاہ کی۔ اسے گہرے سرمئی آسمان پر کسی سٹکر کی طرح چپکا آدھا چاند دکھائی دیا۔ چاند کے ایک سرے پر خود چاند جتنا روشن ایک بڑا ستارہ چمک رہا تھا۔ لیکن سب ستاروں کے برعکس وہ اتنا روشن تھا کہ اس کے مقابلے میں نصف چاند زرد دکھائی دے رہا تھا۔

وہ راس (Cape) کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ جہاں سورج غروب ہوا تھا، اس طرف رخ کرتے ہوئے وہ پتھروں سے نیچے اتر آئی۔ وہ ابھی تک گرم تھے اور ان پر سے گزرنے والی گرم ہوا اس کی عریاں ٹانگوں کو چھو رہی تھی۔

وہ وہاں کھڑی رہی جہاں لہریں بار بار آ کر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے سمندر کی ابھرتی ہوئی موجوں کو دیکھا، چٹانوں کے درمیان کھوکھلی جگہوں میں آتے جاتے کیکڑوں پر اس کی فلیش لائٹ کی روشنی پڑی۔ (وہ لمحے جن میں مَیں نے وقت کا دیوانہ وار تعاقب کیا! سب کچھ قدیم وقتوں کی گہری سرمئی فرضی کہانیوں میں لپٹا ہوا ہے، اس سارے سرمئی میں واحد دوسرا رنگ مخملیں زرد ہے۔ بادلوں کے بیچ سے چھن کر آتی اور اچانک کسی مقام پر پڑی سورج کی کرنوں کی طرح، وہ دھبہ خود کو اسی گہرے سرمئی سمندر اور اسی رنگ کے آسمان کے سامنے کچھ دیر کو ظاہر اور واضح کرتا ہے اور جب سفید جھاگ دار لہریں چٹانوں کی طرف بڑھتی ہیں تو وہ زرد رنگ پھیلتا اور خود ختم ہو جاتا ہے، وہ بہ مشکل قابل فہم واپسی میں غائب ہو جاتا ہے، نا قابل امتیاز، جب وہ ماند پڑتا ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے پانی اور آسمان کے سرمئی پن میں نفوذ کر چکا ہے)۔

یہاں ان چٹانوں پر کسی کو یوسف دکھائی دیتا ہے نہ اس کی، پمپ کی یا کسی بھی اور چیز کی آواز سنائی دیتی ہے۔ زمانوں پہلے جب وقت دیوی دیوتاؤں کے لیے گونگا بہرا نہیں تھا، جب سمندر کی دنیا میں نیپچون، وینس کے تعاقب میں تھا...... اس نے سمندری لہروں کو سنا۔ پانی زوردار آواز کے ساتھ چٹانوں کے اندر کھوکھلے حصوں کو بھر رہا تھا، پھر وہ گہری آوازوں کے ساتھ واپس پلٹ جاتا۔ سمندر کا ابھار جاری رہا۔ اسی طرح اوپر نصف چاند اور اس کے قریبی ستارے کا آسمان پر ابھرنا جاری رہا۔

زیادہ دیر نہ گزرتی کہ چاند مشرق سے، صنوبر کے جنگل پر سے طلوع ہونے لگتا۔ وہ نیلاہٹ زدہ سبزے میں سے چمکتا ہوا ابھرتا، جب وہ سمندر پر طلوع ہوتا تو نارنجی سرخی کو نقرئی نیلاہٹ میں بدلتے ہوئے اس کی کرنیں چوڑی سی کھاڑی اور ساحل کو جھلملا دیتیں اور گھر کے سامنے چھوٹی کھاڑی پر ایک راستے کی لکیر کھینچ دیتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی لہروں پر جھلملاتا ہوا راستہ ان کے سامنے پھیل جاتا جو پانی کے اختتام پر اچانک رک جاتا۔ یہ اس تنہا ستارے کی روشنی کو مدھم کر دیتا، اس کی موتی سی نیلی اطلسی کٹھالی میں جو تمام اطراف کو گھیرے ہوتی، وہ ستارہ ہزاروں ستاروں کی جھلملاہٹ میں پگھل جاتا۔ حسن پھر جیسے مسحور ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا، وہ کچھ نہ بولتا، اس کی خاموشی ہر کسی کے گرد خوش گوار گرمی اور حرارت پھیلا دیتی۔ رشتے شروع ہوتے جو ہمدرد تھے، مشتعل نہ تھے۔ کبھی

جب وہاں بہت سی چیزوں سے آگاہ نہ تھے جنہیں وہ اب جانتے تھے، وہ اس راستے پر برسوں چلے تھے۔ (اور اب؟)

نہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں دیر ہو چکی تھی۔ یہ بہار کا ایک خوب صورت انجام ہوتا، جس کا حتیٰ کہ ایک دن بھی انہیں لمبے عرصے تک گرم یا پُرحدت رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔ چاہے بارش ہوتی یا نہیں۔ لیکن یہ سب بالکل واضح تھا۔ ابھی مگر بارش نہ ہو گی۔ ابھی ان ساحلوں پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے گہرے بادل دکھائی نہ دیں گے۔

بہت سے ستارے چمکنے لگے تھے۔ Hyades، اٹلس کی سات بیٹیاں ابھی ظاہر نہ ہوئے تھے۔ Dionysus نے ابھی ابھی جنم لیا تھا۔ وہ سفید گلابی، بے حد خوب صورت بچہ تھا۔ ابھی ایک روز کا بھی نہیں۔ زیوس نے اسے ابھی ابھی دیکھ بھال کے لیے Hyades کے حوالے کیا تھا۔ اٹلس کی اس کی ابھی دیکھ بھال شروع کی تھی، یوں جیسے وہ سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہو۔

اسے محمت کو بتانا تھا کہ زیوس، Hyades کو آسمان پر ستاروں کے بیچ تحفے میں بھیجے گا جو بچے کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتی تھی۔ اسے محمت کو بتانا تھا کہ کیسے زندگی ان پر تحائف کی برسات کر دیتی...... شاید، محمت بھی جان چکا تھا...... ہر شے کی قیمت کے بارے میں...... شاید اسے بتایا گیا تھا کہ انسانوں کا ماننا تھا کہ اٹلس کی بیٹیاں وہ ستارے تھے جو بارش لاتے تھے۔ یہ کہ وہ صرف مئی کے آغاز میں آسمان پر ظاہر ہوتے اور اکتوبر کے آخر میں...... پھر اسے معلوم ہوا کہ صبح کو بارش ہوئی، یا اگر صبح کو نہیں تو شام کو اور اسی وجہ سے بہار اور خزاں کی بارشوں کو Hyades Rain کہا جاتا تھا۔ اب بچے تیزی سے بڑھتے تھے...... بہار کچھ ہی عرصہ ٹھہرتی ہے...... بچے تیزی سے سیکھ رہے تھے۔ واحد چیز جو وہ نہیں چاہتے تھے، وہ اس چیز کا استعمال تھا جو وہ سیکھ چکے تھے، ایسا ہی تھا ناں؟ اتنے سارے علم کے لیے سکڑنا، غائب ہونا، زندگی کے سامنے اپنی بے معنویت بیان کرنا بے حد مشکل تھا۔ ناانصافی! شاید یہی وجہ تھی کہ محبت نے شاعری کا، موت نے محبت کا اور فراموشی نے موت کا پیچھا کیا تھا۔ ''یہی سبب ہے کہ موسم بہار میں مرنا کسی دوسرے وقت مرنے سے زیادہ مشکل ہے!''

کیا گونے، مئی کی بارشوں ہی میں نہیں کھو گیا تھا؟ اس قدر آسانی سے؟ محمت نے اس کے بہت عرصے بعد اپنے خط میں حوصلہ کر کے لکھا تھا: کیا اس مٹی پر جو گونے کو چھپائے ہوئے ہے،

کافی بارش ہوئی؟

اسے محمت کو بتانا پڑا۔ اسے محمت کو اب یہاں بحیرۂ روم کے ساحل پر بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر بتانا پڑا۔ ہاں اب، ایک عرصے بعد، دن کو یہاں بے حد روشن سورج ہوتا اور رات ستاروں بھری، چھے بہنوں کے علاوہ اور پورا چاند جس کی روشن کرنیں، ساحل، سمندر اور لہروں کو گویا چاندی سے ڈھانپ دیتیں۔ وہ بہت سی وائن پئیں گے، صنوبر کے جنگلوں میں گھومیں گے، گرم نوکیلی چٹانوں پر سے وہ سمندر میں غوطہ لگائیں گے، ان گہرائیوں میں غیر معمولی چیزیں دیکھیں گے، وہ ایک دوسرے کو، وہ سب کچھ دکھائیں گے جو وہ خود گہرے پانی تلے دیکھ چکے تھے۔ کیوں کہ اٹلس کی بیٹیوں کی نگہبانی کے لیے Dionysus ابھی زمین پر موجود تھا۔ جہاں تک مغرب میں 25 میل دُور Tyche کی بات تھی، اس قدیم شہر میں وہ بحیرۂ روم پر ان کے ایام کی حفاظت ونگرانی کرتی...... اسے یہ سب بتانا تھا۔ انہیں زندہ رہنا تھا۔

شاید محمت بھی کچھ باتیں کہنے یا بتانے والا تھا۔ حتیٰ کہ فواد بھی، جو ٹھیک طرح سے بول نہ سکتا ہے۔ وہ سب مل کر باتیں کریں گے۔ پھر دوآن اپنے اشعار سنائے گا:

کس قدر خوب صورت ستارہ،

مگر تنہا، بے یار و مددگار۔

صرف ہماری تنہائی ہی ہماری دلکشی بڑھائے گی......

سنو، آسمان دوبارہ اتنا روشن ہو چکا تھا کہ اس کا راستہ روشن کر دیتا۔ آدھے چاند اور ہزاروں ستاروں کی روشنی میں وہ پہاڑیوں پر چڑھی۔ اب اس تنہا ستارے کو الگ ڈھونڈنا مشکل تھا۔ اس نے اٹھتی ہوئی لہروں کی جھاگ اور چٹانوں سے ٹکرا کر بکھرتے پانی کی لہروں اور گنگناہٹ کی آواز کو بھی جھجکتے ہوئے پیچھے چھوڑ دیا، جو کچھ وہ کہہ رہی تھی وہ اب ناقابل فہم ہو چکا تھا اور دوسری جانب گھر کے نیچے کھاڑی ان تمام رنگوں کو ہضم کرتے ہوئے جو اس نے دن میں وصول کیے تھے، شام کے آخری رنگوں کو بھی نگل چکی تھی...... رات کے ساتھ پانی کی لہریں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ابھریں۔

وہ اندر چلی گئی، اس نے لیمپ کی بتی اونچی کی۔ اسے تھکن اور بھوک محسوس ہوئی۔ بے حد

بھوک، بے صبری......

خدیجہ دوبارہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی آئی۔

"یہ میرا مرد ہے۔" اس نے اپنے شوہر کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ وہ مغربی ترکی میں ایجن کے قریب شہر ایدین(Aydın) کے زیبک جیسا لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کا چہرہ سرخ مٹی جیسا تھا۔ وہ سر پر پھندنے والی اُونی ٹوپی اور گردن میں ارغوانی سکارف لپیٹے ہوئے تھا۔ چوڑی سیاہ بھنویں اور بے ڈھنگے پن سے تراشی گئی مونچھیں۔ اس کی عجیب وغریب ظاہری ہیئت پر آپ اندر ہی اندر ہنسنے لگتے اور اسی وقت آپ کے لیے چوکس رہنا بھی ضروری تھا۔ وہ کچھ کچھ میپل کے ان بڑے بڑے درختوں کی یاد دلاتا تھا جو بہت برسوں سے زندہ تھے۔ اس کے باوجود قادر کوئی بڑا سا طویل قامت شخص تھا نہ ہی وہ وہاں برسوں سے موجود تھا۔ اس کی جانب سے اپنے لباس میں ایک خاص شان وشوکت دکھانے کی کوشش کے باوجود، وہ ایک کوتاہ قامت گٹھی ہوئی جسامت والا قدرے موٹا آدمی تھا۔

جہاں تک اس کی عمر کا تعلق تھا، وہ 35 سال سے زیادہ کا نہیں تھا۔ (میں اسے دیکھتی ہوں، اب اس لمحے)۔

وہ نوین سے پوچھتا ہے کہ آیا وہ رات کو اکیلے ہونے کی وجہ سے خوف زدہ ہوگی اور وہ بار باراس طرح دہراتا ہے کہ یہاں ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ کو ڈرنا ہی چاہیے۔ آپ کو خوف زدہ ہونا اور اس کے پیچھے پناہ لینی چاہیے اور آپ کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ قادر ساری رات ان علاقوں میں گشت کرتا ہے۔ وہ سوتا بھی نہیں ہے۔ کوئی چیخے یا حتیٰ کھانسے بھی تو وہ بھاگتا ہوا مدد کے لیے آجائے گا۔" لیکن اگر آپ پھر بھی خوف زدہ ہیں تو خدیجہ، عثمان کو لاکر آپ کے پاس ٹھہر سکتی ہے۔"

قادر اس پر اصرار کرتا رہا۔ یوں جیسے کسی غیر واضح چیزوں کو پرے ہٹانے کی خواہش کرتے ہوئے جو اسے ہر طرف سے گھیرنے والی تھیں، نوین نے کہا: "نہیں، نہیں۔" اپنا سر ہلاتے ہوئے، "میں اس کی عادی ہوں۔ میں بالکل نہیں ڈروں گی۔"

خدیجہ اس مرتبہ ایک چھوٹے سے پیالے میں دہی لائی تھی۔ بتایا گیا کہ یہ قادر کے "خوش آمدید" کہنے کی نشانی تھی۔ نوین دوبارہ ان کا شکریہ ادا کرنے اور اس آزادی کے درمیان لٹکی رہی جو

اس کا خواب تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد چلے جائیں لیکن وہ ان سے اسے اس کے حال پر چھوڑنے، اکیلے چھوڑ دینے کا نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ وہاں تھے، اپنی بناوٹی مسکراہٹیں لیے۔ دوبارہ وہی کچھ: میرے لیے خود کو تکلیف نہ دیں۔ حقیقت جو وہ کہنا چاہتی تھی، وہ مختلف تھا: میں یہاں اپنی پہلی شب بالکل اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔ وہ جنہیں آنا ہے، میرے اندر اس طرح نشوونما پا رہے یا پروان چڑھ رہے ہیں کہ میں خود اپنے اندر اس زرخیز احساس کو پاک صاف کرنا اور خالص بنانا چاہتی ہوں، ان کے آنے سے بھی پہلے ان بہت سوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میرے اپنے خواب ہیں، میری اپنی تمنائیں۔

کاؤنٹر پر دہی کا چھوٹا سا پیالہ پڑا تھا۔ خدیجہ جو اپنے بچوں کے ساتھ راتیں گزار گزار کر بیزار ہو چکی تھی، بری طرح چاہتی تھی کہ وہ اپنی ہمسائی کے ساتھ رہے۔ وہ یہ تاریک گھنٹے کسی ایسے کے ساتھ بانٹنا چاہتی تھی جسے وہ اپنے بارے میں بتا سکتی۔ قادر نے خود اپنے آپ کو محافظ کا کردار دے دیا تھا۔ دوسری صورت میں اس کی سیٹی، رائفل، سکارف، ٹوپی اور کتا کس کام کے تھے؟ حتیٰ کہ پہلے قدم پر ہی جیسے ہی آس پاس لوگ دکھائی دیئے، منافقت شروع ہو گئی: کوئی بھی خود کو اس سے بچا نہ سکا۔ کوئی بھی خود اپنے ماضی کا قیدی ہوتے ہوئے فرار حاصل نہ کر پایا۔ جیسا کہ خوابوں کے لیے......

وہ اس سے خاص طور پر ڈر گئی۔ وہ جلدی سے اٹھی، دہی کا پیالہ خالی کر کے دھویا اور اسے خدیجہ کو تھما دیا۔ ''بہت شکریہ۔ اب مجھے فوراً ہی کچھ لکھنا ہے۔ میں لکھوں گی اور پھر آرام کروں گی۔ میں تھک چکی ہوں۔''

اس کی ہتھیلیوں میں ہلکا سا پسینہ آ رہا تھا، اس کا چہرہ سرخ تھا۔

خدیجہ اور قادر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں ساری رات جاگتا رہوں گا۔ آپ میری سیٹی کی آواز سنیں گی۔'' قادر نے کہا۔

''میں صبح سویرے ہی ٹیرس اور پھر کپڑے دھولوں گی۔ آپ سو جائیے، خوش رہیے۔'' خدیجہ بولی۔

سو انہیں اس کی بات بری نہیں لگی تھی؟

صبح سویرے...... کھاڑی کے قریب جنگل کے درختوں میں اور باغ میں لگے ببول کے

درخت پر بھی بلبلیں چہچہانے لگیں۔ وہ بلبلوں کے گیت سنتے ہوئے جاگے گی۔ سورج کی کرنیں شبنم کے قطروں پر پڑنے سے پہلے وہ کافی پئے گی اور نیچے سمندر تک جائے گی۔ وہ شاید اس لمبے سے ساحل پر سیر بھی کرے گی۔ تبھی صنوبر کے جنگل کے اوپر سے سورج طلوع ہونے لگے گا۔ وہ لہروں کو جھلسائے گا۔ اخروٹ کے خشک چھلکے کے سے رنگ کا ساحل ہلکا نارنجی ہو جائے گا، جس میں زرد سنہری رنگ غالب ہوگا۔ جب سورج کی کرنوں میں چمکتے ریت کے ذرات ساحلوں سے ساری کہر کو جذب کرلیں گے، وہ ساحل سے گزرے گی اور گھر واپس آجائے گی۔ اب اسے جلدی کرنی ہوگی۔ وہ مزدوروں کے کام شروع کرنے اور ہمسایہ گھر میں بچوں کے جاگنے سے پہلے باغ میں شاور لے گی۔ ابھی واٹر پمپ نے کام شروع نہیں کیا ہوگا۔ وہ مین روڈ تک جائے گی اور پبلک منی بس کا انتظار کرے گی۔ وہ شہر جائے گی اور ضرورت کی چیزیں خریدے گی۔ سگریٹ، ووڈ کا، جھینگے...... اگر وہاں ہوں تو...... لیموں اور خاص طور پر ٹانک واٹر کی کچھ بوتلیں، ٹانک واٹر بالکل مت بھولنا!

جب وہ واپس آتی ہے تو ہر شے اپنی جگہ پر ہوگی۔ دن کے آغاز پر شروع ہونے والی افراتفری ختم ہو جائے گی۔ ٹرک، مزدور، مشینیں، ریت سے اٹھتی ہوئی کہر اور شمال مشرق کی پہاڑیوں کے قریب کیلے کے جھنڈ، سورج، کھاڑی کے اوپر پانی کے بالکل قریب پھڑ پھڑاتے ہوئے سرمئی پروں والے پرندے، وہ جھلملاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہریں، وہ سب کچھ، ہر کوئی اپنی اپنی مناسب جگہ پر ہوگا۔ پانی کے پمپ کی ابتدائی گڑگڑاہٹ ختم ہو چکی ہوگی۔ وہ قدرت کے اس بے مثل نظارے میں، خاموشی اور فطرت کا تقریباً حصہ بنتے ہوئے کھانے کی تیاری شروع کرے گی۔ پہلا کھانا پورا امکان ہے کہ فواد کے لیے ہوگا۔ شاید حسن کے لیے بھی۔ وہ ایک ڈرنک لے گی، موسیقی سے لطف اندوز ہوگی، کچھ دیر کتاب پڑھے گی، سمندر کی لہروں کا شور سنے گی اور انتظار کرے گی۔ وہ شاید اس انتظار کے بارے میں بتائے گی۔ کون جانتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ سے بہت سی باتیں کرسکتی تھی۔ کہنے کو بہت سی باتیں ہوسکتی تھیں اور بہت سی نہیں بھی۔

وہ اچھے لوگ ہوں گے، Hyades کی طرح۔ اب جب کہ گارڈ کی سیٹی جو خوش باش بھی ہے اور اداسی بھری بھی...... لیکن عجیب بات ہے آپ نے دیکھا...... یقیناً بہت تسلی آمیز بھی، پہاڑوں اور چٹانوں میں گونجتی ہوئی اس تک پہنچ رہی تھی۔ خصوصا رات کے اس خاموش پہر میں، وہ ان سب سے

کس قدر محبت کرتی تھی! وہ زمین کے ستارے تھے۔ان پانچوں میں سے ہر ایک اس کے لیے زمین پر اترا ستارہ تھا اور جزیرہ نما کے آخر میں، گو نے ان پر مسکرا رہا تھا۔کیسا خوب صورت ستارہ...... یہ ستارہ دوسروں کو بھی پکارتا ہے۔وہ حسن،فواد،ممت، دوآن اور میرچ کو پکارتا ہے۔وہ انہیں کسی ایسی شے کو گلے لگانے کے لیے پکارتا ہے جو اپنے معنی اور موجودگی کھو چکی ہے۔وہ انہیں خالص پن، پاکیزگی،صراحت،حسن اور محبت کی طرف بلاتا ہے۔

وہ آئیں گے۔وہ پورا راستہ، پوری طرح،اپنے دل کی گہرائیوں تک جوش سے بھرے ہوں گے۔وہ سب کچھ جو ٹھنڈا اور سرد ہو کر مدہم پڑنے لگا ہے، دوبارہ زندگی جیے گا، پھر سے فروزاں ہوگا۔

سنو،تمنا: رات جو ہر شے کو سادہ اور آسان بنا دیتی ہے، یہ اس میں اپنے پر پھڑپھڑاتی ہے۔
سنو، بہار انجام کو پہنچی،جنوب،بحیرۂ روم۔

(میں نے اسے آخری بار اس طرح دیکھا: مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں، ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے، اس نے یہ تین چیزیں سفید کاغذ پر لکھی تھیں: سنو بہار کا اختتام ہوا، جنوب،بحیرۂ روم۔

جیسے ہی میری نگاہیں ان پر پڑیں، میں نوین نامی عورت کو بالکل گم کر دیا۔لمبے عرصے تک میں اس امید میں منتظر رہی کہ وہ اچانک ٹیرس پر یا فوارے کے سامنے، ریت پر، چٹان کے اوپر، یا جنگل میں، سڑک کے موڑ پر، اچانک میرے سامنے آجائے گی۔میں یقین نہیں کر سکتی کہ میں اسے دوبارہ دیکھ پاؤں گی۔وہ دوسروں کو لے کر زبردستی میری چھٹیوں میں داخل ہو گئی تھی، مجھے اپنا اور دوسروں کا عادی بنا دیا اور پھر مٹی کے تیل کے لیمپ سے نیم روشن کمرے میں غائب ہوگئی۔بالکل تب جب میں اس کی پوری آواز اس کے اندر کے لہجوں کے ساتھ سننا شروع ہوئی تھی،صرف ہیولا نہیں بلکہ پورا جسم۔سوئمنگ پول میں تیرتے ہوئے جب میں نے اس کی آواز کا پہلا لہجہ سنا، میں حیرت زدہ رہ گئی تھی۔بعد میں مَیں نے وقتاً فوقتاً وہ آواز زیادہ واضح طور پر سنی۔پھر مختلف گفتگوئیں ہونے لگیں۔کیا بس یہی ہے؟ میں نے فواد کی ڈینٹسٹ چیئر کے بارے میں بھی جانا۔ایک مرتبہ حتیٰ کہ میں یہ بھی چاہتی تھی کہ فواد اُن ڈینٹسٹ چیئرز کے بارے میں وضاحت کرے کہ وہ کیسے کام کرتی تھیں۔

میں نے اس لیے ہمت مجتمع کی۔ لیکن وہ ہمیشہ مسکرا کر چپ ہو رہا۔ وہ درست تھا۔ ان سب کی طرح کیا میں نے بھی اس قسم کی معمول کی چیزیں پیچھے نہیں چھوڑ دی تھیں؟ صرف ایک پوز، ایک نگاہ، ایک رنگ، وہ لمحہ جب سورج پانیوں میں غوطہ لگاتا ہے، اینٹ کا کوئی گرد آلود ٹکڑا، کوئی سوراخ دار پتھر، حتیٰ کہ خشک جڑی بوٹی، جرینیم جن کی کونپلیں پھوٹنے والی تھیں، رھوڈ زفلا ور یا بوگن ویلیا کی شاخیں، کنیر، پھر اذان کی آواز، چاند کا طلوع ہونا، پھر صبح کو اس کا ماند پڑنا اور زرد ہو جانا، جڑی بوٹیاں، ان پر پڑی شبنم، رات کے پرندے...... پھر کبھی جل دیویوں کی سرگوشیوں کی یادگار آوازیں، موسیقی کی آواز، حتیٰ کہ ایک گیت جو "Now you're far away" سے شروع ہوتا تھا...... جس کے بعد سامنے آتے اور غائب ہوتے چہرے...... وہ ایک شناسائی تھی جو مسلسل پروان چڑھ رہی تھی...... پھر نیم روشنی میں لکھے گئے تین فقروں کے ساتھ اچانک سب کچھ ختم ہو گیا، زرد مدھم روشنی میں...... وہ تمام خیالات، آوازیں، خوشبوئیں دوبارہ کسی نامعلوم میں ضم ہو گئے...... یوں جیسے ان ساحلوں پر میری آنکھوں نے کبھی کچھ نہ دیکھا تھا......

بدقسمتی سے میں اپنی ان لمبی لمبی سیروں سے اب لطف نہیں اٹھا سکتی۔ اپنی چھٹیوں کے عین درمیان تنہائی کے ایک غیر متوقع احساس نے میری توجہ کھینچ لی۔ بعض اوقات مجھے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ موٹل کے قریب کوئی سنسان گھر ہے بھی یا نہیں اور مجھے اپنی نوٹ بک میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس کی میں چھان پھٹک کر لوں۔ ویٹروں نے یہ شبہ کرتے ہوئے کہ میں بور ہو گئی تھی، ضرورت سے زیادہ میرے اردگرد منڈلانا شروع کر دیا۔ اس قدر کہ مجھے یہ شک ہونے لگا کہ وہ لنچ اور ڈنر کے لیے مچھیرے کی لائی ساری مچھلی مجھے ہی کھلانا چاہتے تھے، میرے علاوہ وہاں اور کوئی کھانے والا تھا بھی نہیں۔

جب وہ عورت جس نے خدیجہ کو اپنا نام نوین بتایا تھا، میری ذات سے ظاہر ہوئی اور پھر مجھے چھوڑ گئی، اپنی آرزو یا تمنا کے انتہائی نکتے پر، میں نے پوچھا...... میں کہہ نہیں سکتی کہ اپنی مرضی سے یا نہیں...... اس خلا میں، جس میں مَیں نے خود کو پایا، وقت میں، مَیں کہاں ہوں؟ مَیں کہاں ہوں؟

ہوا کہر سے بوجھل تھی۔ یوسف نے پھولوں کو پانی نہیں دیا۔ اس کی بجائے وہ ٹائپ رائٹر کے سامنے جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ ضرورت سے زیادہ چوکس ویٹرز سے فرار حاصل کرنے کے لیے میں

نے یوسف کا پیچھا کیا۔ آخر کار وہ ایک حقیقت تھا: یوسف مجھے بتاؤ کہ اس ٹائپ کی پچھلی مالکہ جب یہاں اکیلی ٹھہری ہوئی تھی تو وہ کیا لکھتی تھی؟ کیا وہ کچھ لکھتی بھی تھی؟ اس کے بعد، میرا مطلب ہے کہ اس کے غائب ہو جانے کے بعد کیا کاغذ پر لکھی کوئی تحریریں ملی تھیں؟ تم نے مجھ ایسا کچھ بتایا تھا۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا، تم نے مجھے ایسا بتایا تھا، ہے ناں؟

کیا مجھے یوسف سے ایسی باتیں پوچھنی چاہئیں؟

تبھی میں اس سے یہ پوچھتی ہوں لیکن یوسف میری جانب اپنی نگاہوں میں خالی خالی اور مبہم سا تاثر لیے دیکھتا ہے۔

میں سمجھ گئی: وہ تین مختصر جملے، جو آخری الفاظ لگتے تھے، دراصل آغاز تھے۔

خواب جیسے اُن ساحلوں پر جو ماضی کو بھی ساتھ کھینچے لیے پھرتے ہیں، میرے پاس اس عورت کی داخلی آواز کو تلاش کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے ایسا کچھ نہیں ہے جو میں کرسکوں۔ مجھے صرف اس سب پر ہی گزارا کرنا ہے جو میرے اردگرد ٹھوس وجود رکھتا ہے...... جنگلات کی سڑکیں، ساحل، سمندر، چٹانیں، سورج کا طلوع ہونا، غروبِ آفتاب، پورا چاند، رات کو وقتاً فوقتاً ساحل سے اٹھنے والی شہنائی کی کیف آور آواز...... اور کاغذات جن پر میرے خیال میں کچھ لکھا گیا تھا لیکن پھر پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ دوسرے بھی آنے والے تھے...... پھر ٹھیک ہے، فرض کرو کہ وہ آ گئے۔ پھر کیا ہوسکتا تھا؟ میں نے چھے Hyades ستاروں کے جھرمٹ کو کہاں ڈھونڈا اور پھر کہاں کھو دیا؟ اچھا ان کی آوازیں کہاں ہیں؟

بس! ان اکیلے اداس لمحوں میں مَیں یہی باتیں اکٹھی کر پائی تھی جب میں کسی سے کچھ نہیں پوچھ سکی تھی، اس خوف میں تھی کہ اگر میں نے پوچھا تو سحر ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اب میں ایک بے حد سرد سے کمرے میں ہوں۔ باہر برف کے بڑے بڑے گالے ہیں۔ میری کھڑکیوں پر برف جم چکی ہے...... سورج کی روشنی یوں چمکی جیسے برف آلود کھڑکیوں پر کوئی بڑا سا پتھر دے مارا گیا تھا۔ میرے اردگرد ہر طرف ہزاروں منشور (Prism) روشنی بکھیرنے لگے...)

❄❄❄
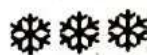
III

کس قدر تنہا، بے یارومددگار ستارہ
صرف میری تنہائی
میری دلکشی بڑھاتی ہے۔

وہ سب چلے گئے۔ وہ گھر مجھ پر چھوڑ گئے۔ میں وہاں رکی رہی، بہار انجام کو پہنچی۔
ساحل پر قدموں کے نشانات، لکیریں جو ہم نے کھینچیں، نقش ونگار، نام جو ہم نے لکھے......
زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ لہریں آگے بڑھ کر ساحل پر ہمارے قدموں کے نشانات مٹا دیں گی۔ حیران کن بات ہے کہ انہوں نے اسے رات کو ہی نہیں مٹا دیا۔

اس صبح میں نے آخری شخص کو الوداع کہا، ممت۔ اس کے بعد میں ٹیرس پر جا بیٹھی اور دیر تک سامنے کھاڑی کو دیکھتی رہی، کیسے سمندر کی لہریں چٹانوں سے دست بردار ہو کر پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ اس وقت کے بعد میں نے اپنے اندر ایک نئی اور شدید تمنا محسوس کی۔ میں انگاروں کے راکھ بننے سے قبل اپنی کہانی کہنا چاہتی تھی، حدت سرد پڑ گئی، وقت مجھے دھوکا دیتا ہے، میرا ذہن خود کو اپنے حوالے کر دیتا ہے، جادوئی دن، گھنٹے، بہار کے اختتام کے لمحے سمندر میں ضم ہوتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں، لہریں، مسلسل بارشوں کے پردے ہر چیز کو ڈھانپ لیتے ہیں؛ ہر طرف کیچڑ اور گلے

سڑے پتوں کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ (میں رک گئی: ہماری کہانی کہنا اس قدر مشکل کیوں ہوگا؟ یہی تمنا، سب کے یہاں اس جگہ جمع ہونے کی میری خواہش جتنی شدید ہے، حسن و محبت سے بھری۔ یہ اس قدر طاقت ور تمنا ہے۔ میں وہ ہوں جو برسوں تک دوسروں کی لکھی اور کہی باتوں کا ترجمہ کرتی رہی ہوں۔ اب پہلی مرتبہ مجھے جس چیز کی تمنا ہے وہ میرے اپنے جملے ہیں۔ مجھے وہ جملے ترتیب دینے ہوں گے۔ مجھے بتانا ہوگا۔ مجھے پیچھے کوئی نہ کوئی نشان چھوڑنا ہوگا)۔

میرے ذہن میں ساحل کو جا کر قریب سے دیکھنے کا خیال اس وقت تک نہ آیا جب تک کہ صبح کو میں نے محمت کو الوداع نہ کہہ دیا اور دوپہر کے گزرنے تک اس میز پر نہ آ بیٹھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ سمندر کی لہریں ریت تک آ چکی ہوں گی اور ساحل پر لکھا سب کچھ مٹا دیا ہوگا۔ لیکن میں کچھ دیر قبل پہلے جملے پر اٹک گئی تھی، میں سمندر کی طرف چلی گئی تھی۔ میں کھاڑی سے آگے بڑھی اور سنسان ساحل کو دیکھنے چلی گئی۔ مین روڈ تک لہروں نے ساحل کو نہیں ڈھانپا تھا، جہاں کیر کے درختوں کے جھنڈ۔ تھے، انہوں نے ابھی ہمارے قدموں کے نشانات نہیں مٹائے تھے، لکیریں جو ہم نے کھینچی تھیں، نقش و نگار، نام جو ہم نے گزشتہ روز رات ڈھلے وہاں لکھے تھے۔

ابھی ہم زندہ ہیں۔

دوآن نے لکھا: ہم دیوتا ہیں۔

حسن نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی: اگر دیوتاؤں کو معلوم نہ تھا کہ دیوتا کیسے بنا تھا اور وہ انسان بھی نہ بن سکتے تھے اور اگر وہ صدیاں جب انسان صرف انسان کے ساتھ وجود رکھتا تھا، تو پھر یہ ہم انسانوں کے لیے ہے کہ ہم انسانوں کو غیر اہم سمجھیں۔

پھر اس نے کہا تھا: ہم غیر اہم نہیں ہیں۔

بعد میں اس نے لکھا تھا: ہم، ہم ہی ہیں۔

کیروں کے کنارے میں نے اسے خاموشی سے گلے لگا لیا تھا۔ میں نے اسے اس خوشی بھری چیخ کے ساتھ گلے لگایا تھا جو وہ پکارنا چاہتا تھا مگر نہ پکار پایا۔ پھر دوبارہ پچھلی رات، آپ نے دیکھا، اس کے جانے سے پہلے اس نے نہیں پوچھا کہ میں اس کے ساتھ واپس جانا چاہتی تھی یا نہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں ان کے جانے کے بعد بھی یہاں ٹھہروں گی اور اپنے چند آخری دن اکیلے اور بہت سے

دوسروں کے ساتھ، دونوں طرح گزاروں گی۔ وہ پوری طرح چمک رہا تھا۔ ہم ایک بالکل نئے طریقے سے محبت کرنا سیکھ رہے تھے۔ ہمارے بدن ایک دوسرے کو نہیں چھو رہے تھے لیکن اسی دوران ہم اس طرح ایک دوسرے کے اندر ضم تھے جیسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت سے بھی زیادہ جب ہم گہرے پانیوں میں اترتے ہوئے ایک دوسرے کو تھامے ہوئے تھے، ہم ایک دوسرے کے اندر اترے ہوئے تھے۔ اسی طرح باقی سب بھی۔ دوآن، ممت کو اس طرح سہلا رہا تھا جیسے اشعار سناتے ہوئے اس کی آواز آپ کو سہلاتی تھی۔ دوآن...... زیادہ نہیں، کم نہیں...... میرچ کی خاموشی سے بھی اسی قدر محبت کرتا تھا، جس قدر اس کے خوب صورت وجود سے اور جس طرح وہ اسے خود سے دُور رکھتی تھی۔ میرچ اپنے سامنے کے دانت کو بھول چکی تھی۔ وہ آزاد ہو چکی تھی۔ ممت ہر شے کے بارے میں جذباتی تھا، چاہے وہ سانس لیتی جان دار تھی یا نہیں۔ وہ حسن جیسے شخص کے ساتھ گیا تھا جو برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں تک روشنی لے جانے کے قابل تھا۔ ہماری نئی محبتیں۔ میرا دل ان سب سے بغل گیر ہوتا ہے۔ میں ہر لمحے چلا کر بتانا چاہتی ہوں، ''ہم نے کر دکھایا! ہم سب، اٹلس کے چھے بچے، سڑک کے عین درمیان، اس لمحاتی توقف پر، بہار کے اختتام میں، آپ نے دیکھا، ہم نے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے یہ کر دکھایا، وہ بانہیں، وہ دل، ایک دوسرے کے گرد اس طرح الجھے ہوئے اور پیوست کہ یہ بتانا ناممکن تھا کہ کون سی بانہیں کس کی تھیں۔''

میں یہ کسی طرح بھی بتانے کے قابل نہ ہوں گی کہ گونے کا باپ کون تھا۔ اس نے گیلی دلدلی مٹی سے پرورش پائی تھی یا روشنی سے؟ وہ کھو جانے والا بچہ، میرا بیٹا، ہمارا بیٹا، ہم سب کا بیٹا، ہمیں ان چھٹیوں میں ہمیشہ سوچنے پر مجبور کرتا تھا اور شیشے سے بنی جادوئی پرکار کی طرح ہم میں سے ہر کسی کے اندر گھومتا رہتا تھا جسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی اور اس کا نام غم ہے۔ اٹلس کی چھے بیٹیاں اعلان کر چکی ہیں کہ بچوں کے چہروں پر غم دکھائی نہ دینا چاہیے اور وہ سب جو گونے کے لیے موزوں تھا، اس کی ہمارے اندر وہ جادوئی شیشے کی گردش، بہت فاصلے سے اس کی آنسوؤں بھری ہنسی۔ یہ سب کسی دوسرے بچے میں نہیں پائے جانے چاہئیں اور بچوں کو رات کو لہروں کی تاریکی میں غائب نہیں ہو جانا چاہیے...... یہ سب چٹانوں پر اٹلس کی چھے بیٹیوں کی آوازوں میں گونجتا ہو۔

اوہ سب جو ہمیں پکار پکار کر بتاتا ہے کہ ہم فانی ہیں، وہ سب، گونے ہے......

دو آن اور میرچ کل گھر واپس چلے گئے تھے۔ فواد کل دو پہر کو گیا تھا۔ حسن، گزشتہ شب میں حسن کے ساتھ فوارے تک گئی تھی۔ جہاں راستہ، مین روڈ سے ملتا تھا وہاں میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ جنگل کے اوپر سے طلوع ہوتا چاند ہمارے عین سر پر تھا اور کچھ دیر پہلے اس کا رنگ پہلے زرد سے سرخ نارنجی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد موتیوں کی سی نیلاہٹ جو پانی کی آنکھ میں جھلملا گئی۔ اس کی کرنوں نے فوارے کو نقرئی چاندنی سے ڈھانپ دیا تھا، جڑی بوٹیوں کو بھی حسن سے نواز دیا تھا۔ یہ چاندنی صبح تک باقی رہے گی اور مشرقی افق پر سرخی کے نمودار ہونے پر ہی مدھم پڑے گی۔ آسمان پر ہمارے نزدیک ترین ستارہ ایک بے حد اداس صبح کا حصہ بن جائے گا۔

ہر چیز کی طرح وہ ستارہ بھی خود اپنا سچ تھا۔ ہر شے کا سچ ہر دوسری شے کے ساتھ مکمل تھا۔

حسن ٹھیک کہتا تھا۔ اس نے ساحل پر جو کچھ لکھا وہ سچ تھا۔ ہم خود تھے۔ ہم ہر شے کے مالک تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم خود اپنے آپ کے مالک نہ تھے۔ ہر شے ہماری تھی اور کچھ بھی ہمارا نہ تھا۔ ہم شروع سے آخر، آغاز سے انجام تک مربوط یا جڑے ہوئے تھے۔ مربوط ہوتے ہوئے ہمارا تسلسل حقیقی تھا۔ غیر مربوط ہوتے ہوئے، عدم تسلسل حقیقی تھا۔ ہم کسی کے بھی مدعی نہ تھے۔ ہم خود اپنے آپ کے مدعی تھے اور وہ جو خود اپنے مدعی تھے ان کے پاس کرنے کو بہت کام تھا اور یہ بڑے ذمے داری تھی۔ یہ تھکا دیتی، یہ تکلیف دیتی۔ ہم، ہم خود تھے۔ ہم سب سے بڑھ کر خود کو تکلیف دیتے اور ہم خود کو بری طرح تکلیف پہنچاتے اور ہم ان کو تکلیف پہنچانے کے قابل نہ تھے جو سب سے بڑھ کر خود کو تکلیف پہنچاتے۔ اگر ہم چاہتے بھی تو ہم ایسا نہ کر سکتے تھے اور کچھ بھی، کوئی بھی جو خود تکلیف نہیں پہنچاتا، ہمیں تکلیف نہ پہنچا سکتا تھا۔ دنیا کی عائلہ (عائلاؤں) کی شدت پسندی وہاں نہ تھی۔ دنیا کے ان تمام صفوت کی Passivity جو اس شدت پسندی کو خوراک فراہم کرتے تھے، وہاں نہ تھی۔ کیا یہ آزادی تھی؟ ہاں، ایسا ہی تھا۔ کیا یہ زمانہ حال کی شان و شوکت، انتہائی فوری پیش گوئی تھی، یہ تھی، بالکل تھی...... اسے پوری طرح خود اعتماد ہونا کہا جاتا تھا اور نہیں بھی۔ یہ آپ کے قید خانے کو قید کرنے کو تھا۔ ہم اس پر حیرت زدہ ہونے کو تھے کہ لوگ اس قدر سادہ معاملے کو کیوں کر نہیں سمجھ پاتے۔ ہم خود اپنے آپ پر حیرت زدہ ہو سکتے تھے۔ یہ حیران کرنے والی بات ہے کہ وہ جنہوں نے وہ تمام بینک تشکیل دیئے، وہ سٹاک ایکسچینج، مارکیٹس اور فرمیں، وہ سب جو سرمائے، ذاتی مفاد، حرص والالچ کو ہم پر

حکمرانی کرنے والے جنرل منیجر کے طور پر تعینات کرتے ہیں، وہ جو ہماری ہر شے کنٹرول کرتے ہیں، نہیں سمجھ پاتے کہ ان کی کوئی ضرورت نہیں، کسی صدور، وزرائے اعظم، بینک ٹرسٹی، مسابقت کے لیے ججوں، امن اور جنگ کی کمیٹیوں کے اراکین، جیوری، ججوں اور پیٹشنوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ حیران کن ہے کہ ہم خود اپنے آپ پر حیرت زدہ ہیں۔ ہم، اٹلس کی چھے بیٹیاں، چھے مختلف شہروں، پھر چھے مختلف ملکوں، پھر چھے مختلف براعظموں میں پھیل جائیں گی۔ ہم میں سے ہر ایک کے سیل کے اوپر بحیرۂ روم کا سورج پکارے گا، صرف اس سورج کی کرنیں، لاکھوں کرنیں، اس آسمان، اس سمندر، ساحلوں کی اس ریت، چٹانوں، جنگلوں کی ہر جانب اترتی ہوئی، ان میں سے ہر کوئی مختلف رنگ، مختلف شیڈ کی چادر اوڑھے ہوئے تھی، وہ کرنیں کبھی بھی لن ترانی کیے بغیر پکاریں گی، ہم کامیاب ہو گئے!

پھر ''کامیابی'' کا جو مطلب ہے وہ بھلا دیا جائے گا، تاریخ سے مٹا دیا جائے گا، لغت میں دھندلا جائے گا۔

حسن فوارے کے سامنے کار سے نکلا۔ اس نے کچھ کہے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔ تب بھی اس کی آنکھیں اس قدر روشن تھیں کہ وہ چاندنی رات سے زیادہ چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں جنوبی سورج کی روشنی منعکس کر رہی تھیں۔ حسن کبھی بھی دل کو اس قدر گرمانے والا اس قدر روشن نہ رہا تھا، سوائے اس حسن کے جس کی پہلی نظر کی محبت میں مَیں 18 سال عمر میں ہی گرفتار ہو گئی تھی...... میں اس حسن کی آواز سنتی ہوں جو ٹیرس پر رک گیا تھا، میں بھی حسن بننا چاہتا ہوں نوین!...... ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا، یہ نیا حسن اور میں۔ وہاں کوئی ذلت، ترحم، منافقت، تھکن، الزام، جرم یا قصور واری کا احساس کچھ بھی نہ تھا۔ وہاں شدت پسندی کے کوئی ایسے خونیں بھوت نہ تھے جو ہمیں گھیر لیتے۔ وہ ایک وصل تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن میں کم نہیں ہو گئی تھی، معدوم نہیں ہوئی تھی۔ مجھ میں سے کچھ بھی کم نہ ہوا تھا۔ میں پوری کی پوری، مکمل رہی۔ حسن بھی مکمل رہا۔ اس میں پچھلے برسوں کے دوران کوئی کسی نااہلی یا کمی کی اداسی نہ رہی تھی جس کے باعث وہ خود میں سکڑ سمٹ جاتا۔ اس کاملیت پر وہ جو خوشی و مسرت محسوس کرتا تھا، مبالغہ آمیز نہ تھی۔ یہ ہوا کیسے؟ میں اس بارے میں بعد میں بتاؤں گی۔ یہاں ان آخری خاموش دنوں میں جو اُن کے جانے کے بعد میرے پاس باقی رہ گئے تھے

میں کسی دن کا ایک سیکنڈ، ایک لمحہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتی۔ میں کسی سانس، ہنسی، لوک گیت، گیت جو ہم اکثر گایا کرتے تھے، چھوڑنا نہیں چاہتی، ترک نہیں کرنا چاہتی اور سب سے بڑھ کر یہ نہیں بھولنا یا نظر انداز کرنا چاہتی: کیسے وہ گیت جو آپ کو بدترین اور گھٹیا ترین عمومی حساسیت تک کھینچ لاتا، ایسے گیت میں تبدیل ہوسکتا ہے جو خالص ترین حساسیت سے، گہرے ترین مطالب سے بھرا ہو، ایک بھی لفظ ایک بھی سُر تبدیل کیے بغیر: ''محبت کے باغات کے پھول، تمام کے تمام مرجھا چکے ہیں۔''

وہ پژمردہ نہیں ہوسکا...... کیوں کہ ہم زندہ تھے۔ میں اس بارے میں بتاؤں گی۔

میں ڈگمگائی اور دوبارہ رک گئی۔ جیسے ہی دوسرے سب مجھ سے دُور چلے گئے، میں نے چٹانوں کی درزوں میں جمی کائی کی طرح خود کو گیلا اور برہنہ محسوس کیا جسے سمندر کی بلند لہریں اچانک چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی ہوں۔ جس دوران میری اندرونی آواز گونجتی ہے، یہ کہتے ہوئے کہ ''ہم زندہ تھے''، اس میں ہلکا سا شبہ ہے، یوں جیسے کوئی بے یقینی، حتیٰ کہ ایک ''میں'' جو میرے شور مچانے پر دبی دبی سی ہنسی ہنستی ہے...... یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ کیا ہم زندہ نہ تھے؟ چاہے میں لاکھوں مرتبہ اپنے لیے چیخوں چلاؤں کہ ہمارے دھوپ بھرے دن، ہماری پورے چاند کی راتیں، جل پریوں کی آوازیں، ہمارے اکثر گائے گئے گیت، ہماری محبت جو بالکل نئے طور طریقوں سے جانی جاتی ہے، دوستیاں، ابھی دریافت کیے گئے گرم جوش جذبات، مکمل مسرتیں، وہ سب خواب تھے...... چاہے میں یہ کروں بھی، میں، خود کو یا ان ساحلوں، پانیوں سفید دیواروں پر رقص کرتی کرنوں کو یقین نہیں دلا سکتی کہ جو جیا گیا وہ ایک خواب تھا۔ اس قدر گہرے نقش کیے گئے شگاف یا نشان اور لکیریں...... کچھ دیر پہلے میں دل ہی دل میں وہی گیت گنگنا رہی تھی۔ کسی قدر کہر آلود دوپہر کو، میرے کانوں میں سمندر کی لہروں کے چھپاکوں کی آواز، جب میں ہمارے دنوں کو کشید کر رہی تھی آخر تک، میں تھوڑی دیر کو رکی اور گانے لگی، ''محبت کے باغات کے پھول سب کے سب مرجھا چکے ہیں۔'' میری نگاہوں میں اطمینان کے ابدی احساس کے آنسو...... وہی لمحہ تھا جب کسی نے کچن کے دروازے پر دستک دی...... میں نے تالا اتار کر قادر یا کسی مزدور کو ٹھیک کرنے دیا تھا، مجھے پرواہ نہ تھی یا شاید میں نے سوچا کہ ہمیں سختی سے دروازے بند کرنے کی ضرورت نہ تھی یا شاید میں نے ان باتوں کے بارے میں کچھ بھی سوچا ہی نہیں تھا...... جب ہلکی سی ہوا سے دروازہ کھلتا، بند ہوتا، کھڑکھڑاتا ہے تو میں اس بارے میں سوچتی ہوں،

جب اس کی یکساں سی آواز میری توجہ ان دنوں کی طرف سے ہٹاتی ہے جو میں نے کشید کیے ہیں۔ پھر میں دوبارہ جلد ہی اس بارے میں بھول جاتی ہوں۔

میں دروازے کے بارے میں بھول چکی تھی اور تب چونک اٹھی جب کسی نے اس پر دستک دی۔ میرے خوف نے مجھے ہنسا دیا۔ وہ خوف جلد ہی زائل ہو گیا۔ میں گئی اور اسے پورے کا پورا کھول دیا۔ یوسف۔

وہ پوچھتا ہے، ''کیا ہم باغ میں پانی کھول سکتے ہیں؟''

یہ ٹھیک ہے۔ مجھے انہیں بتا دینا چاہیے تھا۔ مجھے ابھی اندر پانی کی ضرورت نہیں۔ میں اسے بتا دیتی ہوں۔ جہاں تک ان کی بات ہے۔ جب سہ پہر شام میں ڈھلتی ہے، وہ سبزیوں کے پودوں کو پانی دیں گے، اپنے برتن بھر لیں گے۔

''بالکل، بالکل......'' میں نے یوسف سے کہا۔

وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنا سر اندر گھسا کر جھانک رہا ہے۔ اس نے ضرور مغربی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا کہ ایک بالکل اکیلی عورت گنگنا رہی اور ٹائپ کر رہی ہے...... کہہ رہی ہے ...... کچھ باتیں جو اس کے لیے نامانوس ہیں۔ وہ چلغوزے کے درخت کی شاخوں سے جھانک لیتا جو اسے بالکل چھپا نہ پاتیں۔ میں یہ اس لیے کہتی ہوں کہ جہاں سے میں سب کچھ لکھتی ہوں...... سب کچھ جو میں بتانے کے قابل پاتی ہوں، سب کچھ جو میرا یقین ہوگا کہ اگر میں نہ بتاتی تو کبھی اپنا وجود نہ رکھتا...... کاغذ یا ٹائپ رائٹر پر، میں دیکھتی ہوں کہ آسمان سے لٹکتا چلغوزے کا درخت غروبِ آفتاب کے وقت تک آہستہ آہستہ زرد ہوتا جاتا ہے۔ میں ایسے ہی دیکھتی ہوں۔ مجھے یہ فرق کرنے میں مشکل ہوتی ہے کہ وہ آسمان ہے یا سمندر، وہ جو مجھے نچلی شاخوں کے درمیان دکھائی دیتا ہے۔ یہ دن کی وہ گھڑی ہے جب سورج آسمان اور پانی دونوں کو ایک سا سنہری مائل نیلا رنگ دے دیتا ہے۔ وقت کا وہ حصہ جسے اگر آپ چھو لیں تو وہ ٹوٹ کر الگ ہو جائے گا، اگر آپ اسے تحریک دیں تو وہ فوراً ہی کسی اور شے میں بدل جائے گا......

یوسف دروازے کے سامنے ہے۔

وہ پوچھتا ہے، ''آپ کیا کر رہی ہیں؟''

مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اسے کیا بتاؤں۔ وہ انہیں جانتا تھا جو جا چکے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ چکا تھا۔ وہ اس کے قریب رہا تھا جو جانے والوں میں آخری تھا۔ وہ ہر لمحے اس کے اردگرد تھا......

''میں تمہیں کل یہ دکھاؤں گی، ٹھیک ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اس مشین پر کیسے لکھتے ہیں۔''

اس نے اپنا سر ہلایا لیکن گیا پھر بھی نہیں۔

''عثمان سو رہا ہے۔ بابا ہماری سبزیوں کو پانی لگانے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ صبح یہاں آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں رات کو آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہیے......''

میرا خیال ہے کہ میں نے یوسف سے کہا، ''اگر میں صبح سویرے ساحل پر گئی، تو میں واپسی پر تعمیراتی جگہ تمہارے بابا سے ملوں گی۔'' میں نے کچھ ایسا ہی کہا یا بناوٹی تجسس کے ساتھ، ''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا تھا شاید۔

کیوں کہ یوسف نے کہا، ''پک اپ ٹرک صبح سویرے شہر جا رہا ہے، اس لیے وہ آپ سے پوچھیں گے کہ آیا آپ کو کچھ چاہیے۔''

میرے خدایا، میں نے خود کلامی کی، اب مجھے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے۔ جب میں تیراکی نہیں کر رہی ہوتی اور کسی نئی چیز کے انتظار میں چٹانوں یا ریت پر دراز نہیں ہوتی...... نہ ختم ہونے والی بارش، خزاں کی ہوائیں، گہرے بادل؟...... یا جب انتظار کے لیے کچھ نہیں ہوتا، شمالی پہاڑوں کی چوٹیوں کی جانب دیکھتے ہوئے، میرے کان جنوب مغرب کی ہواؤں کی آوازیں سنتے ہوئے، مجھے انجامِ بہاراں کی کہانی کہنے کے قابل ہونے کی ضرورت ہے، وہ سب کچھ کرنا جو میں اسے نقصان پہنچانے کے لیے نہیں کر سکتی، اس کے ٹکڑے یہاں وہاں اس کے ریزے گراتے ہوئے، اسے زخم نہ دیتے ہوئے۔ آرزو کی تکمیل کے لیے۔ واحد چیز جس کی مجھے ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ مداخلت نہ کی جائے، کوشش ترک نہ کی جائے، میرے دنوں میں گڑبڑ نہ کی جائے، واحد چیز جس کی مجھے اس وقت ضرورت ہے وہ ایک خاص طرح کی خاموشی ہے۔ میرے خدا، میں نے خود اپنے آپ سے کہا، کیا مہربان لوگوں کی نرم خوئی، مہربانی، ان کی فکر جو غیر متوقع جگہوں پر سامنے آتی ہے، ہم پر بوجھ لادتی ہے؟ کل مجھے جس چیز کی ضرورت نہیں تھی، وہ اب ضروری ہے۔ میرے خدا تو

مجھے ان کی فکر و تشویش کی طرف سے رُخ کیوں موڑنے دے رہا ہے، اچھے لوگوں کی اچھائی کو ٹھیس پہنچاتے ہوئے؟

''دیکھو یوسف، جب تم اندر سے ٹائپنگ کی آواز آتی سنو تو دروازے پر مت آیا کرو۔''

میں ایسا کہتی ہوں۔ جب ہم باغ میں شاور لے رہے ہوتے تب بھی ہم اسے بتاتے لیکن اس کے باوجود، یوسف مختلف اونچی جگہوں سے ہمیں دیکھتا۔ وہ کہے گا کہ وہ نہیں کوئی اور دیکھ رہا تھا۔ میں نے اصرار نہیں کیا۔ ضرور میرے دماغ میں کوئی خیال ہوگا جس نے مجھے روکے رکھا۔ کچھ...... برسوں پہلے...... سیاہ آنکھوں والا لڑکا...... وہ تقریباً یوسف ہی کی عمر کا تھا۔ میں اس سے بھی اسی انداز میں بات کیا کرتی تھی: دیکھو بچے جب میں لکڑی کے گودام میں کپڑے تبدیل کر رہی ہوں تو مت آیا کرو وہاں۔ دروازے کی درز سے اندر مت جھانکا کرو، ٹھیک ہے؟ وہ کبھی جواب نہ دیتا، سیدھا میری آنکھوں میں گھورتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سیاہی ماند پڑتی نہ ہی روشن ہوتی۔ ذرا سی چمک تک نہیں۔ جب ہم اس دُور افتادہ مقام...... ہمارے جزیرہ نما...... پر یہ گھر تعمیر کر رہے تھے تو میں سیڑھیوں سے نیچے لکڑی کے گودام کو نہانے کا لباس تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتی تھی۔ اندر تقریباً اندھیرا ہوتا۔ پھر بھی وہ بچہ تنگ دروازے سے اندر جھانکتا...... ایک طرزِ زندگی کی حفاظت اور دفاع کے لیے۔ صورتِ حال کو جاری رکھنے کے لیے۔ وہ وقت جب میں چڑچڑی ہوگئی......

''کل میں الانیا جاؤں گی۔'' میں نے یوسف کو بتایا، ''میں تمہیں ٹائپ رائٹر بعد میں دکھاؤں گی۔ کسی اور وقت لیکن یقیناً میرے جانے سے پہلے۔''

یوسف نے دوبارہ اپنا سر ہلایا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اب بھی نہ ہلا۔

''پلیز چلے جاؤ۔'' مجھے کہنا پڑا۔

اور پھر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جسے میں دباتی رہی تھی، کچھ ایسا جس نے مجھے بے آرام کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کچن کے دروازے کی چٹخنی لگا دی...... اس بار چٹخنی کام کرنے لگی تھی...... لیکن میں نے اسے فوراً دوبارہ کھول دیا اور اسے پیچھے سے آواز دی، ''کیا تم کچھ

پستے لینا چاہو گے؟''

جار میں کچھ پستے موجود تھے۔ میرچ کہا کرتی تھی، مجھے یہ دکھائیں بھی مت، میں ان سے موٹی ہو جاؤں گی۔ میں نے مٹھی بھر یوسف کو دے دیئے۔ وہ بھاگ گیا۔

ہمارا یہاں پہلی بار آزادی کی جانب بھاگنا کوئی 8 سے 10 سال پہلے تھا، مثلاً مختصر سے نہانے کے لباس میں میرا اِدھر اُدھر گھومنا، مثلاً گونے کا اپنے پھولنے والے کھلونے، وہ بطخ، ہنس لے کر سمندر کی طرف جانا...... ان پر تیرتے ہوئے اس کا سوڈا پینا، پھولنے والے رنگین تختوں پر ہمارا دھوپ سینکنا، میرا ہمیشہ دوسروں کو غیر ملکی زبانیں سکھانے کے لیے فکر مند رہنا، میرا ترجمے کا کام، حتیٰ کہ ان تختوں یا شہتیروں پر بھی میرا اپنے خاوند اور بچے کو اپنی زبانوں میں پکارنا، مثلاً ہمارا آدھی رات کو سمندر پر جانا...... وہ دوبارہ پورے چاند کی رات تھی...... بالکل برہنہ ہم تینوں، سمندر میں جاتے ہوئے بالکل برہنہ، ہم تینوں...... شام کے وقت حسن را کی (انگور اور کشمش سے بنی مقامی شراب) کی چسکیاں لیتے ہوئے گاؤں کے ٹیچر سے ملاقاتوں کے دوران اور دوسرے دہقانوں سے، اپنے طریقوں کو الٹ پلٹ نہ کرتے ہوئے، اپنے طریقوں کو اوندھا نہ کرتے ہوئے، مثلاً گاؤں کی عورت کی جانب سے خیر مقدمی یا استقبالی ملاقاتوں میں ہمارا نیم برہنہ آنا...... ہمارا خود کو ڈھانپنے کی ضرورت محسوس نہ کرنا...... کیا یہ سب کچھ ہماری آزادی کے دفاع کے لیے تھا یا یہ مقامی لوگوں کو ایک نئے طرزِ زندگی سے آگاہ کرنے کے لیے تھا جو ابھی کل ہی پہاڑوں سے نیچے آئے تھے، (گاؤں کے لوگ شہر کے لوگوں کے طور طریقوں سے واقف نہ تھے، وہ روایتی لباس جیسا کہ شلوار قمیص پہنتے جب کہ عورتیں سر ڈھکتی تھیں جب کہ شہروں کے لوگ مغربی لباس اور تیراکی کے لباس پہنتے تھے)، جو ابھی سمندر سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے، جنہوں نے ابھی ریت سے کوئی رشتہ استوار نہ کیا تھا؟ اب یہ سوال خاصا تاخیری ہے اور کیوں کہ ایسا ہے، اسے پوچھنا اور نہ پوچھنا برابر ہے۔ پھر بھی یہ ایک سوال ہے۔

پلے بوائے میگزین، جولائی اور اگست گرلز جو گھر صاف کرتے ہوئے مجھے فرش پر ملیں، انہوں نے لمحے بھر کو میرا لہو جما دیا۔ پھر میرا تیراکی کا لباس...... ہاں کسی نے اسے اپنی تسکین کے لیے استعمال کیا تھا...... اب کے بعد سے میں بے خبر ہونے کا بہانہ نہیں کر سکتی، خود کو لکڑی کے گودام میں بند کر کے اپنی برہنگی کی حفاظت کرنے پر خود کو تسلی نہیں دے سکتی۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے

ہوئے کہ یوسف کے سامنے کیسا ردِعمل دکھاتا تھا، ہچکچاہٹ ہوئی تھی، اگرچہ ہر شے نے ہمیں بہار کے اختتام پر کسی خواب کی سی چھٹیوں میں خود اپنی ذات اپنا آپ بننے کی اس قدر اجازت دی تھی۔ شروع میں۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا سامنے آنا اور غائب ہونا ایک ہی وقت میں رونما ہوا۔ کیوں کہ میرے دوست آنے والے تھے۔ میں نے ان سے بھرپور آزادیوں والی چھٹیوں کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے خود سے اس کا وعدہ کیا تھا۔ وقت گزر چکا تھا۔ بعد میں، کون جانتا تھا کہ ساحل پر تیراکی کے مختصر لباس میں کتنی عورتیں دکھائی دیتیں؟ گیس یا ہوا سے پھولنے والے رنگین Rafts پر کتنے بچے؟ وقت گزر گیا۔ اب ہم مزید گزرے کل میں زندہ نہیں ہیں، مجھے خدیجہ سے ملنے سے پہلے حسن کو اپنے پورے کپڑے پہننے کا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جولائی گرل کا تعلق ماضی سے تھا۔ اپنی آنکھوں سے وارننگ کے اشارے دیتے ہوئے مجھے کسی کو حکم نہیں دینا چاہیے تھا۔ مجھے میرچ کو یوسف کے سامنے ٹانگیں پھیلا کر نہ لیٹنے کی نصیحت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں دوآن سے یہ کہنے کے ہرگز قابل نہ ہوتی کہ تمہیں یہ دیکھتے ہوئے کہ مزدور دُور فاصلے سے ہمیں دیکھ رہے ہیں، اپنی بانہیں میری گردن میں نہیں ڈالنی چاہئیں، تمہیں ہر وقت مجھے بوسہ نہیں دیتے رہنا چاہیے۔ وہ ہر وقت بوسہ لینا چاہتا۔ وہ یہ کہتے ہوئے مضطرب ہو جاتا، مجھ سے محبت کرو، محبت کرو، تم سب۔ اس لیے، وہ اپنے دل میں طوفان لیے، باہر موجود چیزوں کے پُرسکون ہو جانے کا منتظر رہتا۔ دو لوگوں کے لیے روبی کے رنگ کی وائن کے ساتھ ڈنر کے لیے، چائے کے طویل لمحات یا گرمیوں کی خوب صورت تعطیلات کے لیے جو کبھی نہ ہوئیں۔ وہ لمحے جب اسی قسم بگولہ میرے دل میں چکرانے لگا...... اور اب وہ اس قدر تواتر سے آتے تھے...... میں خود بھی اسے ان تمناؤں کے بارے میں بتا سکتی تھی جن کا اوپر نیچے ڈھیر لگا تھا...... میں کہہ سکتی تھی کہ تم بھی تو سارا موسم سرما یہاں نہیں تھے۔ میں اپنی بانہیں اس کی گردن میں ڈالنا چاہوں گی۔ کسی وجہ سے اس کے لیے وقت نہ ہوگا۔ اس کا وقت کبھی نہ آئے گا۔ سرما کے وسط میں وہ تمام روشن پُرحدت لفظ کہے نہ جا سکے تھے جب ہم آمنے سامنے تھے، کمر یا گردن کے گرد بانہیں ڈالنے کی وہ تمنائیں جو ہمارے اندر کہیں گہرائی سے پھوٹ رہی ہیں، مرجھا جاتیں، ان میں کمی آجاتی، ہم ایک دوسرے سے یوں فاصلہ رکھتے جیسے ہمارے درمیان کوئی پُرجوش احساس بھی نہ رہا تھا۔ یہ اس قدر بڑے شہروں میں، روزمرہ زندگی میں ہوتا۔ شرم و جھجک کی عادتیں یا خصوصیات، خود کو بیان نہ کرنے کی

کوششیں، حتیٰ کہ نہ ختم ہونے والے شبہات راستے میں آ جاتے۔ ہمیں خود ہم نہیں بلکہ ہمارے خائف دل کنٹرول کرتے تھے، جن کا ایک ماضی تھا، ان کا اپنا ماضی، تھکا ہوا، مشتبہ، کسی بھی لمحے دفاعی ہونے کے لیے تیار۔ ہمارے دل جنہوں نے اپنی تاریخ یا اپنے ماضی کی حفاظت کی قسم اٹھائی تھی۔ صرف اس کی۔ ہم کبھی شاید ہی اس سے باہر نکل پائے تھے۔ لمحے بھر کو۔ لمحے بھر کو جو پوری زندگی کا احاطہ کرتا، ایک وقت کو، ایک شب، چند گھنٹے، احساس جو رفتہ رفتہ اپنی شدت کھو دیتا...... اور وہ سب جن کی قسمت فوری طور پر بھلا دیا جانا تھی۔ بھلا دیا جاتا۔ اس کے لیے سب سے زیادہ احتیاط کی جاتی ہے، اس پر سب سے زیادہ احتیاط صرف کی جاتی ہے۔ چھپانے کے لیے، ڈھانپ لینے کے لیے۔

اب ہماری ناک کے عین نیچے، قادر کے سامنے، جس کے بارے میں مَیں نے پہلے ہی روز جان لیا تھا کہ وہ ایک باپ اور دو بیویوں کا شوہر تھا، خدیجہ اور اس کے بچوں کے سامنے...... خدیجہ جو حتیٰ کہ مستقبل کے بارے میں بھی اسی یقین سے بتا سکتی تھی، جو کہہ سکتی تھی کہ وہ مستقبل قید تھا یا برتن یا سونے کا دانت...... میں اس لمحے حسن کو دوبارہ بوسہ دینے کے قابل نہ ہوتی جب میں نے ویسے محسوس کیا جیسے میں نے محسوس کیا، دو آن کی کمر میں اپنی بانہیں ڈالنے کے ناقابل، فواد کی کمر پر دھوپ سے جلد کو سانولا کرنے والا لوشن لگانے کے ناقابل۔ احساسِ خطا کے ایک عجیب احساس کے ساتھ میں سب کچھ ڈھانپ دیتی، چھپا لیتی، کناروں تک لبالب بھرے ہوئے اور بہنے کو تیار، ہماری خواہشوں کے ساتھ۔ میں انہیں چھپا لیتی، ڈھانپ لیتی۔ اس کے بعد ہم شہروں کی نسبت زیادہ چھپ جاتے۔ میں اب کیا کرتی؟ کسی کو کیا کرنا چاہیے؟ کوئی کسی تمنا سے کس طرح اپنا دفاع کرے جب کہ وہ اس میں اس قدر گھرا ہو؟

سب کچھ خود بخود ہو گیا۔ بالکل جیسے بستر خود بخود تقسیم ہو گئے تھے، اسی طرح ہمارے اقدام ہمارے عمل بھی آپ ہی آپ ہو گئے، سمندر کی لہروں کی طرح۔ وہ جھاگ اڑاتیں، پُرسکون ہو جاتیں، رک جاتیں، پیچھے ہٹ جاتیں یا اوپر چڑھ آتیں۔ موسیقی کی طرح۔ بالکل سمندر کی طرح جس کی لہریں ہمارے ساتھ نہیں پلٹتی تھیں...... ہم نے ایک مرتبہ خدیجہ کو اپنے پورے لباس میں سمندر کے پانی میں چپکے چپکے اترتے دیکھا تھا...... ہم بھی واپس نہیں پلٹے تھے۔ ہم نے کسی کو بھی الجھن میں نہیں ڈالا تھا۔ وہاں کوئی انتشار یا افراتفری نہ تھی۔ بالکل، جیسا کہ دوسروں کی نگاہوں میں، ساحل،

لہریں، جنگل اپنی اپنی جگہوں یا مقام پر تھے جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے تھا، ہم بھی اسی طرح ہی تھے۔
اب غیر متوقع طور پر میں نے خود کو خائف محسوس کیا جب میں اکیلی تھی، میں قریب آتی بارش کے
بارے میں خائف تھی۔ کہر مسلسل شمال کی جانب جا رہی تھی، پہاڑوں پر گہری ہو رہی تھی۔

جب یوسف چلا گیا، میں کچھ دیر ٹیرس پر رکی رہی۔ سورج میرے عقب میں تھا۔ ساحل
ایک مرتبہ پھر اناروں کے رنگوں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ میں ان رنگوں کے عین درمیان ہونا چاہتی
تھی، ان آخری گرم راتوں میں سمندر میں ایک مرتبہ پھر غوطہ لگانا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا نہانے کا
لباس پہنا اور نیچے پانی میں چلی گئی۔ کام ختم ہو چکا تھا، تعمیراتی جگہ سے اٹھنے والا شور تھم چکا تھا۔ جب
تم پانی سے باہر آؤ تو شمال مغرب کی ہوا ٹھٹھرا دیتی تھی لیکن نیچے گہرائی میں پانی گرم تھا اور میں نے
انہی گہری گرم خاموشیوں میں تیراکی کی۔ پھر میں ساحل سے گزری۔ نقش و نگار، نام جو ہم نے لکھے
تھے، وہاں ویسے ہی پہلے کی طرح موجود تھے۔ وہ ساحل کے ایک گوشے میں سنگ مرمر پر نقش کندہ
کاری کا تاثر دیتے تھے۔ میں ساحل پر چلنے لگی۔ واپسی کے راستے میں مَیں نے نوٹس کیا کہ راس کے
آخر میں چٹانوں پر کوئی موجود تھا۔ وہ رات کے پرندے کی طرح وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اور جیسے ہی میں
نے اسے دیکھا وہ پھر سے اڑ گیا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس سمت میں اڑا تھا۔ وہ جنگلی درختوں کے بیچ
گم ہو سکتا تھا یا جنوبی سمت کی چٹانوں میں فرار ہو سکتا تھا...... میں آپ ہی آپ مسکرا دی۔ مجھے یوسف
کی ضد یا اڑیل پن پسند تھا۔ میں یہ سمجھ گئی، بچہ ہر شے خصوصاً ہمارے خلاف اپنی آزادی کا دفاع کر رہا
تھا۔ لیکن کیا وہ یوسف تھا؟ جو میں نے دیکھا، جو میں نے خیال کیا کہ میں نے دیکھا، وہ اس کے
چھوٹے چھوٹے بالوں والے سر سے مشابہ نہیں تھا۔ بہر حال میں اسے بہت تھوڑی سی دیر کو ہی دیکھ
پائی تھی۔ یقیناً اسے یوسف ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ ممکن ہے کہ دھند لکے کے باعث ان نوکیلی چٹانوں
پر کوئی اور وجود مجھے یوسف جیسا دکھائی دیا ہو۔ کسی کی آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں۔ ایسا کبھی بھی ہو سکتا
ہے۔ کہر آلود صبحوں یا غروبِ آفتاب کے فوراً بعد فاصلے اور چیزیں دونوں ہماری نگاہوں کو دھوکا
دے سکتے ہیں۔ ہر چیز کو جس طرح روشنی منعکس کرتی ہے، اسی طرح سمجھا یا دیکھا جاتا ہے۔

میں تعمیراتی جگہ کی طرف نہیں گئی۔ وہ علاقہ سرد تھا۔ میں واپس گھر کی طرف تیرنے لگی۔
کچھ دیر ہو چکی تھی۔ میں سیدھی گھر میں چلی گئی۔ کسی وجہ سے میں نے کچن کے دروازے کو لاک کر دیا

اور کسی طرح اس بار چمنی ٹھیک طرح سے لگی رہی۔ میں نے مٹی کے تیل کا لیمپ جلا کر کچن کی کھڑکی میں رکھ دیا۔ میں نے پانی گرم کیا، نہائی اور کپڑے پہن لیے اور پھر میں نے اپنے لیے گرم چائے تیار کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ میری سمندر میں آخری تیراکی تھی۔ کل تیز ہوا یہاں گہرے بادل لے آتی۔ لیکن پھر بھی مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ کل چاہے دیر ہی سے سہی، دن صنوبر کے درختوں سے چھن کر آتی دھوپ سے روشن ہو جاتا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے اپنی کھڑکی سے باہر دیکھا...... ہمارا سب سے خوب صورت ونڈو فریم...... وہی جو سنک کے اوپر تھی۔ مٹی کے تیل کے لیمپ کی سبزی مائل زرد روشنی کھڑکی کے شیشے سے منعکس ہو رہی تھی، اس لیے میں سمندر کو ٹھیک سے نہ دیکھ پائی، اس کے آگے صنوبر کے قدآور درخت تھے، جن کے سائے اسے تاریک کر رہے تھے۔ میں نے لیمپ کو نیچے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کھڑکی سے باہر، موٹی سبز پروں والی مخلوق، پتنگے، چھوٹی چھوٹی مکھیاں جو روشنی دیکھ کر جمع ہو گئے تھے، یکا یک بے حرکت ہو گئے۔ ہوا رک چکی تھی۔ ہوا اس قدر ساکن تھی اور چھوٹے چھوٹے حشرات اس قدر زیادہ تھے کہ میں نے اسے بارش سے پہلے چھانے والے سکوت کی نشانیوں سے تعبیر کیا۔ فاصلے پر جنگل میں گھروں کی روشنیاں پانی پر منعکس ہو رہی تھیں۔ ان روشنیوں نے، چھوٹی چھوٹی لہروں کے ساتھ ہلکورے لیتے ہوئے، متواتر آگے پیچھے ہوتے ہوئے اور پھر میرے سامنے چھوٹی سی کھاڑی تک آنے سے پہلے سمندر کے جنگل کے عین درمیان غائب ہوتے ہوئے، پانی پر راستے بنا دیئے۔

ہمارے ایام کی کہانی کہنے کے لیے میز پر بیٹھنے سے پہلے میں پانی پر ان رنگین زرد روشنیوں کے عکس دیکھتی رہی۔ میں نے انتظار کیا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ کیا کسی ''جسے میں نہیں جانتی'' کی بجائے جانے والی شہنائی کی آواز مجھ تک پہنچے گی، اگر میں اس وجد آفریں درویش آواز کو سن سکوں جو میں نے سنسان ساحل پر سنی تھی۔ یوسف کا قرہ باجک چند ایک بار بھونکا۔ قادر نے شیخی خور انداز میں لمبی سی سیٹی بجائی اور پھر صرف سمندر کی لہروں کی آواز باقی رہ گئی۔ کوئی شہنائی کی آواز نہ بچوں کا رونا دھونا۔ اب سمندر کی آہستہ سے بلند ہوتی لہروں کی گنگناہٹ باقی ہے جب وہ چٹانوں کے بیچ خالی جگہوں کو پُر کرتی ہیں، چھوٹے چھوٹے تالابوں کو بھرتی ہیں اور بہار کے اختتام کے حشرات کی تقریباً سنائی دینے والی سانس کی آوازیں جو کھڑکی سے بے حرکت چپک گئے ہیں۔ اس قدر خاموش

رات۔ چھپکلیاں دیر گزری سو چکی ہیں۔ بڑی اور ان کے بچے۔ جھاڑیوں اور پودوں میں سے ایک آواز بھی نہیں آ رہی۔ حتیٰ کہ ٹیرس کے نیچے سیڑھیوں پر صنوبر کے مخروطے تک نہیں گر رہے...... جب وہ گر رہے ہوتے ہیں تو آپ سوچتے ہیں کہ شاید آپ سے ملنے کوئی لوگ آ رہے ہیں...... اس کی بجائے مخالف سمت جنگل کے اوپر اچانک روشن چاند اپنا چہرہ دکھاتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا ہے، سمندر کے اوپر ابھرتے وقت اس کی سرخی میں کمی آ جاتی ہے۔ پانی پر زردی مائل کرنیں پڑتی ہیں۔

میں نے کاؤنٹر پر رکھا لیمپ اٹھایا اور میز کی طرف واپس آ گئی۔ میں اسی نکتے سے سلسلہ جوڑنا چاہتی تھی جہاں چند گھنٹے پہلے یوسف نے مداخلت کی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے سحر ٹوٹ چکا ہے۔ میں چیزوں کو آپس میں جوڑ نہیں پاتی ہوں۔ مجھے پہلے روز سے شروع کرنا ہوگا، میں جانتی ہوں۔ لیکن پھر بھی کسی بھی رات کچھ بھی میرے دل میں آ جاتا ہے۔ یقیناً اس لیے کہ وہ چیز اور وہ رات کوئی بھی عام رات اور کوئی بھی عام شے نہیں ہیں۔ میں بتا نہیں سکتی ہوں کہ میرے دل میں میرے اکیلے پن یا تنہائی کے دوران جو آیا وہ کم ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کئی طرح سے اس طرح ہے جیسے پرانی رزمیہ داستانیں ہمیں بڑھاتی اور گھٹاتی ہیں۔ میں نے بجری پر بڑا سا الاؤ جلایا۔ ہم نے صنوبر کی شاخوں کے ساتھ لالٹینیں لٹکائیں۔ ہم نے دعوت کے لیے ان لالٹینوں کے نیچے اپنی میز لگائی۔ یہ کسی تقریب کی طرح ہے جس میں معاہدے پر دستخط کیے جاتے ہیں۔ ہم اپنی زندگیوں پر اپنے دستخط کریں گے۔ یہ آخری رات ہے کہ ہم سب اکٹھے ہیں۔ آپ نے دیکھا، وقت آگے بڑھ گیا۔ مجھے کھو جانے کا یہ مشکل قابل فہم ادراک ہوا۔ مجھے خدشہ ہے کہ یادیں میرے ہاتھوں سے پھسل جائیں گی، وہ غائب ہو جائیں گی، ہمارے پیچھے کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ میں محمت کو گلے لگا لیتی ہوں۔

محمت آخر میں آیا تھا۔ اس نے دُور کا سفر کیا اور وہ دیر سے آیا۔ اس کی سانسیں سب سے زیادہ پھولی ہوئی تھیں۔ اس کا سینہ چوبیس گھنٹے لوہار کی دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہوتا رہتا۔ پہلے پہل میں نے سوچا کہ یہ میرچ کی منفرد خوب صورتی کی وجہ سے تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ شاید دوآن کی نظموں کے باعث تھا۔ پھر بھی کوئی بھی نظمیں نہ سنائی جا رہی ہوتیں تب بھی اس کا سینہ ساکن نہ ہوتا۔

دوسرے دن کے اختتام پر وہ ٹیرس کے جنگلے سے لٹکا ہوا ہی تھا۔ اس کی عینک اسے ایسے بچے کا سا تاثر دیتی تھیں جو جلد سے جلد بڑا ہو جانے کا متمنی ہو، بڑا ہو جائے اور بدصورتی سے چھٹکارا پا

لے اور ہر جگہ کو حُسن سے لبریز کردے۔ وہ تین سال پہلے بھی ایسا ہی تھا: ''میں نے یہ تب لگائی تھیں ہم جب میں پانچ سال کا تھا۔''

جب وہ اس وقت گونے سے ملنے آیا تھا تو اس نے یہ کہا تھا اور اب اپنے دُبلے پتلے جسم کے ساتھ، اس کی ناک کی نوک جو سورج کی اوّلین دھوپ میں سرخ ہو جاتی، اس کی بانہیں جن میں رگیں جلد کے بے حد قریب تھیں، اس کی پشت غروب ہوتے سورج کی جانب، اس نے دیکھا کہ کیسے آخری کرنیں فاصلے پر موجود صنوبر کے درختوں، ساحل، سمندر کو ایک رنگ کے سینکڑوں شیڈز میں ڈھانپے ہوئے تھیں اور چلایا، ''انار کے رنگ تیز چمک دار ہو چکے ہیں!''

اس کا سینہ ایک بار پھر تیزی سے پھیلا اور سکڑا۔ پھر وہ پُرسکون ہو گیا۔ محمت اس سمندر کی طرح ہو گیا جو زیادہ حرکت نہیں کرتا اور بہت سی راتوں تک خاموشی سے گنگناتا رہتا تھا۔ اگر بعید کو ظاہر کر دیا جاتا تو سب کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا، ماند پڑتا، تباہ ہو جاتا۔ کیا ایسا ہونا چاہیے، وہ خود کو اس سب کا تنہا ذمہ دار سمجھے گا۔ وہ تناؤ میں تھا۔ نہیں، دوسرے لمحے سوچنے پر وہ نہیں تھا۔ یہ اس سے زیادہ اس کا اندرونی انتباہ تھا۔ یہ ایک قسم کی تجسس کی عادت کی محتاط حفاظت تھی۔ آپ کو اپنی ایڑیوں پر کھڑے ہو کر زیادہ شور کیے بغیر زندگی کے دل اور تمام حقائق تک پہنچنا تھا...... جب حسن بھی جا چکا تو پیچھے صرف میں اور محمت رہ گئے۔ مح مت اپنی فلائٹ سے قبل آخری گھنٹے یہیں گزارنا چاہتا تھا۔ یوں جیسے اپنی زبان کی نوک سے ہنی فلاور کو چوستے ہوئے۔

جب میں یاسمین کے پودے کو پانی دے رہی تھی اس نے غیر متوقع طور پر اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں۔ کیا کسی کو ساکن پانی کے شور سے خوف زدہ ہونا چاہیے؟ بے خبری میں پکڑے جانے پر بدحواس ہو کر میں نے تقریباً اٹک کر بولتے اسے تنگ کیا، ''تم نے اپنے دانت صاف نہیں کیے اور تم نے اپنی عینک بند کر کے ایک طرف نہیں رکھی۔''

وہ محمت بے داغ استری شدہ رومال کی طرح تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ان ساحلوں جیسا نہیں تھا۔

نظر کی کمزوری اسے بچپن سے تھی، اس کے باعث آنکھیں سکیڑتے ہوئے اس نے اپنے اندر نئے محمت کو دیکھا۔ ہم اس رات کے بارے میں ہنسنے لگے جب وہ پہلے کی طرح ہمیں بوسہ دینا

چاہتا تھا، یعنی اپنے دانت صاف کرنے اور اپنی عینک کو اتار کر بند کر کے ایک طرف رکھنے کے بعد۔

رات کو وہ آیا، میرچ نے اسے پہلے دیکھا۔ پام کے درختوں سے بھاگ کر ہماری طرف آتے ہوئے وہ چلائی، ''محمت!'' حسن اور میں تیزی سے باغ کے دروازے کی طرف بھاگے۔ محمت دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بیگ اٹھائے راستے پر اپنے قدموں پر رک گیا: خاموش رہو، انتظار کرو، سمندر کی آواز سنو، پلیز!

اگر وہ بول سکا ہوتا تو اس کے پہلے الفاظ یہی ہوتے، لیکن اسے بولنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر اس نے اپنی تیاریوں کا آغاز کر دیا۔ ہم سب حیرت زدہ تھے۔ مزید یہ کہ فواد جو ہمیشہ مذاق کو تیار ہوتا، اس نے میرچ کو آنکھ ماری۔ میں اس کی مسکراہٹ، اس کے چہرے کا مطلب سمجھ گئی: کیا یہ لڑکا شیشے سے بنا ہے، یہ کس قسم کا شخص ہے؟

میں حسن کو بھی جانتی تھی...... کم سے کم تھوڑا بہت۔ ان درختوں کے درمیان اپنے پنجوں کے بل چلتے ہوئے، قدرت یا فطرت کا یہ ٹکڑا، وہ کلف لگا، استری شدہ، بالکل سفید رومال جو وہ استعمال کرنا شروع کرتا، خود کو استعمال کرواتا، وہ ہر خوب صورت چیز کی طرف مائل اور اس کے لیے موزوں ہوتا...... پہلے ہی وہ لمحہ بہ لمحہ بدل رہا تھا اور جب یہ ہوا، اس نے ان لمحوں کو تبدیل کر دیا جنہیں وہ گزار چکا تھا۔ اس نے ''شب بخیر'' اور ''صبح بخیر'' کا بوسہ لینے سے قبل اپنے دانت صاف کرنا اور اپنی عینک اتار کر ایک طرف رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ نہ صرف ان صبح بخیر اور شب بخیر کے درمیان بلکہ ہر وقت اور ہر کسی بوسہ دینا چاہتا اور وہ بوسے بالکل بھی فرسودہ نہ ہوتے، وہ محبت پانے کی نسبت محبت کرنے میں زیادہ پُرجوش تھا۔

میرے ہاتھ سے پانی کا پائپ لے کر اس نے یہ کہتے ہوئے گڑھل کے پودے کو پانی دیا، ''میں سوچا کرتا تھا کہ محبت کرنا کسی کو یہ سب کیے بغیر گلے لگانا ناممکن ہوگا۔ محبت کی رسم خراب ہو جائے گی، ختم ہو جائے گی۔''

اور اس نے بتایا کہ وقت کے ساتھ اس نے ایسا ہی کیا، یا تو وہ شخص جسے وہ بوسہ دینا چاہتا، دیر گزری جا چکا ہوتا یا پھر اس کی بوسہ لینے کی اپنی تمنا اپنی مکمل معصومیت کھو دیتی۔

بالکل تب جب وہاں، تم سب میری جانب دوڑ کر آ رہے تھے، سمندر کی لہروں کی آواز

نے مجھے بتایا، محبت کی رسم ختم نہیں کی جا سکتی چاہے وہ جلدی میں ہی ادا کی جائے اور چاہے اس میں تاخیر ہی ہو جائے......

جس صبح اسے جانا تھا اس سے قبل رات کو میں نے اسے گونے کے بستر پر سلایا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا بچگانہ چہرہ ایک تھکن زدہ زندگی کی لکیروں سے پُر تھا، لیکن ایسا چہرہ جو ایک ہی وقت میں شاعری سے بھرپور تھا، متاثر کن تھا۔ محمت خوب صورتی سے پروان چڑھا تھا۔ جہاں تک اس کے دل کی بات ہے وہ اسی قدر معصوم تھا جتنا ہو سکتا تھا، وہ جب یہاں پہلے آیا تھا اس کی نسبت زیادہ بچہ تھا۔

''میری ماں بن جائیں نویم یا پھر میری Tyche۔ عقائد اور شہروں کی محافظ، میری بھی حفاظت کریں۔ مجھے گونے بنالیں۔'' اس نے کہا تھا۔

......گونے کی حفاظت کوئی نہ کر پایا تھا۔ اب جس چیز کی حفاظت کی ضرورت ہے، وہ ایک گیت ہے...... ''تم ایک گیت ہو۔ وقتاً فوقتاً تم ہمیشہ سنائی دیے جاتے ہو۔'' میں نے اسے یہ بتایا۔

ایک ایک کر کے ستاروں کے نام گنواتے ہوئے محمت نے اپنی نگاہیں چھت پر جما رکھی تھیں: اس کی آنکھوں نے مجھے ان کہر آلود صبحوں کی یاد دلا دی جو روشن دنوں کا وعدہ کرتی تھیں۔ وہ صبحیں بہت امید افزا تھیں لیکن اسی وقت وہ وعدے کی عظمت یا وسعت سے نم تھیں۔

''ساحل پر ہمارے قدموں کے نشانات ہیں۔'' وہ بڑبڑایا، ''بڑی لہریں انہیں مٹا دیں گی۔ صرف بہت بڑی لہریں۔ خدا کرے کہ وہ لہریں آپ کے جانے سے پہلے نہ آئیں، چاہے یہ خود غرضی ہی ہے، خدا کرے کہ وہ کبھی نہ آئیں!''

آپ جانتے ہیں کہ کچھ دیر پہلے میں نے ہمارے نقوشِ قدم مختلف رنگوں میں پینٹ دیکھے تھے۔ ہم وہاں تھے۔ ہم نے اب بھی برداشت کیا۔

فواد نے ایک ڈینٹسٹ چیئر کا خاکہ بنایا تھا، پھر اس نے کرسی کے ساتھ X کا نشان بنا دیا۔ ''اور یہ نکالا گیا دانت ہے۔'' اس نے کہا۔

اس لمحے تک اس نے اپنی زندگی میں ایک بھی دانت نہ نکالا تھا لیکن وہ اس کا مشتاق تھا۔

میرچ نے صرف ایک چیز بنائی تھی، ڈینٹسٹ چیئر کے ساتھ بڑا سا سوالیہ نشان۔ پُرسکون، عمدہ۔ اس کے وجود کا حُسن اس کے لیے بوجھ نہ تھا۔ وہ اپنے اگلے Capped دانت کو کب سے بھلا چکی

تھی......جنگل میں ہماری لمبی باتیں......

ہم زندہ رہے۔We Lived۔ہم کبھی جیے تھے۔

دوآن نے یہ ساحل پر لکھا تھا اور ممت نے ان الفاظ کے گرد چار پتیوں والی تپتیا گھاس سے آرائش کی تھی اور اس نے سب سے اوپر ''نویم'' لکھا تھا۔

میرا نام ''نویم'' ہی رہا تھا، آپ نے دیکھا، وہاں ساحل پر بھی۔

پہلے پہلے دنوں ممت نے بعض اوقات نوین کہا اور کبھی میم۔Dionysus نے ہمیں ٹیرس پر وائن کی پیشکش کی۔ بجری والے حصے پر بنے تندور میں آگ جلائی گئی۔ اپنی وائن کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم نے آگ تیار ہونے کا انتظار کیا۔ ہم نے بات نہیں کی۔ ٹیرس پر ہلکی سی آواز کے ساتھ صنوبر کی Needles گرتی رہیں جو ہم نے کچھ ہی دیر پہلے دھویا تھا۔ ہم سمندر کی لہروں کی آواز سنتے رہے۔ ممت، تالاب کا پانی بند کرنے چلا گیا تھا۔ بستر پر جانے سے پہلے ہم اسے دوبارہ آن کر دیتے۔ تالاب پانی سے بھر جاتا۔ قادر اور خدیجہ اپنی سبزیوں کو پانی دیتے......

صنوبر کی جلتی ہوئی شاخوں کی راکھ سفید مکھیوں کی طرح اِدھر اُدھر اڑی۔ یہ وہ وقت تھا جب شمال مشرق کی ہوا میں تیزی آ جاتی ہے۔ چنگاریاں خالی جگہ پر چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی طرح اُڑنے لگیں، پھر رات کی نیلاہٹ میں بھاری اطلس اور اس کی سفید راکھ ہم تک اڑتی ہوئی آئی اور ہمارے بالوں اور ہماری وائن پر ٹھہر گئی۔ فضا پر جلتے صنوبر کی خوشبو چھا گئی۔ ہمارے اندر موجود محبت خالص ساکن پانی کی طرح تھی۔ میں نے اس پانی کے بہنے کی آوازیوں سنی جیسے وہ کسی ایک جسم کی رگوں میں بہہ رہا تھا۔

اپنی دودھیا سفید قمیص پہنتے ہوئے ممت گھر کے عقب سے تاریکی میں بھاگتا آیا۔ شعلوں کی سرخی اس کے سنہرے بیگانہ بالوں پر منعکس ہو رہی تھی، جو پہلے روز ہی سے سورج جیسے سنہری تھے۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے پتلے سے فریم والی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں۔ اپنے آنے کے بعد وہ ہکلا کر بولا تھا، ''نویم، نویم! قادر بے، میرا مطلب ہے قادر آفندی (آفندی، نسبتاً کمتر سماجی معاشی رتبے کے لوگوں کے نام یا عہدے کے ساتھ استعمال ہونے والا خطاب، جیسا کہ ڈرائیور، مالی، چوکیدار، نوکر وغیرہ)، قادر کہتا ہے کہ آگ بہت بلند ہے! جب شمال

مغربی ہوا چلے گی تو اس سے پہاڑی پر صنوبر کے درخت آگ پکڑ سکتے ہیں!''

وہ رات کے پرندے، چمگادڑ، کی طرح جو درختوں پر اترتے اور پھر اڑ جاتے ہیں، اِدھر اُدھر پھڑ پھڑاتا گھوم رہا تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے آگ کے ساتھ بھاگنا چاہیے یا ہمارے ساتھ رہنا چاہیے۔ جہاں تک ہماری بات تھی تو ہم اسے اور آگ دونوں کو ہی توجہ نہ دے رہے تھے، ہم اس کے لڑکھڑانے اور گھبرانے اور نویم، نویم کہنے پر ہنس رہے تھے۔ ہم یہ وارننگ بھول گئے کے صنوبر کے درخت آگ پکڑ سکتے تھے، یہ کہ ساری جگہ جل کر راکھ ہو سکتی تھی۔ حسن سب سے زیادہ ہنسا تھا۔ ''محمت جب سے تم آئے ہو، تم کبھی نویم کہتے ہو کبھی میم۔ اچھا، بس کرو۔ مختصر یہ کہ نام نویم ہے۔ بس......''

محمت حیرت زدہ تھا۔ اس نے دہرایا، ''نویم، نویم''۔ اسے یہ پسند آیا۔ اس کے بعد سب ہی ایسا کہنے لگے۔ وہ مجھے ہمیشہ ''نویم'' ہی کہتے ہیں۔ حسن اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے آگ کم کرنے دو، نویم۔''

ہم بجری والے حصے کی طرف چلے گئے۔ محمت میری جانب آیا۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ لیا۔ اس کے بالوں سے سمندری جڑی بوٹیوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے میری گردن سے اپنا سر لگا دیا اور اپنی ماں کی بھولی بسری آغوش میں پناہ لے لی: ''مجھے خود کو ہمیشہ نویم کہنے دیں۔''

..... میں اب بھی اس کی آواز کی موسیقی سن سکتی ہوں......

دوآن نے اپنا وائن کا گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے محمت کا ہاتھ تھاما اور اسے اٹھنے اور چاندنی کی جانب مڑنے میں مدد دی۔ ''میرے خدا!'' وہ بولا، ''ہم کہاں ہیں؟''

''میرے خدا!'' وہ بولا، ''کس قدر خوب صورت بچہ!''

''ہمارے ساتھ خوب صورت بچے شامل کرنے کا شکریہ۔''

''ہمیں ہمارے ساتھ شامل کرنے کا شکریہ، پیارے خدا!''

ہم کافی دیر خاموش رہے۔ ہم نے دوآن کے دل سے نکلنے والی اس نظم کا احترام کیا۔ ہم نے اسے اپنی نگاہوں کی آغوش میں لے لیا، گلے لگا لیا۔ ہم نے اسے اپنے پروں تلے لے لیا،

اس کی حفاظت کی۔ ہمارے دل بات کرنے لگے: ''میرے خدا!'' ہم نے کہا،''شاعروں کے لیے بے حد شکریہ!''

ہم اس طرح چلا سکتے تھے، کسی چیز کو تکلیف دیے اور کسی بھی چیز کو نامناسبت یا کھوٹ کی طرف دھکیلے بغیر، اس کے برعکس حتیٰ کہ انتہائی عام الفاظ کے ساتھ ان غیر مناسب پسپائی سے؟ انتہائی استعمال شدہ الفاظ کو دوبارہ نیا کون بنا سکتا تھا...... ہمارا گیت...... اندر کی آواز کا دہرایا ہوا...... کسی زندہ کے اندر ہی اندر برستے آنسوؤں سے پانی دے کر قبر کے کتبوں کو خوب صورت کون بنا سکتا تھا؟ کون زندگی کی پیشانی پر، چمکتے روشن ستارے کی طرح، کوئی لمحہ ٹھونک کر لگا سکتا تھا، خود کو اس لمحے میں چھپائے بغیر اور خود کو کسی Red Cent کے جتنا بھی بنائے بغیر، لوگوں کو اس قدر یقین دلاتے ہوئے کہ وہ لمحہ خود اپنی سچائی کے ساتھ وجود رکھتا تھا؟

''میرے خدا!'' ہم نے کہا،''شاعروں کے لیے بے حد شکریہ!''

جہاں سمندر، ساحل سے گلے ملتا ہے، وہاں ایک ہمیشہ تبدیل ہوتی ہوئی لکیر ہے۔ ہم نے ہر صبح اور پھر شام کو اس لکیر کا پیچھا کیا۔ میں اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اس لکیر کو ٹھیک طرح تلاش کرنے کے لیے، پانی کو ساحل پر دائروں میں پھیلتا دیکھنے کے لیے، جو بجلی کے ہلکے کرنٹ کی طرح محسوس ہوتا، ہمارے پیروں کو سہلاتا، دائرے بناتا، اپنی سفید جھاگ کے ساتھ لہروں کی لکیر کے ساتھ بھاگتا...... ہمارے دوبارہ حاصل کیے گئے بچپن کے اس بچگانہ سے خالص کھیل کو ہم سے کوئی بھی نہ چھین سکتا تھا، وہ بچپن جو اس کے جیے جانے سے پہلے ہم سے چھینا جا چکا تھا۔ ابھی ساحل کی سیر سے واپس آنے پر، میں نے محسوس کیا کہ ہم اسی مقام پر ساحل پر لہروں کے ساتھ بھاگنا چھوڑ چکے تھے، لہریں جب خشکی پر پھیلتی ہیں تو ان کی ٹیڑھی میڑھی لکیر کے باہر ہمارے نقوشِ قدم نے ایک نئی لکیر بنا دی تھی، جو کنیر کے ساتھ مین روڈ تک آ کر اچانک رک جاتی تھی۔ یوں تھا جیسے ہم وہاں غائب ہو گئے، اس اجاڑ جگہ جہاں چشمہ اور سمندر ملتے تھے، کنیر کے پیڑوں میں پہنچ کر، ان کی ہمیں تقریباً جلاتی ہوئی زہریلی بو۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں دوبارہ ان نشانات کو دیکھتی ہوں جو بڑے بچوں نے دُور کے اجاڑ، پوری طرح اجاڑ ساحل پر چھوڑے تھے جہاں حتیٰ کہ شہنائی کی وجد آور آواز بھی

نہیں سنی جاسکتی تھی۔ نقوشِ قدم، اکٹھے حرکت کرتے ہوئے جیسے وہ کسی خاموش معاہدے کے پابند ہوں، ایک مخلصانہ معاہدہ، پانی میں چھلانگ لگا دیتے اور اچانک غائب ہوجاتے، وہ اپنی پشت اوپر موجود اینٹوں کی عمارتوں کی جانب کر لیتے، پھر بھی ایسا کرنے سے بہت پہلے کنیر کے جھنڈ میں جاتے ہوئے انہوں نے سمت بدل لی تھی۔ وہاں مہندی اور کنیر کی ملی جلی خوش بو کے درمیان، میں نے محمت کو دیکھا۔ اپنے ہاتھ میں چھڑی تھامے ہوئے وہ ریت میں اتر جاتا ہے۔ ریت جو لامحدودیت اور ازل کی علامت ہے۔

دوآن اور میرچ کے لیے معمول کے غوطے کے بعد پانی سے گھر واپس آنے کی بجائے سمت تبدیل کرنا اور خشکی کی طرف چلے جانا زیادہ معقول تھا۔ یہ زیادہ معقول تھا کہ جو بھی اس جانی پہچانی لکیر سے باہر نکلتا وہ ان میں سے ایک ہوتا کیوں کہ دوآن نہیں چاہتا تھا کہ وہ دن ختم ہوں اور میرچ اپنی ذاتی تجدید کے دَور سے گزر رہی تھی جسے اپنی پرانی ذات کی طرف نہیں پلٹنا تھا۔ لیکن ہم سب یا عقل تمیز کھو چکے تھے...... وہ پرکار یا قطب نما جس کے مسلسل استعمال کا مطلب کچھ حسابات پر انحصار کرنا بھی تھا...... ان وقتوں کے لیے جب قطب نما بے حد ضروری تھا۔ ہم ساکن پُرسکون پانیوں میں تھے۔ ہم بے لہر، بالکل ساکن سمندر میں گہرائیوں میں تھے۔ ہم نے اپنی سانسیں روک لیں۔ ہم سکون کے آخری لحات کی بانہوں میں تھے۔ خاموشی یا سکون کو درہم برہم نہیں کیا جانا تھا، جادوئی خوابوں کو نقصان نہیں پہنچنا تھا۔ منطق یا عقل کی کھردری انگلیوں کو تتلیوں کے نازک پروں کو چھونے کی اجازت نہیں دی جانی تھی......

تو وہاں تھے وہ: پہلے محمت کے نقوشِ قدم۔ پھر فواد کے، اس کے ساتھ ساتھ میرچ کے۔ نقوشِ قدم کا مربع، پھر حسن کے اور ایک قدم پیچھے، دوآن اور پھر دوسروں کے پیروں کے نشانات سے فاصلہ رکھے ہوئے میرے نقوشِ قدم، ان سب سے خاصے پیچھے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اگر میں ان سے یہ فاصلہ نہ رکھتی تو میں ان سب کو فاصلے سے اپنی نگاہوں کی آغوش میں نہ لے سکتی تھی، جس صورت میں شاعری اور ان کے سایوں کا سحر ساحل پر لمبا ہو رہا تھا، ان لکیروں اور نقش و نگار کا سحر بھی تباہ ہو جاتا، وہ سب کا سب، سب کچھ اچانک اس طرح ہو جاتا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ میرے نقوشِ قدم، جھجکتے ہوئے، آہستہ رَو۔ یوں جیسے مجھے اپنے ہی سائے کے اپنے پیروں تلے آنے اور

اپنے ہی پیروں کے نشانات مٹا دینے کا خدشہ تھا۔ حسن کے پیروں کے نشانات کے قریب سے گزرتے ہوئے، روشنی میں ظاہر ہوتے ہوئے، سب سے زیادہ ڈھکے چھپے سوال کا جواب دیتے ہوئے جو آخر میں چھوڑا گیا تھا...... کسی سمندری مکڑی کو سلام پیش کرنے کے لیے خوشی خوشی رکتے ...... ایک بالکل نیا مصرعہ...... کسی پر یا پنکھ کی طرح اڑتے ہوئے، دوآن کے نقوشِ قدم کے اوپر بڑی عمدہ لکیریں چھوڑتے ہوئے۔ تارکول کے ان ایک دو ڈھیلوں کو کھرچ کر ہٹاتے ہوئے جو فواد اور میرچ کے پیروں کے نشانات پر جم گئے تھے، میرا دل ان نشانات پر ایک ذرا سا گندا نشان بھی ہونے کی اجازت نہیں دے رہا، آپ جانتے ہیں اور محمت کے نشانات کی حفاظت کرتے ہوئے، اس کے لامحدودیت کی علامت کی طرح، بے حد احتیاط اور دیکھ بھال سے اور میں دوآن پر مسکرائی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے تھے، ماضی کی کسی عورت کی طرح چھوٹے چھوٹے نشانات۔ اس کا بڑا سا پنجہ دوسروں سے الگ تھا۔

محمت حنا کی جھاڑیوں کے پاس تھا۔ وہ کنیر کے گلابی پھولوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بحیرۂ روم کے سورج کی شعاعیں منعکس کر رہی تھیں...... یہی وجہ ہوگی کہ میں اس کی آنکھوں کا اصل رنگ، آسمان کے سوا، سمندر کے سوا، بتا نہیں سکتی، کہ اس کی آنکھیں حقیقت میں کس رنگ کی ہیں...... اس کی نگاہیں جو چھونے اور سوال کرنے کے ساتھ مل جاتی ہیں کہ سورج کی کرنیں جب پانی سے منعکس ہوتی ہیں تو ہر طرف پڑتی ہیں۔ محمت صرف حساسیت ہے نہ ہی ذہن کا صرف تجسس۔ پھر وہ کیا تھا؟ کیا وہ ہم سب کا محب یا محبوب تھا؟ یا ہم سب اس کے محبوب تھے؟ وہ انتشار تھا یا قرار؟ یا کیا وہ Dionysus تھا جسے زیوس نے ہمیں دیکھ بھال کرنے اور پروان چڑھانے کے لیے دیا تھا؟ یا ہم سب اسے پیش کی گئی Tyches تھے؟

ہم سب صرف ہم سب تھے۔

ہم، ہم ہیں۔

حسن درست تھا۔ ہم جو ہیں وہی ہیں۔ ہم، ہم ہی ہیں۔ ہم پیشکش اور پیش کیے گئے دونوں ہیں۔ قربانی اور قربان کیے گئے۔ جلاد بھی اور شکار بھی......

جب ہم ساحل پر اپنی شام کی سیر ختم کر رہے تھے، جب محمت الگ ہو کر ہمیں کنیروں کی

طرف گھسیٹ لے گیا تھا، یہ کہتے ہوئے ان کے زہر سے آگاہ کرتے کہ ''میں یہ امید کرنا چاہوں گا کہ لہریں لمبے عرصے تک اتنی دُور نہیں آئیں گی، یہ کہ وہ ہمیں بالکل بھی مٹا نہیں سکتی ہیں، ہمیں، ہمارے نشانات کو، نویم۔'' جب اس کا بے چین تجسس اور لاتعداد سوالات اس کی آنکھوں کی کہر کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، بحیرۂ روم کے رنگ کی آنکھیں، جب وہ کہہ رہا تھا، ''گونے، گونے!......'' کسی پہاڑی بادل کی طرح اپنے کانوں میں خودسرگوشیاں برساتے ہوئے، بعد میں جب بہ مشکل دکھائی دینے والے سیلیوٹ کے ساتھ، قدیم قلعوں کے ان شہزادوں کی یادگار، اس نے پہلے شیشے کے قطب نما کو سیلیوٹ کیا اور پھر ہمیں، سمندر، لہروں، آسمان کو، جس کے اطلسی پردے پر اچانک سنہری گرد چھڑکی گئی تھی اور پھر جیسے ہی میں نے جانا کہ میں نے جسے الوداع کہا تھا وہ یہاں رکنے والا آخری شخص تھا، یہ محمت، میں نے سوچا کہ میں اس کے بعد میں نا قابل رسائی، نہ مٹنے والی تمناؤں، بے انت غموں کے باعث خود کو بے حد مایوس محسوس کروں گی۔ آخری دن بھی بظاہر بالکل ایسے ہو جائیں گے جیسے وہ کبھی جیے ہی نہیں گئے تھے، دھوپ بھرے آخری روشن دنوں کے آخری جھینگر، صنوبر کے درختوں میں دوبارہ کبھی مل کر نہ ٹرائیں گے، اگر وہ بولیں بھی تو کوئی بھی کسی چھڑی کے ساتھ صنوبر کی شاخوں کو ہلکے سے ضرب لگاتا نہ ہی ہلاتا...... بڑے سروں والی چھپکلیاں ٹیرس کے لکڑی کے موٹے جنگلوں پر نہ گھومتیں، سمندر کی طرف جانے والی اس ڈھلان پر جھاڑیوں کی شاخوں پر لگے مکڑی کے جالے کبھی میرے سامنے نہ آتے، رات کو مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی کے گرد بے بس پتنگے کبھی چکر نہ کاٹتے، میں مزید یہ جاننے کے قابل نہ تھی کہ ان پتنگوں کی بات کرنا غیر ضروری تھا...... ہمارا ایک خاموش معاہدہ کرنا کہ ہم نے پتنگوں کے متعلق اس قدر باتیں کی تھیں اور روشنی کے گرد ہجوم کرتے رات کے حشرات اور یہ کہ ہمیں اس موضوع پر ایک بھی مزید لفظ کہنے کی ضرورت نہ تھی، خصوصاً یاسمین کے کھلنے میں ہماری کامیابی، گزشتہ صبح میرچ کا ان پھولوں کو اپنے بالوں میں لگانا، فواد کا بہترین باپ کی سی آواز میں پکارنا، ''دن ڈھل چکا ہے، چائے تیار ہے۔ آجاؤ۔ تم میں سے جنہیں سردی لگ رہی ہے، وہ آکر چائے پی لیں......'' اگر یہ کوئی اور جگہ، کوئی اور وقت ہوتا تو ہم ان باریکیوں کو نوٹس کیے بغیر ان کے قریب سے گزر جاتے، ہم ان پروں جیسے ہلکے لمس کو محسوس بھی نہ کرتے، ہم ان نرم مخملیں لہجوں کو سنتے بھی نہیں...... لہجے جو غیر مہذب وحشی چیخوں پر، مہلک اور طنزیہ لہجوں کو ڈھانپ لیتے، چھپا لیتے......

یہ سب کچھ مالا مال کرر ہے ہیں۔ تنہائی نہ ہی غم۔ میں انہیں محسوس بھی نہیں کرتی۔ مجھے جو محسوس ہوتا ہے وہ ایک تیز پکار ہے جو میرے اندر سے پھوٹنے کے لیے تیار ہے، ہم نے یہ کر دکھایا! قبل اس کے کہ محبت اور حسن، زمین سے پوری طرح مٹ جائے، ہم نے یہ کر دکھایا! میری ہتھیلیوں میں محبت اور حسن کے آخری بیج زمانوں میں جذب ہو گئے ہیں۔ مجھے ان کے بعد یہاں ٹھہرنا ہوگا اور انہیں مٹی میں کاشت کرنا، پانی دینا اور بڑی محبت و احتیاط سے ان کی دیکھ بھال کرنی ہوگی، انہیں پروان چڑھانا، دوبارہ پیداوار کے قابل بنانا ہوگا۔

ہاں، وہ سب چلے گئے۔ میں ٹھہری رہی۔ بہار کا اختتام ہوا۔

میری بڑی سی چیخ بھی آہستہ آہستہ واپس پلٹ رہی ہے۔ یہ حقیقت میں مٹائی جا رہی ہے۔

میں نے جو کچھ بتایا وہ خواب ہیں یا حقیقت؟

حقیقت......

میں حیرت زدہ ہوں۔ میں نے ٹائپ رائٹر کے قریب جو دو مٹی کے تیل کے لیمپ رکھے تھے ان میں سے ایک کی بتی چر چراہٹ کی آواز دے رہی ہے۔ مٹی کا تیل ختم ہو چکا تھا۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور پروپین والا لیمپ جلا لیا۔ اس کی روشنی تھرتھرا رہی تھی۔ پروپین بھی ختم ہو رہی تھی۔ میں کافی بنانے چلی گئی۔ کافی بالکل تھوڑی سی تھی۔ وہ پرانی ہو چکی تھی۔ چولہے کی پروپین بھی ختم ہونے والی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ قادر نے اگلی صبح شہر جانے والے پک اپ ٹرک کی خبر مجھے پہنچا دی تھی...... مجھے اب یاد آیا، وہاں میرے آخری ٹرپ پر مجھے معلوم ہوا تھا کہ پروپین کی قلت تھی...... میں لیمپ کا پروپین ٹینک اس آخری رات کے لیے بچا لیا جب میں اکیلی ہوتی۔ خواب یا حقیقت، میں وہ سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی جو مجھ میں باقی تھا، میرے وقت کے ختم ہونے سے پہلے ابھرنے اور پھر مجھے چھوڑنے کو تیار، قبل اس کے میں اس جگہ کو چھوڑ دیتی......کل، جو کچھ بھی ہو، مجھے نیا ٹینک تلاش کرنا ہوگا...... مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں ہر چیز زیادہ روشن دکھائی دیتی تھی۔ کس قدر عجیب، پروپین کی کچھ تھرتھراتی کچھ تیز روشنی میں مجھے اپنے آپ میں واپس آنے میں خاصی مشکل ہوئی...... ہم میں واپس آنے میں...... دوبارہ کچھ دیر کو۔ میں بتاتے رک گئی۔ میں نے رات کے پرندوں کے پھڑ پھڑاتے پروں، ابھی بھی ٹراتے گھاس کے ٹڈوں کی آوازیں سنیں۔

بعض راتوں کو ہم اس تخت پر ایک دوسرے کے برابر پھیل کر بیٹھ جاتے۔ میں فواد کے بہت سے اس قدر خوب صورت چٹکلوں پر متحیر رہ جاتی۔ وہ ہمیں صرف ہنساتا ہی نہیں بلکہ اپنے اندر جھانکنے، اپنے اندر سے اپنے آپ کو دیکھنے کے قابل بناتا۔ ممت کو یقین تھا کہ فواد جو کچھ ہمیں بتاتا تھا اس کا تجربہ کر چکا تھا اور میرچ کا ماننا تھا کہ اس کی ڈینٹسٹ چیئرز مذاق تھیں۔

ہم سب کی زندگیاں مذاق ہی ہیں، شاید۔

ماضی میں اور اب۔

دوآن نے ایسا کہا تھا۔ اس کی آواز میں، کہیں گہرائی میں رکھا گیا غم، ان گہرائیوں سے اٹھا اور باہر آیا۔ پھر اس نے ہمیں Manuel کی نظمیں سنائیں، جو 40 سال عمر سے پہلے ہمیں چھوڑ گیا تھا:

خبردار، جنوب......ایک لفظ، ایک رویہ
ایک جگہ، ایک حلقہ (......)
یہی وقت ہے جب شہزادے مرتے ہیں
وقت جب سورج خاموشی سے غروب ہو جاتا ہے
اور وقت جب رات کا آسمان
بربری ستارے آئینوں میں ٹوٹتے ہیں اور ملتے ہیں
یہ جادوئی روشنی سے تحلیل ہوتا ہے، آپ جانتے ہیں
اور ہماری کشتیاں گہری نیلی ابدیت میں پھسلتی ہوئی
زندگی اور موت کے معنوں میں ظاہر ہوتی ہوئی......

وہ اسے سنانا جاری نہ رکھ پایا تھا، وہ رونے لگا۔ اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے مزید کہا، ''اور شاعری کے معنی میں۔''

ہم خاموش رہے۔ لہروں کی آوازیں شدید تھیں۔ جھینگروں نے اپنے پر ایک دوسرے کی جانب ایسے پھیلائے جیسے انہیں جلا دیں گے، یوں جیسے وہ زچگی کے درد سے گزر رہے تھے۔ ہم نے ان کی آوازیں سنیں۔ وہ راتوں کو سسکیاں بھرتے رہے۔ میں یہ بھول نہیں سکتی۔

میں نے دوآن کو بتایا تھا، ''تم ہم سے کبھی Manuel سے مطمئن رہنے کی توقع نہیں کر

سکتے ۔تم اپنی شاعری کو روک کر الگ نہیں رکھ سکتے ...... مشرقی بحیرۂ روم کے علاقوں کی ایک شاعری۔''

آپ جانتے ہیں وہ اپنی انگلیاں میرے بالوں کی ایک لٹ کو آہستہ آہستہ بل دیتے ہوئے ان میں الجھاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ آ رہا ہے۔ وہ مسکرا دیتا ہے۔ وہ اپنے اندر کہیں سے ایک نظم باہر لاتا ہے:

یہی وقت ہے جب سرد سخت زمین
سمندر کی طرف بہتی ہے
وقت جب زندگی گم ہوگئی ہے
پہاڑی وادیوں میں۔
مویشی، ڈرم، خیمہ، تھیلا اور رائفل
مکھن بلونے کی آواز، خانہ بدوش کا کام
موت اب ایک شکاری ہے
زندگی کا ایک غزال
اور ہم ہیں
محبت اور دشمنی کی کراس فائر کے درمیان
موت کی پکار یا بلاوا
تباہی کی ترغیب
لمحہ جب سینہ بہ سینہ سامنے آتے ہیں
سمندر اور پہاڑ۔

کیا یہ دوآن کی سب سے خوب صورت نظم تھی یا سب سے معمولی؟ خوب صورتی یا معمولی پن کیا ہے اگر یہ وقت، مقام اور بہت سی دوسری جہتوں کی ہم آہنگی یا غیر ہم آہنگی نہیں ہے؟ تخت پر، اپنی انگلیاں میرے بالوں میں الجھائے، جب وہ کہہ رہا تھا،''موت اب ایک شکاری ہے، زندگی ایک غزال۔'' ہم سب سحر زدہ رہ گئے تھے۔ یوں تھا جیسے وہ لمحہ جب سمندر اور پہاڑ سینہ بہ سینہ آمنے سامنے آگئے تھے، وہی لمحہ تھا، محبت اور دشمنی کی کراس فائر کے درمیان......

پھر اپنی قمیص کو سمندر اور ریت سے اڑے ہوئے رنگ والی رنگین کنکریوں کے ڈھیر سے بھرے ہوئے حسن آتا ہے، ''میں کنکریٹ کی اس سلیب کے کونے پر ان سے ایک خوب صورت موزیک بناؤں گا۔''

خاصی پریشانی کے بعد حسن میرے سامنے آتا ہے، بہار کے ثبوت کے طور پر جسے صرف آخر یا اختتام پر جانا گیا ہے، ایک ایسے دَور کی نشانی جب بحیرۂ روم کا تیز سورج ماند نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور وہ موزیک جو اس نے رنگین کنکریوں سے بنایا تھا۔ اس نے ایک دھوپ گھڑی کے گرد ہمارے ناموں کے پہلے حروف لکھے تھے۔ ہر حرف کو مختلف رنگ کی کنکریوں سے لکھا گیا تھا۔ محمت کا "M" دودھیا سفید سے...... ایسی کنکریوں کو تلاش کرنا سب سے مشکل تھا جو خشک ہونے کے بعد بھی سفید ہی رہتیں۔ دوآن کا "D" سرمئی میں۔ فواد کا "F" ارغوانی میں۔ میرچ کا "M" گلابی جس میں گہرے گلابی رنگ کی لکیریں تھیں۔ میرا "M" زرد میں...... لیکن سرمئی مائل زرد اور خود اس کا اپنا "H" سیاہ کنکریوں سے لکھا تھا جن میں سفید لکیریں تھیں۔ حسن نے اس سب کو اس طور لکھا تھا اور اس نے دھوپ گھڑی کو سمندری سیپیوں سے سجایا تھا۔ کنکریٹ اور سمندری سیپ: میں نے یہ بھی سوچا ہوگا: کیا یہ ہم نہیں؟

کوئی اگر حسن کو بڑے شہروں، چوڑی سڑکوں، ہجوم یا کام کے دوران دیکھے تو وہ اسے ایک مضبوط جسم والا تنا ور یا بہادر شخص سمجھے گا لیکن وہ جس کی کوئی اندرونی باطنی دنیا نہیں، کوئی شخص جو کسی کے نوٹس میں نہیں آتا...... اچھا اگر اسی وجہ سے اس کا اپنی جنسیت، اپنی جنسی طاقت کی اس قدر پرواہ کرنا کوئی دفاعی شے بن گئی تھی یا برسوں میں دوسروں سے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کی کوشش، ہمیشہ وعدے نبھانے کی کوشش...... وہ اسے ہمیشہ یہاں جانتے ہیں، یا کھاڑی کے بیچ میں، سورج تلے، چٹانوں پر، ایتھینا اور اپالو کے معبدوں میں یا قدیم شہر کے ایمفی تھیٹر کے قریب اور جب وہ آسمان کی طرف منہ کر کے چلاّ رہا تھا۔ اپنے زخموں کی اپنے ہاتھوں مرہم پٹی کرتے ہوئے، اپنی کمزوری یا نامردی کو عظمت بخشتے ہوئے اور اسے ایک نئی اور زیادہ خوب صورت طاقت میں تبدیل کرتے ہوئے، دوسرے اسے جانتے تھے اور جب وہ سمندر میں گہرا غوطہ لگا رہا ہوتا یا وہاں جو اس نے غیر معمولی چیزیں دیکھی ہوتیں ان کے بارے میں بتا رہا ہوتا، تب بھی۔

دوآن کہتا ہے، ''حسن جیتی جاگتی نشانی ہے۔''

حسن، محبت میں ایک نئی جہت کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ اسے جسم پر انحصار سے آزاد کر دیتا ہے۔ جسم جس نے صدیوں تک محبت کو اپنا غلام بنائے رکھا، وہ اس جنسیت کے سامنے بونا یا بے وقعت ہی رہے گا جو فزیالوجی کی غلام نہیں بنتی ......تمنا......

ممت بھی کچھ کچھ حسن جیسا بننے کی تگ ودو کرتا ہے۔ ''لیموں کے پیڑ پر ایک واحد لیموں اُگتے دیکھ کر کوئی بھی آپ کی طرح مسرور نہیں ہو سکتا۔ میں بھی درختوں، جڑوں، بیجوں کی زبان سیکھنا چاہتا ہوں۔ حسن ابی، میں انہیں انسان کے ساتھ شامل کر کے اور پھر بھی خود اپنی الگ ذات قائم رکھتے ہوئے ان کی زبان سمجھنا چاہتا ہوں۔'' وہ کہتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ نے دیکھا کہ ممت خود اپنی ذات یا اپنا آپ بن جاتا ہے۔ مجھے اپنے اندر سورج طلوع ہوتے محسوس ہوتا ہے اور یہ کہ غروبِ آفتاب کوئی انجام یا اختتام نہیں ہے۔

حسن اپنے سیمنٹ کو ملاتا ہے۔

میرچ نے مجھے الزام دیا تھا، ''میں سمجھ پائی ہوں کہ آپ نے انہیں چھوڑ دیا! بہت سے برسوں سے......''

''میں سمجھ پائی/پایا ہوں......'' دوآن یقیناً اب ایسی کوئی گفتگو نہیں کرتا جس میں ''میں یہ سمجھتا ہوں، وہ سمجھ پایا ہوں......'' شامل ہو۔

مجھے میرچ کو بتانا چاہیے تھا کہ کسی کے کسی کو چھوڑ دینے جیسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی، یہ کہ میں نے حسن کو نہیں بلکہ اپنی تھکی ہاری گھسی پٹی ذات کو چھوڑا تھا اور میں نے اس کے لیے اتنی ہی محنت کی تھی جتنا کہ کوئی دوسری عورت کرتی۔ میں حسن کو مکمل طور پر تبھی جان پائی تھی جب وہ اپنی جنسی قوت کھو بیٹھا تھا، جب اس نے اپنی پوری قوت سے غلامی کی بیڑیوں کو تھامے رکھنے کی جدوجہد کی تھی...... یہ کہ تبھی میں خود کو بھی جان پائی تھی......شاید میرچ یہ سمجھ لیتی۔ ایک ادیب Octavio Paz کا سوچتے اور اس کے اٹھائے گئے نکتے کو وسعت دیتے ہوئے میں نے کچھ ہکلاتے ہوئے اسے بتایا، ''اس کے سوا کسی امکان کی تلاش میں خود کو جھنجھوڑتے ہوئے کہ یہاں جو کچھ بھی ایسا ہے جو ہمیں ہمارے سوائے کچھ اور بنا دیتا ہے''، خود تک پہنچنے کے راستوں کی تلاش میں، تمام دروازوں کو کچھ مختلف بننے کے لیے مجبور کرنے کے لیے، یعنی ہماری سچی حقیقی، اصلی ذات: اس کا مطلب کسی کو، محبوب، شوہر،

حتیٰ کہ دوست کو چھوڑنا کیوں ہوگا؟ اور اس کا مطلب بیٹے کو چھوڑنا، برسوں کو اور بہت سے دنوں کو پیچھے چھوڑنا کیوں ہوتا اگر ہم خود بھی خود اپنا ماضی خود سے چھپائے ہوئے تھے؟ اگر ہمارا بھی کوئی خاص ماضی ہے، ایک ماضی جو دوسروں کی طے کی گئی روایتی تاریخوں یا ماضی سے ہم آہنگ نہیں ہوتا یا مطابقت نہیں رکھتا ہے؟ اگر ہم خود اپنے ماضی کے مالک ہیں تو اسے بدلنے یا اسے چھوڑنے کا مطلب کسی اور کو چھوڑنا کیوں ہے؟''

نہیں، میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار میرچ کے سامنے کر پائی تھی اور خیالات سے آگے میرا خاص ماضی اور مقام جہاں میں تھی، اس کا اظہار۔ یہ کس قدر مشکل ہے...... زمانے، وقت...... ایک چھوٹے سے ''انجامِ بہاراں'' میں فٹ نہیں کیے جاسکتے تھے۔ حتیٰ کہ میں یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ میرچ کا اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ گہری باتیں سمجھ لینا اتنے مختصر سے عرصے کی ایسی متاع میں سے تھا جسے ننگاہوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

کیوں کہ میرچ نے کہا تھا، ''یقیناً میں جس جگہ پر ہوں اسے ناقابل تبدیل سمجھتی ہوں، میں کسی مضحکہ خیز انداز میں اس جگہ پر ہلے بغیر کھڑی ایک جج کی حیثیت پا چکی ہوں۔ جہاں تک خاص آپ کے ماضی کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ وہ محض میرے آگے کے دانت یا کچھ ایسے ہی ہیں اور یوں میں نے ممکن ہے کہ اس خاص بات کو نظرانداز کیا ہے جو تعین کرتی ہے، میں حتیٰ کہ خود اپنی ذات کی عزت کے قابل نہیں ہوں۔''

وہ اس کا خود اپنی ہنسی اڑانے کا پہلا سبق تھا۔ جہاں تک میری بات تھی، تو میں خود پر ہنسنا بھول ہی چکی تھی۔ ہماری زندگی خواب کی طرح تھی۔ خوابوں میں کوئی شخص بعض اوقات، کچھ چیزوں پر ہنس سکتا تھا، لیکن کبھی بھی اپنے آپ پر نہیں ہنستا۔ مجھے کوئی ایک بھی ایسا خواب یاد نہیں جس میں مَیں نے اپنا مذاق اڑایا ہو۔ اگرچہ حقیقی زندگی میں یہ واحد ہک تھی جس کے ساتھ میں اس دنیا کو تھامے رکھ سکتی تھی۔

فواد کے ساتھ ملاقاتوں میں، اس کے ساتھ فون پر کی گئی باتوں میں، اس کی تحقیر نہ کرنے کی خاطر، کیا میں نے خود اپنی ہنسی نہ اڑائی تھی؟ خود اپنی تحقیر نہ کی تھی؟

فواد، میرا بھائی، لیکن برسوں سے ہم کسی پُرسکون ماحول میں چند گھنٹوں کے لیے بھی اکٹھے

نہ ہوئے تھے۔ہم نے مل کر ماربلز نہ کھیلے تھے۔ہمارے بچپن کو ایک موٹا تاریک پردہ ڈھانپے ہوئے تھا، ہماری ماں، جو کم عمری میں وفات پا گئیں، ہمارے بابا، جو اُن کے بعد چلے گئے...... منجمد لق ودق میدان......اور پھر حسن کے ساتھ میرا گھر۔سب کچھ خود اس کی اپنی دنیا میں بہ چکے تھے۔

سورج ایک مرتبہ پھر غروب ہو چکا ہے۔اِکا دُکا سرکش بادل جنوب سے ظاہر ہوئے تھے اور آگے جا کر غائب ہو چکے تھے۔باغ سے بیلچہ چلانے کا شور آنے لگا۔سرد شام میں فواد گلاب کی خوشبو والے جرینیم کے خشک پھول، بہار کی جنگلی گلاب کی جھاڑیاں جو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں، اکٹھی کرتا ہے۔وہ جگہیں جو وہ جھاڑیاں اکھاڑ کر صاف کر چکا ہے، وہاں وہ جرینیم کی شاخیں لگا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں، وہ زرد ہو جانے والی شاخوں اور مرجھائی دُوب میں نئی کونپلوں کو دوبارہ ترتیب دے رہا ہوتا ہے یا پھر وہ مٹی میں گڑھل کا پودا لگا رہا ہوتا ہے۔کوئی بھی اسے نہیں بتاتا کہ اب اس سب کا موسم نہیں: وہ سب جڑیں پکڑ لیں گے۔

''ہمارے جرینیم کو پانی دینا مت بھولنا نویم۔'' جب وہ جا رہا تھا، سڑک کے بالکل آخری سرے سے اس نے مجھے پکار کر کہا تھا۔

وہ سب سے پہلے گیا تھا۔وہ تھکا ماندہ اور سست تھا۔وہ اپنی ڈینٹسٹ چیئرز تک نہ بیچ پایا تھا۔وہ ان کرسیوں کو بنانے کے لیے اِدھر اُدھر سے قرض اٹھاتا تھا۔اس کا اسسٹنٹ جو اس کے پارٹنر جیسا تھا، اسے چھوڑ چکا تھا۔ورکشاپ جو اس نے لیز پر لے رکھی تھی اس کا کرایہ بڑھ گیا تھا۔ جہاں تک اس واحد کرسی کی بات تھی جس کا اسے آرڈر ملا تھا اور یوں وہ فروخت ہو سکتی تھی، لیکن وہ وقت پر تیار نہ ہونے کے باعث جہاں تھی وہی دھری رہ گئی۔وہ مینوفیکچرر سے صارف تک، تمام نسل انسانی کے خلاف، ہر شے کے خلاف، غصے سے بھرا ہوا تھا۔وہ ہر کسی سے حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے بھی بیزار ہو چکا تھا، ماسوائے اپنی بہن کے جس سے وہ آنے والے برسوں میں اپنی بانہوں میں تحفے بھرے ملنا چاہتا تھا......کیا کہوں کہ وہ ابھی یہ بھی نہ کر سکتا تھا۔اس کے لیے ہمارے ساتھ شامل ہونا مزید ممکن نہ تھا، اس لیے وہ فرار ہو گیا تھا۔نفرت سے دُور، غصے سے دُور......

مٹی کے تیل کے لیمپوں کے ساتھ میری تگ ودو، کنٹینر میں میرا پانی بھرنا، اس کا خیال کرنا کہ میں اس کی ڈینٹسٹ چیئرز کی کہانی کو پوری توجہ سے نہیں سن رہی تھی......اس کا سوچنا کہ میں دیکھ

نہیں سکتی تھی کہ وہ کس قدر تباہ و برباد ہو چکا تھا، میرا اس کی تلخی کے جواب میں ہمدردی نہ دکھانا جب اس نے کہا تھا، ''بہر حال میں ہمیشہ اسی طرح بے فائدہ کام کرتا رہا ہوں۔'' اس سب کی بجائے میرا اس کا ہاتھ تھامنا اور زبردستی گھسیٹتے ہوئے اسے پچھلی طرف کی ڈھلان کے نیچے لے آنا، ان چٹانوں تک جن میں سمندر کی لہریں مسلسل ٹکراتے ہوئے شگاف بنا رہی تھیں، میرا اُسے وہاں موجود کیکڑوں کی زندگیوں کے بارے میں بتانا، اس سب نے اس کی خودترسی میں اضافہ کر دیا تھا اور جب میں نے اس سے پوچھا، ''تم کہاں سونا چاہو گے؟'' اس نے ایک کے بعد ایک طنزیہ جواب دیا تھا، ''مجھے یاسمین کے پھولوں والی کھڑکی کے نیچے بستر نہ دینا اور کون جانتا ہے کہ میں کس کے ساتھ کمرا بانٹوں گا، مجھے امید ہے کہ دوآن ایسا نہیں ہے جو آپ کو اپنے مسائل سے بور کرتا ہو اور جہاں تک گونے کے بیڈ کی بات ہے، میں وہاں ہرگز نہیں سوؤں گا......''

گونے کا نام لیتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے نگاہ جھکا لی اور پھر ہم باتیں کرنے لگے۔ ''کھڑکی کے شیشے پر چھپکلیاں پانی میں تیرتی مچھلیوں جیسی لگتی ہیں۔''

''خصوصاً اس روشنی میں، ہے ناں فواد؟''

وہ ہمارے اکٹھے گزارے گئے پہلے گھنٹے تھے۔ اس نے محتاط رہ کر میرے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر اس نے وہ لے لیا جو میرے ہاتھ میں تھا: ''یہ مجھ پر چھوڑ دو، میں ڈیک چیئر ٹیرس پر لے جاؤں گا۔''

میں نے اسے نیچے رکھ دیا اور اس نے اسے بے ڈھنگے پن سے اٹھا لیا۔ اس نے کچن کے دروازے پر دھاتی نقش و نگار دیکھ کر کہا، ''اسی وجہ سے یہ دروازہ اس قدر تنگ سا ہے......''

جیسا اس نے کہا۔ ہم نے اسے ٹیرس کے سب کے خوب صورت حصے پر رکھ دیا۔ اس نے اس پر گرنے والے صنوبر کے پتے ہٹا دیئے، اس نے خود کو کرسی پر گرا لیا۔

اس گولے کو نگلتے ہوئے جو ابھی ابھی میرے اندر بن گیا تھا، میں نے پوچھا، ''کیا میں اب تمہیں کوئی ڈرنک دے دوں؟''

''میں حقیقت میں ایک لوں گا ہی۔''

''جِن اور ٹانک؟''

''تمہارے پاس ہے، واقعی؟''

اس کی شکایتوں میں کمی آ گئی تھی۔ ٹیرس پر گھومتی بڑی مکڑیاں، ریت کی مکھیاں جو سورج غروب ہونے پر نکل آئی تھیں...... پھر اس کی ان کے بارے میں شکایتوں میں بھی کمی آ گئی یہاں تک کہ اس کے لبوں پر ایک شرمیلا گیت بھی آ گیا تھا...... حسن کے آنے سے پہلے ہی وہ کئی چیزوں کا عادی ہو گیا تھا اور آخر کار خود اپنے ساتھ بھی اس نے صلح کر لی۔

فواد۔ میرا چھوٹا بھائی۔ وہ اپنی محبت کو پہچان سکتا تھا نہ ہی اس کا اظہار کر سکتا تھا۔ وہ تقریباً بھول چکا تھا کہ میں گونے کی ماں تھی۔ وہ اس کے اکلوتے پیارے ماموں کی حیثیت سے مسلسل روتا رہا اور یہ کہ وہ اس کا نہ ہونا اب کیسے برداشت کر پائے گا؟ وہ اپنی خاطر، اپنے لیے، روتا رہا تھا۔

وہ اس کا یہاں چوتھا روز تھا۔ وہ سمندر میں سے نکلا۔ وہاں، حسن اور میں یاسمین کی خشک شاخوں کی کانٹ چھانٹ کر رہے تھے۔ دوآن گاؤں گیا ہوا تھا۔ محمت مچھلیاں پکڑنے والی کشتیوں میں سے ایک پر سفر کو نکلا تھا جو اچانک آگے ساحل پر دکھائی دی تھیں۔ میرچ نے دھوپ میں سانولا کرنے والا لوشن لگا کر اس دھوپ میں سانولا ہونے کی کوشش کی جو اب زیادہ تیز نہ رہی تھی۔ اچانک فواد نے حسن اور مجھے دونوں کو پیچھے سے آ کر گلے لگا لیا۔ اس کے بازو بھی گیلے تھے۔ نمکین کھارا پانی اس کے بالوں سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے مجھے بار بار اتنا زیادہ چوما کہ میں نے اسے پہلے کبھی ایسے نہیں دیکھا تھا، ''مجھے تم سے بہت محبت ہے، بہت زیادہ...... جیسے جب تم نے حسن کا انتخاب کیا تھا، اس سے پہلے تھی، بالکل اسی طرح، میں اب بھی تم سے اسی طرح محبت کرتا ہوں نویم...... میں اس کی وجہ سے تم پر رشک کرتا رہا ہوں حسن...... میں برسوں سے رشک کر رہا ہوں...... بالکل اب جب میں نے پانی تلے ایک بے حد خوب صورت مچھلی کو دیکھا، تو مجھے معلوم ہوا...... کہ میں نویم کی وجہ سے تم پر رشک کرتا آیا ہوں...... لیکن اب، یہ ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے تم سے بھی بے حد محبت ہے حسن...... مجھے حیرت ہے کیا اس وجہ سے کہ تم میں علیحدگی ہو گئی، مین کہہ نہیں سکتا کہ یہ اس کی وجہ سے ہے...... مجھے برداشت کرو...... ماضی کو معاف کر دو...... میں نے تمہاری ڈنر ٹیبل کو غم و رنج سے بھر دیا...... مجھے معاف کر دو۔ کیوں کہ مجھے تم دونوں سے بے حد محبت ہے...... یوں ہے جیسے محبت کی فراوانی اور اس کی عدم موجودگی

بالکل ایک جیسے ہیں...... یا تھے...... مجھے معاف کرنا......''

وہ ہمیشہ سے بے ڈھنگا رہا ہے۔ صحافت میں، جو کچھ میں کرتی ہوں اس میں......یعنی مترجم ہونا......پھر ایک سول سرونٹ کے طور پر، ڈینٹسٹ چیئرز کے معاملے میں اور محبت میں۔ جب میں اس بارے میں سوچتی ہوں، مجھے خیال آتا ہے کہ اس کے یہ تمام بے ڈھنگے کام سب سے دلکش تھے۔ جہاں تک اس کے تمام بے ڈھنگے کاموں میں سے سب سے زیادہ دلکش بات اس صبح کی تھی جب دن صنوبر کے درخت کے پیچھے سے طلوع ہوا، جب اُس نے کہا، مجھے تم سے بے حد محبت ہے، میں حسن سے بھی حسد محسوس نہیں کرتا۔ یہ اس کا اس قدر حیرت انگیز بے ڈھنگا عمل تھا جو اسے یہ کہہ کر کور کرنا پڑا تھا، ''پانی شان دار ہے! کیا تم تیرا کی نہیں کرو گے؟''

حسن نے اپنا بازو فواد کی گردن میں ڈال دیا۔ اس انتہائی شادماں بے ڈھنگے پن کو داغ دار نہ کرتے ہوئے حسن اس سورج کے جواب میں جو فواد کے اندر سے پہلی مرتبہ جگمگاتے ہوئے طلوع ہو رہا تھا، بڑا فطری سا ردِعمل دکھا رہا تھا: ''سب سے زیادہ شان دار اس طرح کھل کر کہنے کے قابل ہونا ہے فواد۔''

''نہیں۔'' فواد نے کہا، ''سب سے شان دار بات تو محبت کرنے کے قابل ہونا ہے......''

پھر اس نے میرچ کو ایک جگمگاتا پتھر دیا جو وہ سمندر سے لایا تھا۔ کافی دیر تک یوں لگتا رہا جیسے وہ کچھ چبا رہا تھا، اس نے بہ دقت تھوک نگلی اور بہ مشکل سنائی دینی والی آواز میں بولا، ''ہمیں یاد رکھنا۔ سمندر کو یاد رکھنا۔''

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ شاید یاسمین سے جھڑنے والی کیڑے مار دوائی کی وجہ سے تھا یا فواد کی وجہ سے، یہ اس کے بالوں سے میرے چہرے پر ٹپکنے والے کھارے پانی کے قطروں کے باعث بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے یہ نہیں کہا، ''مجھے یاد رکھنا۔''

اس نے کہا، ''ہمیں یاد رکھنا۔''

شاید مجھے شروع سے شروع کرنا چاہیے۔ میں ایک خاص ترتیب سے چلوں گی۔ مجھے ہر برس، ہر دن، ہر لمحے اور ان برسوں، دنوں، لمحوں کے اندر ہم سب کو انجام دینے کے لیے انجام دینا

چاہیے اور اس کے بعد یہاں کچھ بھی نہ بھولتے ہوئے، نہ ماربلز، جل پریاں، دیوتا، دیویاں یا شہنائی کی آواز جو ہمیں رات کو ساحل سے وقتاً فوقتاً سنائی دیتی...... اور پھر ہمارا گیت، ہمارا گیت...... سیپیوں، کڑوے جنگلی پھلوں، وہ باتیں جو چٹانیں لہروں سے کرتی تھیں اور خود ہماری باتیں، انہیں بھولے بغیر...... جھاڑیوں میں گھومتے پھرتے، نوکیلی چٹانوں پر آکر بسیرا کرتے ہوئے رات کے پرندے...... قبل اس کے کہ روشنی پوری طرح ختم ہو جائے، قبل اس کے کہ میری پلکیں بوجھل ہو جائیں، قبل اس کے کہ میری روح تاریکی میں غوطہ لگا لے...... بالکل شروع سے، بالکل شروع سے...... میرے پاس اب کس قدر کم وقت ہے۔ میں مزید صرف دو یا تین بار دیکھ پاؤں گی کہ کیسے طلوع آفتاب چاند کے غروب ہونے سے پہلے ہی اس کی روشنی ماند کر دیتا ہے۔ پھر گہرے بادل ہر چیز پر چھا جائیں گے، حتیٰ کہ سورج پر بھی، میں واپس چلی جاؤں گی۔

شہر جہاں ہم پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، ہم اور وہ سب کچھ جو ان شہروں کو گھیرے ہوئے تھا، وہ سب انہی سبزی مائل کائی کے ساتھ سمندر میں غرق ہو چکا ہے۔ پانیوں نے ہمیں ڈھانپ لیا ہے۔

کسی بند بے ہوا جگہ پر بہت دیر تک کسی کریٹ میں سٹور کیے ہوئے اورنج کی طرح جو ایک کے بعد دوسرے کو گلائے سڑائے جاتے ہیں، شہر نے میرے گرد پھپھوندی کے رنگ کے ہلکے داغ چھوڑ دیے۔ میں تلخ سے تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ لمبے عرصے تک، میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی تھی، حتیٰ کہ حسن سے بھی نہیں...... حتیٰ کہ گو نے جواب یہاں ہے ہی نہیں۔ میں دوآن کے خطوط پر خوش ہوتی لیکن میں ہماری دوستی کو صرف ان خطوں تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ میں فواد کی نہ ختم ہونے والی شکایتوں کو برداشت کرنا چاہتی تھی نہ ہی اس کی مجھ سے ملاقاتوں اور فون پر باتوں میں اس کی مسلسل خودترسی کو۔ انہیں ایک فاصلہ رکھنے دو! خود اپنا بوجھ اٹھانا میرے لیے دشوار ہو گیا تھا۔

میں خوف زدہ ہو چکی تھی۔

جنازے میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو مجھ سے دُور رہنے دو، خدا کرے کہ انہیں مزید تکلیف نہ ہو، خدا کرے کہ انہیں تکلیف نہ ہو...... خدا کرے کہ خود غرضی اور حقوق سے انکار کے لازمہ حیات سے خوراک پانے اور پروان چڑھنے والی فرسودگی، جہاں ہے وہیں رہے، اسے وہیں

خشک ہونے دو، اسے لمف نوڈز تک پھیلنے مت دو......! اس لمحے جب مجھے لینگوئج کلاسز کے لیے بھاگنا تھا، نیوز پیپر بیورو جانا تھا، شاپنگ کرنی تھی، پوسٹ آفس جانا تھا، فارمیسی جانا تھا، میں اس ڈر سے کہ کہیں ان راستوں اور سڑکوں پر مجھے اپنا کوئی پرانا شناسا نہ مل جائے، سڑک پر گندے گڑھوں، تھوک اور بلغم کے نشانوں، کاغذ کے پرزوں کو گنا کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے فرار کے طور پر میں ان سڑکوں پر تمام گندی اور بدصورت چیزوں کو گننا شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ میں جانتی تھی کہ گنتی، صرف گنتی، بہت سوں میں سے صرف ایک تھی......

ان کے لیے جنہوں نے پوچھا کہ ہم کیسے الگ ہوئے......ایک خاندان جو مضبوطی سے جڑا ہوا تھا......میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آپ جانتے ہیں، گو نے تبھی دو آن کے شکست خوردہ باز نطین میں کالج جانا شروع کیا تھا۔ اس کے چھے مہینے بعد حسن اور میری علیحدگی ہو گئی، ہمیں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ ہمارا گو نے ہمارے پاس کبھی دوبارہ نہ آئے گا۔ چالیس سال عمر سے پہلے حسن، ایسی وجوہات کے باعث جن کا تعین مشکل تھا، نامرد ہو چکا تھا۔ بدترین بات یہ تھی کہ اس نے اسے ہر چیز کا مرکز بنالیا تھا......وہ ضمنی واقعے جنہوں نے اسے اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کیا، اس کا چڑچڑاپن، اس کا یہ تاثر دینا کہ اسے اپنے مسئلے کی بنیادی وجہ معلوم نہ تھی، اس کا اس وجہ کو نہیں بلکہ اس نتیجے کو ثابت قدمی سے گلے لگا لینا...... چاہے فرسودگی اور خون کی بُو ہی ہے جو کسی مرد کو شکست دیتی ہے، اسے اس حقیقت کو قبول نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں اس کے علاوہ بھی فاتح ہو سکتے تھے......اپنے قریب ترین شخص کے ساتھ چڑچڑا اور غصیلا بن کر اسے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اب بھی ایک مضبوط مرد ہے۔ اس کو بات نہیں کرنی چاہیے، اپنے مسئلے شیئر نہیں کرنے چاہئیں، اسے عظیم ترین عظمت یا وقار کے ساتھ اپنی ذات میں دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اس کی جنسی عدم صلاحیت کے مقابلے میں، ایک نئی عظمت ڈھونڈی جانی چاہیے۔ ہم الگ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد، یوں جیسے زندگی ہمیں سزا دے رہی تھی، جب ہم یہاں گو نے سے ایک مرتبہ اور ملنے والے تھے، وہ چلا گیا۔ اور بس۔ اس کو بیان کرنا ناممکن تھا اور اسے بیان کرنا غیر ضروری تھا۔ ہر کوئی جسے وہ جی رہا تھا اس کے علاوہ کسی بھی دوسری حقیقت کو پہچانے بغیر اپنے برتے پر زندہ تھا۔ یوں تھا جیسے یہی نصیب تھا۔

اس کے بعد سے میں ایک مشین بن گئی۔ میں نے دن رات کام کیا۔ اپنی زبان

غیر ملکیوں کو اور غیر ملکی زبان اپنے بچوں کو سکھانے کے مقصد میں گھر گھر گھومی پھری۔ ایک روبوٹ۔ صرف رات کو اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، یوں جیسے کسی نے ان میں مرچیں ڈال دی ہوں، میں پڑھتی، بغیر رکے متواتر تراجم کرتی اور پھر خفیہ آواز میں اپنے آپ سے باتیں کرتی: اگر وہ جو کہیں فاصلے پر منڈلا رہا تھا، اس نے ہمیں الگ کر دیا تھا، تو پھر موت، جو اس قدر قریب آ رکی تھی، ہماری اپنی ذاتوں کے ذریعے، وہ ہمیں متحد کر سکتی تھی۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے حسن اور دوآن اور فواد سے اکثر و بیشتر ملنے سے گریز کیا۔ میں نارنجیوں کے اس کریٹ کے اندر تھی۔ میں نے تازہ تازہ پھپھوندی کی بُو محسوس کی۔

وہ بہار کا اختتام تھا۔ میری کریٹ سے باہر بغیر سوچے سمجھے ایک چھلانگ۔ یہ موت کے خلاف، شاید مکمل طور پر غائب ہو جانے کے خلاف ایک دفاع تھا۔ یہ نوح کی کشتی کی جانب بلاوا تھا...... میرے پاس انہیں صرف یہ کہنے کے لیے بہت وقت تھا، بحیرۂ روم آؤ، بحیرۂ روم کی طرف آؤ، بحیرۂ روم کی طرف، لکھنے کے لیے، محمت کے خط کے جواب میں جو مہینوں سے اسی طرح رکھا تھا، یہ لکھنے کے لیے کہ ہاں آ جاؤ، لیکن سیدھے بحیرۂ روم کی طرف، اس جگہ جہاں تم نے گونے کو آخر بار دیکھا تھا، الوداع کہا تھا۔ میں محمت کے ماں باپ کو نہیں جانتی۔ میں محمت کو بھی گونے کی وجہ سے جانتی ہوں۔ محمت جو زمین پر ایسے ایک مربع فٹ قطعے کی تلاش میں تھا جہاں وہ ہم سے اور گونے سے جڑی امید کے ساتھ قدم رکھ سکتا۔ اس کے بھیجے گئے پوسٹ کارڈز پر ایک بچہ بنا ہوا تھا جو آسمان سے بے انت صحراؤں میں ایک سیڑھی لٹکا رہا تھا، اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا گل دستہ تھامے ہوئے ان سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ ان صحراؤں میں کیا کچھ دیکھے گا۔

جہاں تک میری ہتھیلیوں کی بات ہے تو وہ کھو جانے والے خوابوں سے بھری ہوئی ہیں۔
ان خوابوں کو پھیلاتے ہوئے......

پھر رات کی بس۔ جنوب، ایک فوارہ جسے بھلایا نہیں جا سکتا، ایک راستہ۔ ایک بے حد نیلا اور چمک دار آسمان، اپنا سامان باندھنے اور روانہ ہونے کو تیار۔ میں نے اسے بالکل وقت پر پکڑا تھا۔ میں اسے اس کے راستے سے واپس بلا لیا تھا۔ تھوڑی دیر کو میں نے اسے اپنے گھر میں مہمان کے طور پر برداشت کیا۔ اس خوب صورت ڈھلان پر ان اینٹوں والی بڑی عمارتوں کے باوجود جو مجھے

پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتی تھیں...... نئی عمارتوں کے باوجود...... اس بدصورت جھونپڑے، خدیجہ، بچوں، قادر کے باوجود...... پانی کے پمپ کے شور، تعمیراتی مزدوروں کے پتھر کوٹنے کے بڑھتے ہوئے شور کے باوجود...... پھر وہ کتا اور معذور لڑکا جو یوں دکھائی دیتا جیسے بار بار اس کا گلا دبایا گیا ہو، معذور، اطاعت گزار، جب بھی یہ لانے وہ لے جانے کا حکم ملتا تو اپنے ایک پیر پر اچھلتے ہوئے قادر کی جانب بھاگتا ہوا...... کیا وہ لڑکا وجود رکھتا تھا؟ کیا وہ وجود رکھتا ہے؟ وہ میری آنکھوں کے سامنے کسی سائے کی طرح سامنے آتا اور غائب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اس گہرے نیلے آسمان کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی تھی۔ میں نے ہم سب کو روشن دنوں میں دعوت دی تھی، میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ میں انجنوں کی آوازوں کے باوجود، اس پر حیران ہونے کے باوجود کہ گھر میں کون گھسا ہوگا، پیچھے نہیں ہٹوں گی! میں اپنے بے معنی سوالوں سے جلدی سے گزر جاؤں گی۔ میرے کپڑوں پر اور پلے بوائے میگزینوں کی سر گرلز کی تصویروں پر کس نے وہ گندے داغ چھوڑے تھے...... میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ میں شہر واپس نہیں جاؤں گی۔ وہ پہلے ہی ختم ہو چکا ہے، میں واپس نہیں جا سکتی۔ دوسرے آئیں گے۔ وہ ضرور آنے والے تھے!

اس انتظار کی ایک جادوئی سائیڈ بھی تھی۔ میں نسل انسانی کی ایک چھوٹا سا دکھائی نہ دینے والا حصہ تھی جو خواب دیکھنا بھول چکا تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو جو خوابوں سے خالی ہو جاتے ہیں، امید کے گیت گانے سکھاتے ہیں۔ دل سے گایا جانے والا ہر امید بھرا لوک گیت، ان کے خوابوں سے خالی، ٹوٹے ہوئے ریکارڈز کی خراش دار آوازوں کے ساتھ گونجتا، لڑکھڑاتا ہے۔ یہ سسکیوں کی یاد دلاتی دُھن کے ساتھ ہر جانب گونجتا ہے۔ آپ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ منہ ہل رہے ہیں، کہ آنکھیں دیکھ رہی ہیں، فرار اور خود فریبی کے ڈرامہ میں لاکھوں کامک نقابوں کے پیچھے سے؟ آپ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ان موٹے نقابوں کے پیچھے خوابوں کی دنیا بھی ہے؟ اگر کوئی خواب نہیں تو آپ امید کی بات کیسے کر سکتے ہیں؟ کل ...... کل تک ...... یہ کسی کی مزید اپنی آواز نہیں ہے۔ ''کل تک، کل تک'' کے موٹو، جنہیں ان کے پیٹوں پر ایک بٹن کے ذریعے مجبور کیا جاتا ہے...... مصنوعی پھولوں جیسی مصنوعی امیدیں......

کل تک، میں نے کہا تھا کہ پہلی رات خواب اور حقیقت کے درمیان۔ میں نے سنی: ایک

چیخ۔ایک تمنا جس میں امید رکھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔وہ یہاں ہے، ساحل پر، ایک بحری جہاز، ایک سفید بحری جہاز...... یہ گھر...... ہمارا منتظر رہتا ہے، تاکہ ہمیں طوفان سے فرار حاصل کرنے دے، تاکہ ہمیں نیلگوں سبز پُرسکون پانیوں تک لے جائے......

سب کچھ ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے، باقی صرف امید اور خوابوں کی ماں سی کوکھ رہ جاتی ہے۔

روشنی رفتہ رفتہ مدھم ہو رہی ہے۔میری آنکھیں اچانک تھکن سے بوجھل ہو گئیں: میں نے آخری بار کہا تھا، کل تک، انتظار میرے لیے کبھی اتنا حقیقی نہیں تھا۔تمنا اس قدر کبھی نہ جھکی تھی۔ خواب بھی، امید بھی......

ہوا صنوبر کی شاخوں کو جھلا رہی ہے۔یہ شمال مشرق کی جانب کے کواڑوں کو ہلکا سا ہلاتی ہے جو دیوار سے بجتے ہیں۔ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ...... مغربی جانب کی کھڑکیوں کے پیچھے، سائے بنتے اور پھیلتے ہیں۔چاند طلوع ہو رہا ہے۔میرے پپوٹے بے حد بوجھل ہو رہے ہیں۔سب کچھ دھندلا رہا ہے۔

''کل۔'' میں نے آخری مرتبہ کہا تھا،''میں عندلیب کے مسلسل گیت گانے کی آواز پر جاگوں گی۔''

☼

یہ آج صبح ہوا۔روشنی کی گرم پتلی ڈوریوں یا ریشوں نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا اور ایک ایک کر کے میری آنکھوں میں ڈوب گئیں۔روشنی کی ان ڈوریوں کی وجہ سے میں اپنی آنکھیں پوری طرح نہ کھول پائی۔میں منتظر رہی۔سورج نے طلوع ہونے سے پہلے پیغام رساں کے طور پر سرمئی کہر آلود روشنی بھیجی تھی۔میں اس کے کھڑکی سے گزر کر اندر آنے اور سفید دیواروں اور لکڑی کی چھت پر ہلکورے لینے کی منتظر رہی۔نیلے پتوں والے آکاشیا یا کیکر اور جنگلی درختوں پر بلبلوں کے ایک دوسرے کو گیت سنانے کی منتظر۔میں نے آری چلنے اور ہتھوڑا کوٹنے اور قریب سے ایک موٹر سائیکل کے گزر کر تعمیراتی جگہ جانے کا شور سنا۔صبح کی خاموشی کو توڑ دینے والا شور۔

ساری رات، لیمپ کی روشنی میں، جس کا مٹی کا تیل رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا، میں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ کیا ہوا تھا۔اس سب کو ٹھوس یا جامد بنانے کے لیے جو ہم کل تک جی چکے

تھے، ہماری زندگی۔ ریت پر قدموں کے ان نشانات کی طرح غائب نہ ہونے کے لیے جنہیں لہریں مٹا دیتی ہیں...... چاند کی روشنی ماند پڑ گئی۔ کھڑکیوں پر پڑنے والے سائے دھندلا گئے۔

یہ میری پہلی صبح تھی جب وہ جو جانے والے تھے، میرے گرد اکٹھے ہونے والے تھے، ایک ایک کر کے، مجھے پھولوں کے تحفے دیتے ہوئے، بہت جدا اور پھر بھی اپنی موجودگی سے غیر واضح...... کیا میں واقعی اکیلی تھی، کیا میں اکیلی ہوں؟ کیا وہ چلے گئے؟......

کسی نے بھی مجھے یہ کہتے ہوئے نہیں جگایا کہ ''تم سورج طلوع ہوتے دیکھنے کا موقع کھو رہی ہو۔''

میں جس آواز سے جاگی، وہ نئے دن کو طلوع ہونے سے روک دینے والا شور تھا اور بلبلوں کے گیت۔

کچھ دیر پہلے میں آدھی سوئی آدھی جاگی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب میں سورج کی کرنوں سے اپنے بازوؤں اور چھت پر بننے والے نقش و نگار دیکھوں گی۔ تھوڑی دیر کو۔ میں کھڑے ہونے، سنائی دینے، ہنسنے کے سب انداز جمع کروں گی اور ان کمروں میں، اس ٹیرس پر، پتھر کی سیڑھیوں پر ہم میں سے ہر کسی پر تبصرہ کروں گی۔ بحیرۂ روم کے اس علاقے میں جنگلی پھولوں کا گل دستہ اکٹھا کرنے کے لیے جہاں بہار کے اختتام پر کچھ نہیں ہے۔ تلاش کر کے، انتخاب کر کے۔ کانٹوں کے درمیان چھپی تپتیا گھاس رکھ کر پتلے تنے والے ہلکے پر پل Pompons، زرد پھولوں کے ساتھ، جو خشک ہونے پر بھی اپنا رنگ نہیں کھوتے اور حنا کے سفید پھول...... میں ان سب کو جمع کروں گی اور میں سوچ رہی تھی کہ سہ پہر میں، میں بیٹھ کر جو کچھ میں نے جمع کیا ہو گا اسے خشک ہونے کے لیے ایک ایک کر کے صفحوں کے درمیان رکھ دوں گی۔

اب میں اُس نکتے تک پہنچ چکی ہوں۔

وقت بے حد تیزی سے گزر رہا ہے اور یوں بھی ہے جیسے یہ بالکل بھی نہیں گزر رہا: جس روز میں نے یہ گھر کھولا تھا وہ روز بھی ایسا ہی تھا...... یہ پہلے سے ہی کھلا تھا، مجھے نہیں معلوم...... میں نے اس سب کی صفائی کی تھی جو ہماری غیر موجودگی میں گھر میں گھسنے والے چھوڑ گئے تھے، میرے ذاتی استعمال کے کپڑوں تک میں دخل دیتے ہوئے۔ شام جلد ہی ہو گئی تھی۔ آخر کار سب کچھ بے

داغ اور صاف ہو گیا تھا۔ پھپھوندی کی بو ختم ہو چکی تھی، ہر وہ چیز جو داغ دار تھی اسے پھینکا جا چکا تھا۔ مردہ پرندہ اور کرسی پر چھوڑا گیا اس کا داغ دونوں کو جلد ہی بھلایا جا چکا تھا۔ جب کھاڑی سایوں میں ڈوب رہی تھی تو میں نے سمندر میں غوطہ لگایا تھا۔ یوسف...... اور بعض اوقات اس کے ساتھ ایک اور بچہ یا کبھی کبھار خدیجہ کے ساتھ...... نے میرا پیچھا کیا۔ بعض اوقات میرے پیچھے چلتے ہوئے، لیکن زیادہ اوقات صرف اپنی نگاہوں سے میرا پیچھا کرتے ہوئے۔ میں قادر سے بھی ملی جو خدیجہ کو بھگا لایا گیا یا شاید وہ خدیجہ تھی جو قادر کے ساتھ بھاگ آ گئی تھی۔ یہ وہ قادر تھا جس نے اچھے سے نہا کر کنگھی کی تھی جس کی سیاہ مونچھیں نفاست سے تراشی گئی تھیں۔ اس کے پاس اسکی انگ کرنے والوں جیسا اونی مخروطی ہیٹ بھی تھا۔ اس نے خاصی ڈھیلی سی سیاہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی جس کا کالر شکن آلود اور فرسودہ تھا، جو کئی بار دھل چکی تھی۔ اس کی نگاہیں سارا وقت کمرے کی چوبی فرش پر جمی رہی تھیں۔ شہر کی عورت کو نگاہ اٹھا کر دیکھنے کو نا مناسب سمجھتا ہوا قادر، یوں ظاہر کرتا ہوا کہ اس کے ذہن میں یہ ہمیشہ ایسے ہی تھا۔

''گھر کا خیال رکھنے کا شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ وہ پھر بھی گھس آئے۔ انہوں نے چٹخنی توڑ دی۔ مجھے جب موقع ملے گا تو میں اس کی مرمت کر دوں گا۔''

''جب ہم گھر بند کریں گے تو اسے دیکھ لیں گے۔''

ایسی اور اس سے ملتی جلتی تمام باتیں اب مجھے یوں لگتی ہیں جیسے وہ اس وقت کے دوران ہوئی تھیں جس کا مجھے یقین نہ تھا کہ وہ گزرا بھی تھا یا نہیں۔

اب میں زمانہ حال میں ہوں۔ ٹائپ رائٹر کے بٹنوں کی آواز بڑھ جاتی ہے کیوں کہ وہ نیچی چھت تلے گونجتی ہے۔ باتیں بار بار بتاتے ہوئے میں فیصلہ نہیں کر پائی کہ شروع کہاں سے کروں۔ مجھے امید ہے کہ یوسف نہیں آئے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ ٹائپ رائٹر کی آواز اس کا بلاوا ہے، وہ ہمیشہ کہیں سے نمودار ہو جاتا ہے۔

مغرب میں موجود صنوبر کے درخت اب بے حرکت ہیں۔ وہ رات کے وقت کھڑکی پر گھنا سایہ پھیلا دیتے ہیں۔ کل والے کچھ بھولے بھٹکے بادل اب بھی شمالی پہاڑوں کی چوٹیوں کے قریب

موجود ہیں۔ ساحل سے آتی ہوا بادلوں کو پوری طرح منتشر نہیں کر پائی ہے۔ جہاں تک اس تنہا ستارے کی بات ہے، اب تک اس کی واپسی میں بہت وقت ہے۔

کس قدر خوب صورت ستارہ

مگر تنہا

صرف میری ہی تنہائی

میری دلکشی بڑھاتی ہے

نہیں، یہ نہیں۔

صرف تنہائی......صرف تنہائی

ہماری دلکشی بڑھاتی ہے۔

جب دن نکل رہا تھا، میں نیند اور بیداری کے درمیان اسی طرح لٹکتی رہی۔ مجھے یہ موقع کھونا نہیں چاہیے کہ کس طرح بڑی اور چھوٹی کھاڑیاں، قریب اور دُور کے پہاڑ روشن ہوتے ہیں، مجھے اس قدر نظارے نیلگوں سرمئی سے بحیرۂ روم کے سے زرد میں تبدیل ہونے کا ایک لحہ بھی نہیں گنوانا چاہیے...... مجھے بلبلوں کے گیت سننے کا موقع نہیں کھونا چاہیے......ایک موٹر سائیکل گزر گئی۔ تعمیراتی جگہ پر کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ اپنی آنکھیں سختی سے بند کرتے ہوئے، میں اپنے پھول جمع کرنے چلی گئی تھی۔ میں نے ہلکی سی دستک کی آواز سنی۔ پہلے میں سمجھی کہ وہ آرے سے صنوبر کے شاخ کاٹنے کی آواز تھی۔ ایسا نہیں تھا۔ وہ کچن کے دروازے کی آواز تھی۔

میں سیدھی ہوگئی اور آگے بڑھ کر ٹیرس پر کھلنے والی کھڑکی سے جھانکا۔ وہ قادر تھا۔

''ٹھہرو، میں آتی ہوں۔''

اب میں دن میں ہوں۔ سب کچھ صاف اور روشن ہے۔

میں نے جلدی جلدی اپنا گاؤن پہنا۔ اس دوران مجھے امید تھی کہ قادر سمجھ گیا ہو کہ میں ابھی بستر میں ہی تھی اور چلا گیا ہو۔ پھر میں نے اس کھڑکی سے دوبارہ جھانکا۔ وہ ٹیرس سے اتر کر بجری والی جگہ پر جا چکا تھا اور اب خشک ٹہنیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ میں لمحے بھر کو ان سیڑھیوں پر رک گئی جو لِونگ روم تک جاتی تھیں۔ کمرے میں دن کی روشنی کی کلیاں اچانک کھل گئی تھیں۔ کھڑکی کے شیشوں

سے منعکس ہوتی ہوئی سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں دیواروں پر ایک دوسرے سے کھیل رہی تھیں۔ مجھے کمرے میں ہر طرف پھیلتی رنگوں کی اس دھماچوکڑی سے جلدی سے گزرنا پڑا۔ ہر صبح کچھ نہ کچھ کھو جاتا، ایسا جسے آپ دوبارہ کبھی نہ تھام پائے۔

ٹھنڈی سیڑھیوں پر میرے ننگے پیر، میں نے کچن کا دروازہ کھولا، اس کی چٹخنی پہلی دستک پر ہی کھل گئی تھی۔

''معاف کرنا، میں نے تمہیں انتظار کروایا۔''

''نہیں، نہیں۔'' قادر اپنے ہاتھوں میں خشک ٹہنیاں اٹھائے میری طرف مڑے بغیر بولا،'' پک اَپ ٹرک جا رہا ہے۔ کیا آپ کو کچھ خریدنا ہے؟''

استعمال شدہ پروپین، سگریٹ ختم...... پچھلی رات میں نے جار کی تہ میں موجود کافی کو اداسی سے دیکھا تھا۔ شاید مجھے خود شہر جانا ہوگا......

''پروپین گیس کے ٹینک خالی ہیں۔ کیا میں وہ دے دوں؟ کیا وہ انہیں دوبارہ بھر سکتے ہیں؟''

''جو بھی ہو، لے آیئے۔ اگر ہو سکیں، ہمارے بھی کسی بھی صورت دوبارہ بھروائے جانے ہی ہیں۔''

ایک امید۔ میں نے خالی ٹینک باہر رکھ دیئے۔ ٹیرس پر اچھی خاصی خنکی سی تھی۔ رات اور دن کے درمیان جنگ میں، کیا بارش برسی تھی یا یہ شبنم تھی؟ کنکریٹ جھلملا رہا تھا۔ ٹیرس دھو کر صاف کیا گیا تھا، جیسے میرے ہمسائے پہلی صبح میری مدد سے نہ چوکے تھے اسی طرح اس صبح بھی جب ہر کوئی جا چکا تھا اور میں دوبارہ اکیلی ہی تھی۔ میں چند گھنٹے ہی سوئی تھی مگر گہری نیند۔ اس سے پہلے کہ دن کی روشنی مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کرتی، قبل اس کہ موٹر سائیکل اپنی تیز آواز کے ساتھ گزری تھی، میں نے خدیجہ یا قادر کو دن نکلنے سے بھی پہلے ٹیرس دھوتے نہ سنا تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ نہ آئیں...... مجھے امید ہے کہ وہ نہیں آئیں گے...... مجھے امید ہے کہ وہ میری دنیا اور میرے خوابوں میں چھلانگ نہیں لگائیں گے......کل، ہر مرتبہ جب میں نے اپنے اندر جھانکا، میرے دماغ میں یہی کچھ آیا۔ لیکن وہ آگئے اور جب میں ابھی سو ہی رہی تھی، انہوں نے ٹیرس سے دھو دیا۔

جب میں ٹینک باہر لے جارہی تھی، قادر نے میرے ننگے پیروں کو دیکھا۔ اس نے فوراً ہی اپنی نگاہوں کا رخ بدل لیا...... پلے بوائے میگزین کی کاپیوں، میرے داغ دار لباس وغیرہ کو یاد کرتے ہوئے میں اس مرتبہ کچھ بے آرام ہوگئی۔ مزید یہ کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے کسی مجرم کو کسی ایسے لمحے ایسا کام کرتے پکڑ لیا تھا جس کی مجھے توقع نہ تھی اور اس کے بعد، گھبراہٹ، کیسا ہو کہ قادر میری یہ مشتبہ نگاہ اچانک دیکھ لے...... میں انصاف نہیں کررہی تھی۔ موٹل کی تعمیراتی جگہ کے گارڈ نے میرے اور میرچ کے تیراکی کے مختصر لباس میں ہماری عریانی کو نہ دیکھنے کی اپنی سی پوری کوشش کی تھی۔ پہلے روز سے اس نے مسلسل خود کو ڈانٹ ڈپٹ کی تھی۔ لیکن میں اسے اب ہی واضح طور پر جان پائی تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہوں، جنہوں نے اس کی نہ دیکھنے کی کوششوں کی تابعداری نہ کی، نے ہماری عریاں ٹانگوں، جسم کو چھوا، وہ اپنا سر جھٹکتا، فرش کی طرف دیکھتا اور وہیں نظریں گاڑ لیتا۔ یقیناً اس نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ ہمیں پریشان نہ کرے، غلطی نہ کرے۔ ہر کوئی پہلے ہی اپنی سی پوری کوشش کر چکا تھا لیکن بس وہی کچھ تھا، آپ جانتے ہیں، وہ ہمارے بالکل قریب تھے اور ہم سمندر کے بالکل قریب تھے۔ ہم خود کو اپنی خواہش میں اڑان بھرنے سے نہ روک پائے تھے۔ ہم قید ہونے کے نئے طریقے نہیں چاہتے۔

قادر نے ٹینک اٹھائے اور چلا گیا۔

وہ رات جب میں نے گھر کو کھولا تھا، اپنی تھکن کے باوجود میں نے انتظار سے خوشی کشید کی تھی۔ دیر تک نہ سوسکنے کے باعث میں سمندر کی لہروں کی آواز سنتی رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں جوان نئے خوابوں کا نتیجہ تھیں، جنہیں میں نے بڑے جی جان سے پروان چڑھایا تھا، ساحل سے ٹکرانے والی لہروں کی آواز پر بھی غالب آگئیں۔ ایک ذرا انتظار۔

میں نے میرچ کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ حقیقت میں مَیں نے اسے ایک مرتبہ استنبول میں دیکھا تھا، دوآن کے شکست خوردہ بازنطین میں۔ اس کے لمبے، گھنے، سیدھے سیاہ بالوں کے سوا مجھے زیادہ کچھ یاد نہ آیا اور اس کے پتلے پتلے ہونٹ۔ وہ تنک مزاج شوخ ہونٹ تھے۔ ہونٹ جو آپ کو آپ میں قید کر دیتے ہیں۔ لیکن مجھے زیادہ یقین نہ تھا کہ مجھے ٹھیک طرح سے یاد تھا بھی یا نہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے زندہ ہوتے اس کے ایک اور چہرے میں مَیں نے اسے اپنے بے حد

سفید دانتوں کے ساتھ اپنے سامنے ہنستے دیکھا۔ اس صورت میں اس کے ہونٹ زندہ ہو گئے، زیادہ نرم اور بھرے بھرے...... لیکن یہ تھوڑی سی دیر ہی رہا...... کون سا چہرہ سچ تھا؟

اور پھر محمت: کیا محمت نے ڈاڑھی رکھ لی تھی؟ میں نے یہ اپنے آپ سے بھی پوچھا تھا۔ کیا محمت نے روم، جہاں جانے کی اسے ہمیشہ خواہش تھی، کی بجائے بے دھوپ سٹاک ہوم کے آرٹ سوشیالوجی طالب علم ہوتے ہوئے لیونارڈو طرز کی ڈاڑھی رکھ لی تھی؟ اگر ایسا تھا تو اس کی یقیناً سرخ گھنگھرالی ڈاڑھی ہوگی۔ وہ کبھی بھی لیونارڈو نہ بن پائے گا۔ میں جہاں تھی، وہیں لیٹے لیٹے مسکرا دی۔

ایک مرتبہ اس نے گونے کو بتایا تھا کہ وہ ڈاڑھی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس نے یہ کہاں کہا تھا؟ یہاں یا شہر میں؟

کیا محمت مجھ سے گونے کے بارے میں بات کرے گا؟ میں ایسا نہیں چاہتی۔ نہیں، شاید میں شدت سے ایسا چاہتی ہوں۔ میں سب سے بڑھ کر اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں نے حسن سے علیحدگی لی، اس سے کہیں پہلے یا اس کے کہیں بعد ہم گونے کو کھو سکتے تھے...... یہ سب ایسے نہیں ہونا چاہیے تھا جیسے یہ ہوا، دونوں واقعے ایک دوسرے سے اس قدر قریب۔ کیا محمت مجھے الزام دے گا؟ لیکن محمت کبھی بھی الزام دینے والوں میں سے نہیں تھا۔ صرف ایک بار۔ اپنی ماں اور بابا کے ساتھ، ہاں۔ یہ ایک بالکل بلا واسطہ اور اس طرح سے بہت وزنی اور واضح الزام تھا۔ ''وہ کیسے ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

محمت کے جواب کو یاد کرتے ہوئے، جو اس نے ہماری جانب دیکھے بغیر دیا تھا، ان الفاظ ''میں نہیں جانتا...'' کی سرد مہری نے مجھے ٹھٹھرا دیا تھا۔ پھر میں اس سے زیادہ کہ میں یہ سوچتی کہ کیسے حسن اور میں دوبارہ ایک ہی چھت تلے رہنے والے تھے، یہ سوچنا شروع ہوئی کہ محمت کیا کہتا، کیا کرتا۔ کیا ہوا اگر وہ اسی سرد مہر آواز میں، میرے یہ پوچھنے پر کہ ''تم کیسے ہو؟'' یہ جواب دیتا کہ ''میں نہیں جانتا...''؟ کیا ہوا اگر میں وہ برف پگھلا کر محمت تک نہ پہنچ پاؤں؟ ایک خوف جسے میں کم نہیں کر سکتی تھی...... تاہم یہ بے معنی بات تھی۔ یہ ایک مصنوعی خوف تھا۔ کچھ جو میری اندرونی شکایتوں یا الزامات سے پھلا پھولا تھا، کیا یہ محمت کے خطوط میں موجود بے مثال دردمندی کی لہریں نہ تھیں جنہوں

نے گھور تاریکی میں میرا ہاتھ تھام لیا تھا؟ جس نے جنوب کے یہ آخری روشن دن ہم سب کو دے دیئے تھے؟

میں اس سے انکار نہیں کر سکتی، بعد میں، مَیں نے بھی دوآن کے ساتھ ایک لمبا ڈنر کیا تھا۔ ایک عقدے کو مکمل طور پر سلجھانا، کنکریٹ کو نرم کرنے جیسا اور میں ان سرخ وسفید چارخانے کے میز پوشوں کو نہیں بھولی، ریشمی نرمی کی دھاریوں میں چمکتی ہوئی وائن، ریسٹورنٹ کی خوش گوار روشنی میں وائن کے گلاسوں کو بھرنا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک روز جب ان کے آنے کے بعد میں ریت پر منہ کے بل لیٹی ہوئی تھی...... نہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب کھاڑی پر مکمل طور پر چھاؤں آ گئی تھی، جب پرندوں کے پر، ایک دوسرے کے اوپر دھرے، میرے کندھوں پر پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ یہ اس روز کی بات ہے، اس پہر، اس لمحے کی......

میری دوآن سے پہلی آمنے سامنے ملاقات بہت روز بعد ہوئی۔ آٹھ، دس مہینے بعد، ہم نے گونے کو کھو دیا۔ ان مہینوں کے دوران، کوئی آواز نکالے بغیر، میں طویل اور مختصر، دونوں سفروں پر نکل گئی، یوں جیسے ایک کمرے کے اندر دیواروں اور دروازوں سے ٹکراتی، چکراتی پھرتی ہوئی۔ میرے تمام سٹوڈنٹس، مقامی اور غیر ملکی، چھٹیوں پر تھے۔ میں ڈگمگا رہی تھی۔ کتاب کے صفحے پلٹاتے ہوئے اور یہاں سے وہاں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے...... میں نے ان تمام شاخوں کو تھامنے کی کوشش کی جو میں نے خود سے دُور رکھی تھیں یا جو مجھ سے دُور رہی تھیں...... مجھے اب بھی اندر ہی اندر امید تھی کہ دوآن کو میرے قریب آنا چاہیے، چاہے ایک روز کے لیے ہی سہی...... ایک یا دو مرتبہ اچھل کر اور پھر کچھ بھی ہاتھوں میں نہ آنے پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے، لازمہ حیات تک نہ پہنچنے میں ناکام ہوتے ہوئے، میں توازن کھو چکی تھی۔ میں قریب ترین شاخوں کو بھی تھام نہ پائی تھی۔ جو کچھ میں نے تھاما تھا وہ بھی راکھ کی طرح بکھر رہا تھا۔ بستروں، گدوں میں چھپائی گئی پرانی رقوم کی طرح۔ اذیت۔ ایسے لوگوں کو بے اہمیت جاننا جو کھلے عام یہ نہیں کرتے، اسے بے اہمیت سمجھنا جو نہیں دیکھا گیا۔ نظر انداز کرنا، بے اہمیت جاننا۔ یوں تھا جیسے سب کچھ پنیر کا کوئی ٹکڑا تھا جو تبھی مسرت انگیز ہوتا جب اسے کھایا جاتا۔ کوئی بھی اس سے آگاہ نہ تھا، وہ ہو ہی نہ سکتے تھے۔ میرا بیرونی خول متوازن اور مضبوط لگتا تھا۔ وہ سب گونے کے جانے سے بہت قبل شروع ہو چکا تھا۔

تب بھی یہ ایسا ہی تھا۔ ایک بار پھر ایسی چھٹیاں جو بہار کے اختتام پر لی گئی تھیں۔ گونے، حسن اور میں، ہمارا یہاں ہونا، ہم تینوں کا، آخری مرتبہ۔ محمت بھی یہاں تھا۔ وہ تین روز تک ہمارے ساتھ رہا تھا۔ پھر اس کے بعد ہم نے گونے کو بھی اسی فوارے کے قریب الوداع کہا تھا جب وہ کالج کے اپنے پہلے سال کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے تیراکی کے Fins، اس کا گہرا نیلا نہانے کا لباس اور حسن کی پلے بوائے کی کاپیاں اسی زمانے کی ہیں۔

برسوں بعد، بہت سی تباہی اور بہت سی یادوں سے گزرنے کے بعد، جب میں نے دوبارہ گھر کو کھولا، پلے بوائے کے ان میگزینوں کو فرش پر اور ان Fins کو باتھ روم میں دیکھ کر میں لڑکھڑا گئی۔ نہ صرف اس لیے کہ میگزین میں لڑکیوں کی تصویروں سے کسی نے خود کو تسکین پہنچائی تھی بلکہ کسی اور وجہ سے...... کسی اور وجہ سے...... کیوں حسن جسے اپنی نامردی کی بہت پرواہ تھی، اس نے اپنے ایک انسان ہونے کی کوئی پرواہ نہ کی تھی؟

یہی تھا جس سے میں گزری تھی۔

حسن نے کوئی نہاں یا خفیہ جنسی قوت کے حصول کے لیے عورتوں کی ان تصویروں میں پناہ حاصل کی تھی...... یہ کیسے ہوسکتا ہے، کیا حسن تھا جس نے نسلِ انسانی کا دفاع کیا تھا؟ گونے اور محمت ان تصویروں کے خلاف ایک دفاع تھے۔ جانے بغیر، اس سے آگاہ ہوئے بغیر۔ ان کی بے حد اچھی خالص دوستی میں جسے ابھی پیش گوئی کی صلاحیت حاصل نہ ہوئی تھی، کچھ ایسا تھا جس نے مجھے اور حسن کو، ہمیں متنبہ کرنے کی بجائے، الگ کر دیا۔ ایسا بالکل تھا۔ دوسری صورت میں میرے لیے ان چوبی فرشوں پر ان پلے بوائے کے پھٹے ہوئے صفحوں کو دیکھنا اس قدر کرب ناک اور تکلیف دہ نہ ہوسکتا تھا۔

وہ چشمے کا پانی تھے: گونے اور محمت۔ وہ چلے گئے۔ جب وہ چلے گئے تو ہم نے جانا کہ ہمارا جنسی ماضی تمام سمتوں سے اور اب کچھ بھی نہ رہا تھا...... اسی طرح جیسے ہم ربر بینڈ کو دونوں طرف سے پکڑ کر کھینچتے اور کھینچتے چلے جا رہے تھے۔ ہم تقریباً الگ ہونے والے تھے۔ ہماری فرسودہ خراب پوزیشن سے، بالکل وہاں سے۔ ہم ٹوٹ کر الگ ہو رہے تھے۔ حسن مجھے اکیلے چھوڑتے ہوئے اپنے لیے نئی طاقتوں کی تلاش میں چٹانوں کو جلا جھلسا رہا تھا، میں اسے اکیلے چھوڑ رہی تھی۔ میں نے آواز تک نہ نکالی۔ اٹھو حسن! جو سکھایا جا چکا ہے اسے توڑ دو، اس کنکریٹ کو توڑ دو! یہ، وہاں نہیں۔

اب اس لمحے حسن کے تبصروں میں سے ایک کسی دھماکے کے ساتھ میرے دماغ میں آتا ہے: ''ہم معاشرے کو ایک خوب صورت فرد دینا چاہتے ہیں لیکن معاشرہ ضربیں لگاتا، مارتا، قتل کرتا ہے اور ہم یہ بھی نہیں بتا پائے کہ ہم کہاں اور کیوں اپنے بیٹوں، اپنی بیٹیوں کو کھودینے والے ہیں۔''

کوئی بھی سمجھ نہیں پایا کہ ایک بڑا خوف، یہ خوف حسن کے لاشعور میں جگہ بنا چکا ہے۔ نہ میں اور نہ ہی وہ۔ بہادری اور نامردی کے اس کے شعور نے اس طرح اپنا دفاع کیا، جس کی جنسی طاقت تہ و بالا ہو چکی تھی۔ چھپنے کے ذریعے۔ آپ جانتے ہیں، اس کے بعد سے ہم ایک آبجیکٹ تھے، کوئی شے۔ نہ خوف، نہ پسپائی، تب ہم اس مقام سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے جہاں ہم ٹوٹ پھوٹ چکے، فرسودہ ہو چکے تھے اور ہم نے زندگی کو کسی بھی لمحے ٹوٹنے، تڑخنے اور بکھرنے کے لیے تیار چیز کی طرح آسان بنا دیا۔ ہم نے اسے صرف ایک لائن تک محدود کر دیا: جنس۔ اور زندگی تیزی سے مزید پیچیدہ ہو رہی تھی۔ اس پیچیدگی نے ہمیں یہ جاننے سے روک دیا تھا، حتیٰ کہ سمجھنے سے بھی روک دیا تھا کہ ہمارا بیٹا کیوں مر گیا تھا؟ انتہائی اہم لمحات کو نظر انداز کرتے ہوئے، چھوڑتے ہوئے، یہ کھوج نہ لگاتے ہوئے کہ انتہائی نازک تاثرات اور الفاظ کی تہ میں کیا تھا، ان کی قدر و قیمت محسوس نہ کرتے ہوئے یوں جیسے ہر کوئی، کوئی خالی سانچا تھا، اس کی اہمیت کو نہ جانتے ہوئے ...... اور سال کے بدلنے پر، نئے سال کی چھٹی کے اس موقع پر، موت کا کوئی ایک تذکرہ بھی نہ تھا۔ یہ ہم سے مطمئن نہ ہو سکا، یہ ہمیں اکیلا چھوڑ دیتا...... جب تک گو نے نئے سال کی چھٹی پر آیا، میں حسن سے علیحدہ ہو چکی تھی۔

سال کا بدلنا۔ نئے دنوں کی آمد۔ اس تبدیلی پر چھٹی۔ گو نے کے سامنے اس کی وضاحت ضروری تھی۔ بحیرۂ روم کا سورج ہنستا ہے، مذاق اڑاتا ہے، خوش ہوتا ہے، جلتا ہے، جھلساتا ہے...... بوڑھا Triton اپنی بانسری بجاتا ہے...... اور اس موت کو جو جلد یا بدیر آئے گی، اخفا میں رکھتا ہے۔ گرم ریت اور چٹانیں ہمیں ہماری ابدیت، بے وقوفی، دھوکا دہی کا بتاتی ہیں، ہمارے سامنے جھوٹی زندگی پیش کرتی ہیں اور ہمیں قیمت چکانے پر مجبور کرتی ہیں۔ جہاں تک خوابوں کی بات ہے، وہ ضروری ہیں۔

ہم نے گو نے کو بتا دیا تھا۔ علیحدگی کے بارے میں۔ ہمارے الگ ہونے کے بارے میں۔ اس کا چہرہ لمحے بھر کو کسی نقاب تلے چلا گیا تھا، کہر کے پیچھے، پھر اس صبح اس کمرے میں سورج

کی کرنوں کی طرح پھٹ پڑا، وہ ابھریں اور ان دیواروں پر پڑیں جو ہمیں قید کیے ہوئے تھیں: وہ ہنس دیا۔

وہ صرف ہنس دیا۔

نئے سال کا ڈنر ہم تینوں نے اکٹھے کیا۔ کل، آج، مستقبل، کسی بھی چیز کے بارے میں بات کیے بغیر۔ اپنے بیٹے کو ذرہ برابر اعتماد، مستقبل کے نام پر ذرا سا اشارہ بھی دیئے بغیر۔ تین پرانے شناسا جو ایک رات کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ ہم ایک طرح یہ بالکل بھی نہیں جانتے تھے کہ اتنے برسوں بعد اس پہلی ملاقات پر کیا بات کریں۔ وقت نے سب کو تبدیل کر دیا ہے۔ ڈر یہ تھا کہ اگر انہوں نے بات کی تو وہ دوبارہ کبھی نہ مل پائیں گے۔

حسن آخر کار دو روز بعد تب اس سے بات کرنے کے قابل ہو پایا تھا، جب گو نے سکول واپس جا رہا تھا۔ وہ زیادہ باتیں سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے صرف ایک بات کہی تھی، ''دونوں میں سے کوئی بھی قصوروار نہیں۔ کیوں کہ سب کچھ بے حد پوشیدہ ہے۔''

میں نے یہ حسن کی آواز میں سنا۔ جب اس نے مشرق کو اپنی نئی نوکری کے لیے جانے سے پہلے مجھے فون کیا: ''کوئی احساسِ جرم نہیں ہے، کوئی بھی قصوروار نہیں ہے، کیوں کہ سب کچھ بے حد پوشیدہ یا تاریک ہے۔''

اور پھر بھی میں نے یہاں پہلی شب کو سوچا کہ یہ گو نے کی آواز تھی، جب میرے اندر کی گنگناہٹ باہر لہروں کے شور سے مل گئی تھی۔ میں آگے بڑھی اور اس کے بستر کو دیکھا۔ وہ آواز جاری رہی: ''آپ کا ایثارِ ذات، وہ گرم جوش خاندان کی چار دیواری جو بڑی توجہ اور دیکھ بھال سے تیار کی گئی تھی، وہ بھی بچوں کو خوش و خرم زندگی نہ دے سکی۔ شک، تاریکی، موت ...... ہر طرح سے کسی خوش حال زندگی کی توقع نہ تھی، کسی آسان اور تیار مستقبل کی توقع نہ تھی۔ لیکن کسی انتخاب کے بغیر رہ جانا، لیکن اس میدان میں پرچم آگے کسی اور کو تھما دینا جہاں حتیٰ کہ اس کے مُردے بھی گل سڑ چکے ہوں، یقیناً آپ کے لیے ناقابل برداشت ہوگا......''

اس نے یہ سب حسن سے کہا تھا اور پھر وہ ہنس دیا تھا: ''بہت اچھے۔ میں پرچم اور ذمے داری دونوں اٹھا رہا ہوں۔ لیکن میں یہ کام اس حکم سے شروع کروں گا جو ہم سب کو بہت اچھا لگے گا۔

بہار میں، آئیں ہم سب آخری مرتبہ اکٹھے جمع ہوں، نیچے جنوب میں، بحیرۂ روم پر۔ آیئے وہاں ملتے ہیں۔ یوم نونہال (قومی خودمختاری اور نونہالوں کا دن ترکی میں ہر سال 23 اپریل کو منایا جاتا ہے، یہ ترک جنگ آزادی کے دوران 1920ء میں ترک قومی اسمبلی کے افتتاح کی یاد دلاتا ہے: وضاحت) پر میں وہاں آپ دونوں کے لیے ایک تقریب رکھوں گا۔ ریکارڈ شدہ میوزک کے ساتھ......"

ریکارڈ شدہ موسیقی...... ایک بالکل ذاتی زندگی۔ محمت اور وہ سر جوڑ کر اس میں داخل ہوئے تھے۔ ایک بے حد حساس، بے حد مسخری، بے حد مشتعل، بے حد دردمند، بے حد متحمل، بے حد بے صبری، بے حد شکست خوردہ، بے حد مفرور، بے حد خطاوار، بے حد شکایتی، بے حد خوش باش، بے حد آزردہ، ملول، بے حد نرم گفتار، بے حد پُرشور دنیا، ٹیپ کے ٹکڑے یوں جیسے ایک دوسرے کا پیچھا کرتے، ایک دوسرے کے سامنے آ جاتا، دوسرا اس کے نیچے رہتا، نیچے رہنے والا اچانک ابھرتا اور اوپر آ جاتا، بالکل تب جب آپ موسیقی کے کسی پُرسکون کرنے والے مصرعے پر "آہ" کہنے والے ہوتے، ایک چیخ آپ کو ہلا کر رکھ دیتی، ایک چڑھتا ہوا سُر جو سکون کی اجازت نہ دیتا تھا، ہنسی کے بعد سسکیاں آ جاتیں، مسکراہٹ کے بعد آنسو، آنسوؤں کے بعد جشن کی پُرمسرت دُھنیں آ جاتیں۔ وہ سب ایک دوسرے میں قطرہ قطرہ رِس جاتے، سرایت کر جاتے ایک دوسرے کے ٹشوز میں، یہ سارا انتشار، افراتفری ایک عجیب متوازن و مکمل حصہ بن جاتا۔ زندگی کی طرح۔

بعد میں گونے نے مجھے لکھا تھا: "آپ پہلے چلی جائیں، گھر کھولیں۔ میں یہاں سے وہاں پہنچ جاؤں گا، آپ کے پیچھے......"

ہم پہلے آ گئے اور گھر کھولا۔ لیکن وہ ہمارے پیچھے نہ آ پایا اور اب بھی کوئی نہیں جانتا کہ کون...... وہ، اپنے دل میں سوراخ لیے، سڑک کے ایک کونے پر۔ یہ کہ موسیقی سے محبت کرنا، ان ٹکڑوں کو جمع کرنا جرم تھا...... کوئی کچھ نہیں جانتا۔ بیوہ Saverini کون ہے، یہ Semillante نام والا کتا کیا ہے، کون سا دیوانہ موپاساں جس نے سوچا کہ گونے جس نے کبھی خون نہ بہایا تھا، سارڈینیا (Sardinia) کے بے رحم، کھردرے، نامناسب ماحول میں Longosardo کے اس گاؤں میں ایک قسم کے نکولس کے لیے موزوں تھا؟ اس نئی کہانی کو، اسے نئے "Vandetta" کو کس نے بُنا تھا؟...... کوئی کچھ نہیں جانتا۔

اس لمحے جب میں یہ کچھ بتا رہی ہوں، میں ویسی نہیں ہوں جیسی میں اپنی پہلی رات تھی۔ میں بالکل پُرسکون ہوں۔ زیادہ سے زیادہ میں اس طرح ہوں جیسے میں نے کل صبح محمت کے ساتھ ہی گونے کو بھی الوداع کہہ دیا ہے۔ دوبارہ، اسی جگہ پر، فوارے کے سامنے......

ہم نے گھر پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ لیکن ہم نے پانی کا مین والو کھول دیا تھا، ہم نے یقیناً والو کھول دیا تھا۔ اس مرتبہ جیسے ہی میں باتھ روم میں داخل ہوئی، میں نے دیکھا: حسن، اس مرتبہ بھی پانی کا مین والو بند کرنا بھولا نہیں تھا...... جب ہمیں تب استنبول بلایا گیا تھا تب وہ کیسے پانی کا والو بند کرنا نہیں بھول پایا تھا...... آؤ، لاش لے جاؤ!...... جب ہم دیوانگی کے عالم میں واپس لوٹ رہے تھے؟

تقریباً تین برسوں بعد، اس لمحے سے شروع کرتے ہوئے جب میں نے اس گھر میں قدم رکھا تھا، یہ واحد سوال تھا جو میں پوچھے چلے جا رہی تھی۔ گھر میں کون گھسا تھا، انہوں نے کیا کیا تھا، انہوں نے اس سے کیا کیا تھا؟ میں کچھ ڈر گئی تھی، کسی قدر خوف زدہ ہو گئی تھی...... پھر یہ چیزیں مکمل طور پر مٹ گئی تھیں۔ کچھ لمحے تھے جب میں گونے کی نیلی جینز کو، اس کے تیراکی کے Fins، اس کے وہاں اس مقام سے سمندر میں اترنے، اس کے چٹانوں سے جڑی بوٹیاں اکھاڑنے، اس کے غاروں میں گم ہونے کو بھول گئی...... میں ہمیشہ اسی طرح محسوس کرتی، میں سوچا کرتی کہ وہ ان سمندری غاروں سے کبھی واپس نہ آئے گا...... اور اس غار سے وہ کبھی واپس نہ آیا۔ لیکن میں والو کو نہ بھلا سکی۔ جب حسن آتا تو میں اس سے یہ پوچھنے والی تھی، میرا دماغ اس میں اٹک چکا تھا۔ میں پوچھنا اور پوچھتے رہنا چاہتی تھی، میں ہمیشہ یہ اور یہی پوچھنا چاہتی تھی۔ جب وہ خبر آئی...... جب گونے تاریکی میں گم ہو گیا...... وہ کیسے پانی کا والو بند کرنا نہیں بھولا تھا؟

میں گونے کے بعد زندگی کے لیے جو بداعتمادی، شبہ محسوس کرتی تھی، اس کی تصدیق ہو چکی تھی۔ پانی کا یہ والو، جو بظاہر سب سے کم اہم شے تھی، اس نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ میں حتیٰ کہ گھر چھوڑ کر فرار ہو جانا چاہتی تھی، اسی وقت واپس چلی جانا چاہتی تھی۔ میں نے حسن کو آخر مدعو ہی کیوں کیا تھا؟ ہمارے لیے خوب صورت چیزوں کا تجربہ کرنا ممنوع ہو چکا تھا۔ اندھیرا ہمارا منتظر تھا، شک وشبہ اور تاریکی...... خدا کرے کہ حسن نہ آئے، خدا کرے کہ کوئی نہ آئے، خدا کرے کہ میرے

خواب مجھ تک ہی رہ جائیں، خدا کرے کہ انہیں نقصان نہ پہنچے!......

یہاں، بہت سے برسوں کے بعد میری پہلی رات، خواہش اور فرار کے درمیان مدوجزر میں تھی۔

پھر وہ آ گئے۔

یہاں اپنے خوف کے عروج پر، میں حسن سے نہیں ملنا چاہتی، میں اس سے یا کسی سے، کسی سے بھی نفرت نہیں کرنا چاہتی!

بھاگ جانا آسان ترین ہے۔ میرا سب سے بڑا بہادرانہ اقدام یہاں کھڑے ہونا اور انتظار کرنا ہے۔ انتظار کرنا، آمنے سامنے آنا اور پوچھنا۔

ایک روز جب باتھ روم کا سنک بند ہو گیا تھا...... جب حسن اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے سنا کہ اس نے محمت کو جو اس کی مدد کے لیے مشتاق تھا، کہا، ''جب گونے کی اطلاع آئی، میں یہیں تھا۔ میں پانی کا مین والو کھولنے والا تھا۔ لیکن اسے کھولنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ دیکھو، مجھے اب یاد آیا۔''

پھر سوراخ میں پمپ کے شور کے سوا کوئی ایک آواز ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا......ضرور محمت نے اپنی پوری گرم جوشی سے حسن کے بازو کو چھوا ہوگا...... میں نے خود کو مرکزی دروازے کے سامنے کنکریٹ کی سلیب پر گرا لیا۔ میں اس روشن سفید دیوار تلے تھی جہاں مجھے کوئی بھی حتیٰ کہ یوسف بھی کسی سمت سے نہ دیکھ سکتا تھا، لیکن میں خود اپنے آپ کو اچھی طرح بالکل واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ میں رونے لگی۔ وہ اس طرح کا رونا تھا جیسے واقعی میرا دم گھونٹا جا رہا تھا، جیسے بحیرۂ روم کے سورج تلے نوکیلی چٹانوں پر کوئی میرا سینہ چیر کر میرا دل باہر نکال رہا تھا۔ چٹانوں کے وہ نوکیلے کھردرے کنارے اس دل میں گھسے چلے آ رہے تھے اور بے حد تکلیف دے رہے تھے۔ یہ عجیب تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دل، کسی اور جگہ کسی دوسری روشنی میں مجھ سے الگ کھڑا، مجھے بے حد تکلیف دے رہا تھا، ناقابل برداشت طریقوں سے مجھے تکلیف پہنچا رہا تھا۔ مجھے کاٹ ڈالا گیا تھا، مجھے کاٹ ڈالا جا رہا تھا۔

حسن، مجھے معاف کر دو! مجھے معاف کر دو حسن!...... مجھے معاف کر دو......تمام نسل انسانی مجھے معاف کر دے!......میں تم سب سے معافی مانگتی ہوں......

یہ محسوس بھی نہ کرتے ہوئے کہ چٹانیں میرے ننگے پیروں کو تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ میں پاگلوں کی طرح ان چٹانوں سے نیچے بھاگ گئی تھی اور خود کو اس کے جنوبی سرے والے گہرے پانی میں پھینک دیا تھا۔ میں نے سوچا ہوگا کہ اپنے دل کو جھلسنے سے بچانے کا یہ واحد طریقہ تھا۔ میں سارا وقت نامعلوم میں ہی زندہ رہی تھی۔ میرا بیٹا کیوں مر گیا؟ میں اس زندگی سے اس قدر انجان کیوں رہی جو میں نے اسے دی تھی؟ میں نے سوچا تھا کہ حتیٰ کہ اس لمحے بھی حسن والو بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

کھارا پانی میرے پیروں کے تلووں میں لگے زخموں کو جلانے لگا۔ اب میں پوری طرح باخبر ہوں: نہیں، میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں ان شعلوں کو بجھانا چاہتی تھی جو مجھے جھلسا رہے تھے۔ کسی بھی ممکنہ طریقے سے تکلیف کو ختم کرنا۔

میں نے راس کا چکر لگایا اور گھر کے پیچھے کھاڑی تک آ گئی۔ میں بے حد تھکی ہوئی تھی۔

وہ سب، اپنی آوازوں میں گہری فکر لیے ہوئے، پورے جزیرہ نما میں پھیل کر مجھے پکارتے۔ میں ان کی جانب ہاتھ ہلاتی۔ میں حتیٰ کہ مسکرا دیتی، ''میں یہاں ہوں!''

ان کی سانسیں بحال ہو جاتیں۔

وہ صرف دوآن تھا۔ یہ صرف دوآن ہوگا، جو جانتا کہ میں جھلستا ہوا دل لیے پانی سے باہر آئی تھی۔ دوآن تکلیف و غم سے سب سے زیادہ خوش ہو سکتا ہے، غم کے ذریعے زندگی کے معنی سب سے زیادہ تلاش کر سکتا ہے۔ میں غلط نہیں ہو سکتی۔ وہی تھا، جو قریب ترین آیا تھا، ایک بار اور وقت پر، میرے اندر کے سب سے بڑے اِن کہے غم کے نزدیک۔ وہی تھا جو اس غم کی محبت میں گرفتار ہوا۔ اور یہ اس غم کے لیے صرف رات تھی...... جب میں تنگ ساحل پر منہ کے بل لیٹی ہوئی تھی، میں اس بارے میں سوچ رہی تھی۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں اور میری تاریکی میں عنبر کے شرارے لپکنے لگے تھے، کسی بیداری کے عمل کی طرح......

میرے دنوں میں جب، اپنا توازن کھو کر، میں خود کو اِدھر اُدھر ٹکرا اور گرا رہی تھی......

کچھ بھی کافی نہ تھا۔ نامعلوم، انجان نہیں جا رہے تھے، ابہام واضح نہیں ہو رہا تھا اور کام بالکل بھی کافی نہ تھا، پانی اپنی تہ کی طرف واپس نہ آ رہے تھے، ڈیم کی دیوار تباہ ہو گئی اور کسی طوفان کی طرح سیلاب امڈ آیا......

آخر کار میں دوآن کے شکست خوردہ بازنطین چلی گئی۔ میں دوآن کو کال کرنے والی تھی لیکن میں نے نہ کی۔ میں اسی وقت واپس جانے کو تیار تھی جس لمحے میں استنبول پہنچی۔ تب بھی میں پہاڑوں پر چڑھتی اترتی، پل عبور کرتی اور پھر واپس لوٹتی رہی، کسی جانے پہچانے ہوٹل کے سامنے رکتی اور پھر کمرا حاصل کرنے کے فیصلے سے پیچھے ہٹتی رہی۔ میں صبح کے وقت پہنچی تھی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ میں نے خود کو تباہ کرنے کی حد تک تھکا ڈالا تھا۔ میں دوبارہ ایک جانے پہچانے ہوٹل چلی گئی۔ میں نے کمرا لے لیا۔ سونے سے پہلے میں نے دس بار دوآن کو فون کرنا چاہا اور دس بار ہی میں بھول گئی۔ اسے بھلا دیا جاتا۔ کیوں کہ اب ہم بالکل مختلف جگہوں پر تھے۔ ہم ایک سے پانیوں میں نہیں تیر رہے تھے......

میں سو گئی۔

اور صبح کو میں نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ میں واپس جانے والی تھی۔ یا میں بہت دُور ادرنہ (Edirne) جانے والی تھی۔ میں نے اس میں سے کچھ بھی نہ کیا۔ میں نے مشرق میں کارس (Kars) جانے کی ٹرین بھی نہیں پڑی۔ میں گونے کے سکول چلی گئی۔ میں ان سب پہاڑیوں، ان سب سڑکوں سے گزری جہاں سے وہ گزرا ہوگا۔ میں تمام کافی شاپس کے اندر گئی اور ہر کوشک کے سامنے رکی جہاں شاید وہ رکا ہوگا۔ میں ان تمام بس سٹاپوں پر رکی جہاں وہ کھڑا ہوا ہوگا۔ میں کسی بھچ کاگ، کسی بھس بھرے جانور کی طرح اس بڑے سے شہر کے عین درمیان کھڑی ہوئی تھی۔ کوئی بھی بات نہیں کر رہا تھا۔ ہر کوئی چپ تھا۔ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

میرے شہر جانے اور واپس آنے کے بعد یہاں میری پہلی صبح مَیں تیراکی کے لیے چلی گئی۔ تب بھی مجھے یاد آیا میں جانتی ہوں۔ تب بھی مجھے دیکھا جا رہا تھا یا میں اپنے آپ کو اپنے سے بیزار دیکھ رہی تھی۔ جب میرے پیروں کے تلوے...... یا میرا دل...... زخمی تھے اور میں اسی ساحل پر اوندھی لیٹی تھی، حتیٰ کہ تب بھی جب دوآن کی نگاہ میری تاریکی میں چکرا رہی تھی، میں اس بارے میں شک میں تھی کہ آیا میں اسے اپنے پاس چاہتی بھی تھی یا نہیں...... ہمارے ساتھ...... ان ساحلوں پر۔ میں نے اسے مدعو کیا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ خواہش کی طاقت...... زندگی کے دفاع کی طاقت...... جس نے مجھے میرے کریٹ سے باہر نکال لیا تھا، جیسا کہ کوئی بیان کرسکتا کہ وہ بڑا، خواب کا

سا انتظار میرے اندر موجود خوف میں غرق ہو گیا تھا۔ اب میں اس مقام پر تھی جہاں میں نے دوآن کو چوک کے کنارے پر، بس ٹرمینل کے قریب شام کے دھندلکے میں اتفاقیہ پالیا تھا۔ میں ہوسکتا تھا وہاں پانچ منٹ بعد پہنچتی اور ہوسکتا تھا کہ دوآن اس روز سر شام کھلنے والی ان کافی شاپس پر نہ گیا ہوتا، جہاں وہ اب کبھی کبھار ہی جاتا تھا اور ہوسکتا تھا کہ وہ واپسی کے لیے اس فٹ پاتھ کا انتخاب نہ کرتا...... خاموش خزاں کی دھوپ میری کمر کو سہلا رہی تھی...... میرا چہرہ ریت سے اٹا تھا اور آنکھیں سختی سے بند تھیں...... وہ جھٹ پٹا تھا، ہاں۔ میں وہاں تھی، آپ جانتے ہیں۔ بس ٹرمینل پر۔ میرے پیچھے سے ایک بازو میری کمر کے گرد حمائل ہو گیا۔ ایک بازو نے مجھے زور سے بھینچ لیا، یہ یقین دلاتا کہ ایک سہارا کہ میں اس زمین پر نہ گر جاؤں۔ وہ دوآن کا بازو تھا۔ میں اس کا چہرہ زرد بے زندگی روشنی میں دیکھ چکی تھی۔ اس کے منہ سے ایک آواز ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ جب میں اچانک مڑی تو میں وہ چہرہ دیکھ چکی تھی...... جب میں ریت پر لیٹی ہوئی تھی تب بھی میں نے اسے دیکھا تھا...... یا جب میں نے سورج کی جانب پشت کی اور اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں...... اس کی نگاہ میں جو مسلسل گہرے بادلوں میں ڈھکے آسمان کی یاد دلاتی تھی، ایک کے بعد چمکتے ہوئے بجلی کے کڑکے تھے۔ وہ بجلی کی ایسی کڑک تھی جو اُن نہ ختم ہونے والی بارشوں کی خبر دے رہی تھی جو اس آسمان سے کچھ دیر بعد برستیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے حتیٰ کہ بادلوں کی گرج بھی سنی تھی۔ اگرچہ اس نے ایک سوال بھی نہ پوچھا، میں نے کہا تھا، ''میں اب واپس جانے والی تھی...... ''میں اب واپس جانے والی تھی...... اب میں واپس جانے والی تھی......

گرج چمک جاری رہی۔ مجھے خیال ہوا کہ میں نے بادلوں کی گرج سنی تھی لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ وہاں کوئی آواز نہ تھی۔ وہاں صرف بازو تھا، دوآن کا بازو۔ وہ سارا وقت میری کمر میں حمائل تھا۔ وہ مجھے لے جا رہا، گھسیٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب ہم چوراہے میں آئے، میں نے اس کی آواز سنی، '' آؤ میں اور تم کہیں بیٹھیں اور کچھ کھالیں۔ آؤ بات کرتے ہیں۔ آؤ بہت سی باتیں کرتے ہیں۔ ہر چیز کے بارے میں۔ آؤ ہمارے اندر بندھی گرہ کھولیں۔ مجھے اس کی اور تمہاری اس قدر ضرورت ہے نوین...... ''

ایک دوآن جو ہر طرف سے ایسی ہمدردی اور مہربانی سے سجا ہوا تھا، اکثر لوگ بھول چکے

تھے، جنہیں ایسی کسی چیز کا وجود بھی یاد نہیں تھا۔ وہ اپنی ہمدردی میں زیادتی بھی نہ کرتا۔ اگر وہ ایسا ہوتا تو اسے ڈر ہوتا کہ وہ اچانک ان تباہ کن دنوں کے خلاف بغیر کسی دفاع کے ہو سکتا تھا، جن کا اس نے تجربہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے۔ وہ اپنی مہربانی کو ٹھیک جگہ، ٹھیک وقت پر بچا لیتا۔ کسی جاگیرداری کے ملکیتی کسی صندوق کی طرح۔ ان لوگوں کے لیے بچائی گئی کسی اچھے مشروب کی بوتل کی طرح جو اس کی قدر جانتا ہو اور پہلے سے جانی گئی فراخ دلی کے ساتھ اسے پیش کیا جائے...... اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ اس بڑے، شکست خوردہ بازنطین میں دنوں، مہینوں، برسوں تک ایک فریب یا سراب کے ساتھ اپنی زندگی جاری رکھنے کے قابل نہ ہو پاتا...... اچانک کسی تحفظ کے بغیر رہ جانے کو...... جس پر وہ قابو نہ پا سکتا تھا۔

جیسے ہی دوآن نے کہا، ''آؤ میں اور تم کہیں بیٹھیں اور کچھ کھا لیں''، مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا کہ میں نے شاید ہی کچھ کھایا تھا۔ لیکن مجھے یاد نہ رہا۔ میں دوآن کے اچانک وہاں سے گزرنے جہاں وہ مجھے تھام سکتا، اس کی مہربانی کا سوچتے ہوئے اپنے خیالوں میں گم تھی، واپسی کے بالکل آغاز پر، جب شام کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ اور پھر میں اس لمحے تک کہیں بھی، کسی کے ساتھ اپنے پناہ تلاش نہ کر پانے کے خیال میں گم تھی۔ میرے اپنے گم ہو جانے کا احساس۔ میں واضح طور پر سمجھ چکی تھی کہ میں بلاشبہ ایک لمبے عرصے سے اسی طرح تھی، جب ہم نے گونے کو کھو دیا، اس سے بہت پہلے سے۔

خط کی سطروں میں، فون پر سنی گئی آواز میں، سینسر شپ کے قابل لفظوں میں سب کچھ چھپا ہوا ہی رہا تھا۔ ہم ان تاریخی دستاویزات کی طرح تھے جنہیں تالے چابی میں رکھا جاتا ہے، خارجہ امور، داخلی امور کی وزارتوں کی آرکائیو کی الماریوں کی طرح۔ یہ حقیقت کہ لوگ ہر لمحے ایک دوسرے سے فاصلے پر جا رہے تھے، یہ کہ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھنے سے گریزاں تھے، زمین میں بوڑھے خون، گلے سڑے گوشت کی بُو، چھپائے جا رہے تھے۔ ہم خود اپنے آپ کو چھپا رہے تھے۔ ہم چھپے رہنے، تالے میں رہنے کے اس قدر عادی تھے کہ ہم مزید کھل کر سامنے آ نہیں سکتے تھے، صرف خود اپنی ذات ہوتے ہوئے، ان خطوں میں، فون پر، پھیری ہوئی نگاہوں سے آمنے سامنے آتے ہوئے۔ ہم زمین میں سات منزلوں تک دفن قدیم شہروں کی طرح تھے۔ اگر وہ کھدائی میں ہمیں تلاش کر لیتے اور سورج کی روشنی میں لے آتے، ہم میں سے ہر کسی کو

کسی کھنڈر کے طور پر ہی دیکھا جاتا۔ ایک گونگا کھنڈر جس میں کوئی استر کاری یا فریسکو تھے نہ ہی لوح یا نوشتے...... میری سب کچھ بتانے کی کوششیں شاید اسی وجہ سے ہیں...... بلا شبہ ہم جیے تھے، زندہ رہ چکے تھے، یہ کھدائیوں سے واضح ہے کہ ہم کبھی زندہ تھے۔ زندگی کے تب کیا معنی ہیں جب اس کا تالہ ٹوٹا ہوا نہیں ہے، جب اس کا کارک کھولا نہیں گیا، جب اس نے خود کو زندگی سے نہیں جوڑا؟ ہم وہاں نہیں تھے، ہم کبھی وجود نہ رکھتے تھے۔

دوآن کا میری کمر میں حمائل بازو، وہ گرج، کہہ رہی تھی کہ یہ سچ نہ تھا۔ میری غلط فہمیاں۔ اگر وہ دوآن سے متعلق نہ ہوں تو دوسروں کے متعلق ہوں گی۔ لیکن کیا میں واقعی غلط تھی؟ کیا ان ساحلوں پر زیادہ تر دوآن کے ساتھ تمنا سچ میں بدلنے والی تھی، کیا خالص پن اور صاف گوئی آخر کار ہماری تاج پوشی کرنے کو تھے؟ کیا وہ زندگی کے ساتھ شامل ہونے والے تھے؟...... میں ریت پر تھی۔ میں اپنا چہرہ سورج کی جانب موڑ رہی تھی...... دوآن جسے لوگوں میں سب کے ساتھ اکٹھے رہنے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، ڈھلان پر بید کے درخت کے ساتھ، میرے بالکل قریب ظاہر ہوتے ہوئے، یہ دوآن میری پہلی رات کے چھوڑے گئے میرے اندر سے سارے خوف مٹا رہا تھا۔ یادوں کے نشانات، ناممکن پن کا احساس...... سب اس اتفاق سے پیچھے رہ گیا تھا جس نے ہمیں اس رات ملایا تھا......

ہم ایک ریسٹورنٹ گئے جہاں ہماری ریڈ وائن میں عنبر کی دھاریاں تھیں۔ وہ ایک بے حد خوب صورت جگہ تھی۔ روشنیاں تیز نہیں تھیں۔ ایک روشنی جس نے آنکھوں کو تکلیف نہ دی کہ چہروں، نگاہوں، ان کے اندر موجود معنی کو چھپایا جائے۔ ایک روشنی جس نے ہمیں ایک دوسرے کو، خود ہمیں، واضح طور پر دکھایا۔ میوزک بھی ایسا ہی تھا۔ تاکہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اس موسیقی کے قابل ہونے کی کوشش کرتے جس نے انہیں خوش کر دیا تھا۔ وہ خود کو اس کا پابند محسوس کرتے۔ ''یہاں عمومیت یا معمولی باتوں کو خوش آمدید نہیں کہا جاتا!'' یہ سائن اس جگہ کے دروازے پر لٹکایا جانا چاہیے تھا، جہاں ہم بیٹھے تھے۔ اسے کیوں نہ لٹکایا گیا، اس کی وجہ عمومیت سے بالکل دُور رہنا تھی۔

میں نہیں جانتی۔ شاید وہ ایک عام سی جگہ تھی...... معمولی سے بھی بدتر: ''میرچ کو معلوم

مت ہونے دینا کہ یہ رات اس قدر خوب صورت اس قدر تسکین بخش تھی، ٹھیک ہے نوین؟''......
پہلے پہل وہ جگہ میرے لیے اس قدر مسرت بخش دکھائی دی گئی، میری دوآن سے ملاقات کے
غیر معمولی واضح پن کی وجہ سے۔

وہ غیر معمولی واضح پن یہاں تک بھی جاری ہے۔ یہ حتیٰ کہ مزید خالص ہو گیا۔ یہ مقطر پانی
کی طرح تھا۔ مقطر، صاف کیا گیا پانی...... کیا یہ نہ جینے کے احساس کا منبع ہوسکتا ہے جو مجھے وقتاً فوقتاً بھر
دیتا ہے جب میں اپنی کہانی سنا رہی ہوتی ہوں؟ یا پھر یہ بتدریج اپنا اثر کھوتا ہوا خواب ہے؟ یا شاید
جیسا کہ میں نے کبھی کسی سے سنا تھا ایک بار، گندگی اور خوشی کے درمیان واقعی کوئی قریبی تعلق تھا......
نہیں۔ اس مقطر پانی کا بے ذائقہ ذائقہ بھی میرے تالو سے چپکا ہوا ہے، آپ جانتے ہیں۔ میں نے
اسے دوبارہ محسوس کیا جب میں اس تنگ ساحل پر ہماری چھوٹی سی کھاڑی کے ساحل پر، نمکین پانی
سے جلتا ہوا اپنا دل لیے، اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی۔ دوآن بید کے درخت تلے تیزی سے ڈھلان
سے اترا اور میری جانب آیا۔ اس کی نگاہ ہمیشہ مجھ میں غوطہ لگاتی، یہ دیکھتی کہ وہاں کیا ہو رہا تھا......
جیسے اس کی کھڑکی تک آنے کے عادی کسی پرندے نے اسے کچھ دیر کو چھوڑ دیا تھا اور پھر لوٹ آیا تھا:
''کیا میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ مجھے تمہاری کس قدر ضرورت ہے؟''

اس نے یہ کہا۔ اس نے تھوک نگلی۔ وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرا
ہاتھ تھام کر مجھے اوپر کی طرف کھینچا۔ ایک مرتبہ پھر۔ اس نے مجھے تلاش کیا اور کسی ملبے تلے سے، خود
ہمارے اپنے کھنڈرات سے مجھے نکال لایا۔ اس نے مجھ پر سے گرد جھاڑی۔ میں نے خود کو سانس
لیتے محسوس کیا۔

''آؤ، ہم آبشار کی طرف جا رہے ہیں۔''

ہمیشہ اسی غیر معمولی وضاحت کے ساتھ۔ پہاڑوں سے ابلتے ہوئے چشمے کی آوازیں
اور حسن پہلے ہی ہمارے قریب تھا۔ ''محمت اور میں نے بند سنک کھول لیا۔ اب تو پائپ میں سے تم
بھی گزر سکتی ہو۔'' وہ کہتا ہے۔

میں نے حسن کی ایک بالکل نئی جہت معلوم کی۔ اس کا خود میں سکڑنا سمٹنا ختم ہو چکا ہے
اور ہر بار جب وہ خود میں دست بردار ہوتا، اب وہ اپنی نامردی کی مبالغہ آرائی بھی نہیں کرتا ہے۔ وہ

زندگی کو ہر وقت ہنسی مذاق میں بدل دیتا ہے۔ اب کے بعد سے ہمیں ہمیشہ ہنسنا ہوگا۔ اب مزید کوئی آنسو، کوئی گھٹن نہیں ہے۔

کسی انار کے پھٹ کر آدھا ہونے کی طرح اس دن کا اختتام بے حد تکلیف دہ ہے۔ انار کے لاکھوں شفاف دانے ہمارے گرد بکھر گئے ہیں۔ چاند، جنگل پر طلوع ہوا ہے۔ میں نے حسن کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے دوآن کی بانہوں میں بانہیں ڈال دیں۔

''لیکن پہلے ہم قدیم شہر سیدہ (Side) جائیں گے۔'' میں کہتی ہوں۔

یوں جیسے یہ یقین حاصل کرنے کے لیے کہ ہم کبھی زندہ تھے کسی قدیم شہر کے کھنڈرات پر کھڑے ہونا ضروری تھا، یہ کہ ہم دونوں زندہ وجود تھے اور یہ کہ ہم اب بھی ایسے ہیں۔

تب میں نے دونوں سے تذکرہ کیا کہ کیسے دوآن اور میں اس ریسٹورنٹ سے باہر آئے اور روشنی کی گہری پھوار میں، مینار تلے، بھیگ گئے۔ یہ اس رات کو یاد کرنے اور چھوڑ دینے کے لیے نہیں تھا۔ یہ جاری رکھنے، کسی چیز کو بڑھانے کی تمنا تھی۔ آواز میں اضافہ کرنے کی، مینار تلے روشنی کی پھوار میں دوآن کے دل کی دھڑکنیں:

''دیکھا، ہم یہاں ہیں نوین! ہم بے حد قریب ہیں، فرسودگی واپس جا رہی ہے! موت واپس پلٹ رہی ہے، نوین! زندگی دوبارہ زندہ ہو رہی ہے۔''

ہم کسی جھولے میں تھے۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ میرے اندر گہرائی سے بچگانہ چیخیں بلند ہو رہی تھیں: ''مجھے زندگی مل گئی!''

......تو پھر وہ کیا تھا جس کی کمی تھی، جو تکلیف دہ تھا؟......

مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ حسن کے پاس والو کھولنے کا ہی وقت نہ تھا: ہمارے پاس کوئی وقت تھا ہی نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔ میری غلطی معاف کر دو!

تب میں نے محسوس کیا کہ مجھے معاف کر دیا گیا تھا جب ہم سب قدیم شہر کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ کہ میں نے خود کو معاف کر دیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ قدیم شہر کی وہ راتیں معجزوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ادھ کھائے چاند کی مانند کرنیں پانی پر پڑتی ہیں۔ میں کھاڑی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں

کھڑی ہو جاتی ہوں۔ باہر وہ ماند پھیکی کرنیں صنوبر کے درختوں اور چٹانوں کو پُراسرار انداز میں روشن کر دیتی ہیں۔ سمندر کی جانب سے ہوا چلنا شروع ہو گئی ہے۔ یہ ہوا چاند کو چند گھرے بادلوں سے سجا دیتی ہے۔ یہ بارش برسانے والے بادل نہیں ہیں۔ یہ آسمان کو سجانے والے سجاوٹی بادل ہیں۔ ستارے ان کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ہوائیں بھی ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ ایک مقام پر وہ شمال سے پہاڑوں کی طرف سے آتی ہیں، پھر وہ رخ بدلتی ہیں اور مغرب سے چلنے لگتی ہیں۔ مغربی ہوا کھاڑی کے پانیوں کو ساحل کی طرف بہتا کوئی دریا بنا دیتی ہیں اور جہاں یہ اپنی منزل پر پہنچتا ہے، چپکے سے بڑبڑاتے ہوئے غائب ہو جاتا ہے۔ رات کے اس پہر صنوبر کے درخت اپنی شاخیں شمال مشرق کی طرف جھلا رہے ہیں۔ اسے میں کسی طرح بہار کو الوداع سمجھتی ہوں۔ اس کے سامنے سر جھکانے کی تیاری جو رخصت ہو رہا ہے، ختم ہو رہا ہے۔

لیکن کل ان کے رخصت ہونے کے بعد میری پہلی صبح اور میری یہاں پہلی صبح کی طرح، میرا یقین تھا کہ وہ دن جو ہم جی چکے تھے اور جو دن ہم جینے والے تھے، وہ دن کہیں دُور نہ جاتے، وہ کبھی ختم نہ ہوتے۔ بہار کے اختتام کو پہنچنے کا شک ختم ہو چکا تھا، جو ہم نے عزیز رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ اس سے آگے جو معلوم تھا اس میں، نقصان دہ چیزوں میں، دھندلا گیا تھا۔ خوف جو رات کی تاریکی میں لہروں کی آواز سے اچانک بڑھ گیا تھا۔ اور ایسی رات کی صبح میں قادر نے خالی ٹینک لیے اور چلا گیا۔ ٹرک جو تعمیراتی مزدوروں کو جائے تعمیر تک لے جاتا تھا، ان ٹینکس کو شہر لے گیا۔

اس باسی کافی کے کپ کے ساتھ جو میں نے بنائی تھی، میں ٹیرس پر تھی۔ میں راستے پر دُور کہیں ٹرک کی گرگراہٹ سنی۔ پھر میں نے اس کی ہوا میں اڑائی گئی گرد دیکھی۔ پانی کے فوارے سے ٹرک مغرب کی جانب گھوما اور پھر ایک مرتبہ صنوبر کے جنگلات اور کیلے کے جھنڈ سے ڈھکے جزیرہ نما، گرین ہاؤسز اور مین روڈ سے شمالی طرف ترنج کے پیڑوں کے بیچ دکھائی دینے کے بعد غائب ہو گیا۔

اس جگہ جہاں موٹل کی تعمیر جاری تھی، مجھے آرے کی کانوں میں گھسنے والی آواز سنائی دی۔ نیلے پتوں والے آکاشیا کے عندلیب کا چہکنا بند ہو چکا تھا۔ دھوپ کی کرنیں رات کو خشک جڑی بوٹیوں پر پڑنے والی شبنم کو پہلے ہی سکھانے لگی تھیں...... رات جس نے مجھے ایک نامعلوم اندیشے کے ساتھ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ سمندر ابھی تک ابھار پر تھا۔ چٹانوں کے نیچے بنے چھوٹے چھوٹے تالاب

کناروں تک بھرے ہوئے تھے۔سینکڑوں نقرئی پروں والے پرندے پانی کی سطح پر اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ان سب نے خار ماہی کی طرح اپنے چمکتے ہوئے پر سمندر پر پھیلا دیئے تھے،بغیر یہ دکھائی دیئے کہ وہ دوبارہ پرواز کرتے، وہ پانی کے اوپر اسے بہ مشکل چھوتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑاتے رہے۔میں آنکھوں کی ایسی خود فریبیوں کے ساتھ گھنٹوں سمندر کو دیکھ سکتی تھی۔یا میں ان پھڑ پھڑاہٹوں کے لمس کو اپنے بدن کے ہر حصے پر محسوس کرتی ہوئی اس مسلسل منعکس ہوتی ہوئی روشنی تلے جاسکتی تھی۔ میرے اندیشوں میں کمی آچکی تھی۔دن مجھے حقیقی زندگی کی طرف بلا رہا تھا۔مجھے جلدی کرنی تھی۔میں پہلی منی بس سے نیچے شہر کو جانے والی تھی۔الانیا کو۔مجھے خریداری کرنی تھی،جلدی واپس آنا تھا اور رات کو ان کے لیے خوب صورت میزیں تیار کرنی تھیں جن کو میں نے ایک ایک،ذرا ذرا کر کے،اپنے اندر زندہ رکھا تھا۔اب جس قدر جلدی ممکن ہوتا،انہیں آنا تھا۔

لیکن میں سارا وقت اپنے کافی کے کپ کے ساتھ ٹیرس پر رہی تھی۔میں حسین چیزوں، ایک سے دوسرے رنگ سے اترتی قدرت کی تجدید یا دوبارہ زندگی کو دیکھتے رہنے سے ہٹ نہ پائی تھی جو آپ کو آرے کا شور تک بھلا دیتی ہے۔قریبی ہمسائے کے گھر کے سارے بچے ضرور سو رہے تھے۔لیکن میں خدیجہ کے جھونپڑے میں آنے جانے سے، چٹخنے کی ان آوازوں کے باعث، باخبر تھی جو خشک کانٹوں پر چلنے سے آرہی تھیں۔مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ بچے ابھی جاگے نہیں تھے۔ایک بہت خفیہ سی مسرت۔اس قسم کی خوشی جو اس اطمینان سے مشابہ تھی جو مجھے گونے کو دوپہر کی نیند کے لیے بستر پر لٹاتے ہوتا تھا۔میری آزادی کے وہ خاموش لمحے۔جب سب کچھ، ہر کوئی...... حتیٰ کہ گونے بھی...... حرکت میں ہوتا، جب میں روزانہ کے جسمانی تعلقات میں ان کے ساتھ ساتھ ہوتی، میں یہ جاننے کے قابل نہ ہو پاتی کہ میری محبت اس قدر حقیقی اور گہری، بے تحاشا تھی۔یہ سمجھنے کے قابل ہونے کو کہ میں اپنے بیٹے، اپنے شوہر اور اپنے دوستوں کا ایک ناقابل علیحدہ حصہ تھی، مجھے ان سے دُور جانے کی ضرورت تھی۔موت کے اندر گہرائی میں اترنے کی لیکن اس کی لامحدود حقیقت پر توجہ نہ دینے کی ضرورت تھی۔

پانیوں کے اوپر پھڑ پھڑاتے نقرئی پروں کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے دل کی گہرائی میں دوبارہ وہی گہرا درد محسوس ہوا۔جب دوآن اور میں مینار تلے روشنی کی اس پھوار میں بھیگے ہوئے اس

سے لبریز تھے، میں نے اچانک بے حد اذیت، جھلنے کا سا احساس بھی محسوس کیا تھا۔ گو نے جا چکا ہے!

ٹھیک ہے، میں سب کچھ کے بارے میں شروع سے سوچوں گی، سب کچھ دوبارہ سے جیوں گی۔ میں دو آن کے مجھے اچانک منجمد پانیوں میں دھکا دے دینے کو جیوں گی۔ لیکن گو نے اب نہیں ہے! وہ کبھی نہیں ہوگا!

کپ جسے میں نے لکڑی کے بنچ پر رکھ دیا تھا، میری ٹھوکر سے نیچے جا گرا۔ اسی لمحے میں دیوانہ وار چیخی تھی، ''خدیجہ خانم!''

میں اس کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ عورت اپنی قمیص کہنیوں تک چڑھائے ہوئے میری جانب آ رہی تھی، اس کی شلوار اس کے پیروں میں الجھ رہی تھی: ''نہیں! سانپ؟ ڈرو مت! ڈرو مت!''

سانپ؟

میری تنہائی کی پہلی صبح کا آغاز اس طرح ہوا تھا۔

زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ مختلف لمبائیوں اور رنگوں کے زہریلے سانپ اپنی باہر نکلی زہریلی زبانوں کے ساتھ، بلبلوں کے چہکنے..... حتیٰ کہ مشین کے شور پر بھی غالب آ گئے تھے۔ وہ میری جانب آ رہے تھے، مجھے ہر طرف سے گھیرنے کو تیار ہو رہے تھے، میری گردن، ٹانگوں اور میری کمر کے گرد لپیٹنے کو تیار۔ گہرے رنگ والے، ہلکے رنگ والے، پتلے، موٹے..... وہ سب کے سب۔ وہ سب مجھے نہ ختم ہونے والے ڈراؤنے خواب میں جینے پر مجبور کرتے ہوئے چوکیدار یا محافظ بن گئے تھے۔ وہ مسلسل نگرانی کر رہے تھے۔ سوائے خود ان کی اپنی ذات کے وہاں جو کچھ بھی تھا وہ اس کی نگرانی کرتے، نگاہ رکھتے، فیصلہ کرتے۔ وہ ان کی اپنی اندرونی دنیائیں تھیں، جو وہ نہیں دیکھتے تھے، چاہے ایک لمحے کو ہی سہی۔ وہ اپنے اندر کسی مختصر سفر پر بھی نہ جاتے۔ وہ اپنے قریب زمین میں ہل چلاتے اور کاشت نہ کرتے تھے..... وہ واچ ٹاور کی طرح کسی پہاڑی کا انتخاب کرتے، جہاں سے وہ اپنے ایک ہاتھ میں عینک اور دوسرے ہاتھ میں چھڑی تھامے، مسلسل متواتر حکم دیتے، الزام دیتے، یوں وہ ان ٹاورز میں بیٹھ جاتے اور ان اعلیٰ پوزیشن کی کے لیے رپورٹیں تیار کرتے۔

وہ جھٹکے سے میرے پیروں پر گر گیا، میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ جہنم سے کوئی پتھر گرا

تھا، ہکا بکا رہ گئی۔ وہ ربر کے درخت کا پتا تھا جو گرما کے موسم میں خاصا موٹا ہو گیا تھا اور پھر زرد ہو کر اب اپنی شاخ سے گر پڑا تھا۔

خدیجہ ہنس رہی تھی۔ اس کے پھٹے ہوئے خشک ہونٹ پوری روشنی میں Tinder جیسے لگ رہے تھے۔ ''آپ نے سمجھا کہ یہ کوئی سانپ تھا؟''

خدیجہ سارا وقت ہنس رہی تھی۔ اس نے ہر چیز کو بھگا دیا، ان سب کو، وہ سب انسپکٹرز جو اپنی آنکھوں پر گہرے رنگ کے شیشوں کی عینک لگائے ہمیشہ دوسروں کو دیکھ رہے ہوتے تھے۔

''نہیں، نہیں......'' میں نے سمندر کی جانب اپنا رخ موڑتے ہوئے اسے کہا تھا۔ میں شرمندہ ہو گئی تھی۔ میں اس سادہ قدرتی سی صورتِ حال میں بھی فریب نظر کا شکار کیوں ہوں؟

اس لمحے میں نے ساحل سے دُور ایک موٹر بوٹ گزرتے دیکھی۔

''ماضی میں...... یہاں سے ایک کشتی بھی نہ گزرتی تھی، سمندر میں کوئی ایک موٹر بوٹ بھی نہیں......''

''ہاں۔'' خدیجہ کہتی ہے۔ وہ اپنی شلوار سے اپنے ہاتھ خشک کرتی ہے۔

''وہ یہی کہتے ہیں، ہنڈرڈ گرینڈ مین (ایک اصطلاح جو مقامی کسی امیر آدمی کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے پاس اس وقت تقریباً ایک سو ہزار لیرا ہوتے تھے) کا بیٹا اب مچھیرا بن گیا ہے......''

''کیا وہ کچھ پکڑتا ہے؟''

''خیر، کبھی کبھار......لوگ کہتے ہیں کہ وہ انہیں جنگل کے آگے موجود ہوٹلوں کو بیچتا ہے۔ وہ پاگل ہے!''

وہ دوبارہ ہنس دی تھی۔ اس سے پوچھا نہیں گیا لیکن اس نے باقی سب بھی بیان کر دیا۔

''موٹل بہرحال کس نے چھوڑے ہیں؟ لیکن یہ لڑکا ابھی تک سمندر کنارے آوارہ گردی کرتا ہے۔ ہر کوئی گاڑی کے پیچھے ہوتا ہے، لیکن یہ کشتی کے پیچھے ہے۔ یہ سب لوگ اب امیر ہیں۔ جب بہت سی رقم ہو تو پاگل ہونا تو مفت ہوتا ہے، بلا معاوضہ۔ وہ بالکل دیوانہ ہے!''

''بہتر ہو کہ وہ سمندر میں ڈائنامائٹ نہ پھینک دیں......''

''وہ ایسا بھی کرلیں گے۔کیا آپ نے کبھی دیکھا نہیں؟ آپ ابھی ابھی یہاں آئی ہیں لیکن آپ جان لیں گی۔ یہاں ایک اپاہج ہے۔وہ لنگڑا کر چلنے والا لڑکا، آپ جانتی ہیں میں کس کی بات کر رہی ہوں؟ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ڈائنامائٹ کی وجہ سے ہوا۔ وہ بہت خوب صورت لڑکا تھا، نوخیز پودے جیسا۔ میرا قادر اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، اس کا خیال رکھتا ہے۔ وہ اس پر ترس بھی کھاتا ہے...... گاؤں میں ہر کوئی اس سے برا سلوک ہی کرتا ہے۔ اگر وہ اپاہج خود ڈائنامائٹ سے کھیل رہا ہوتا تو ٹھیک تھا۔ آپ کہہ لیتے اس نے خود یہ سب مول لیا، خود کو اس مشکل میں خود ڈالا اور چل دیتے۔ انہوں نے ڈائنامائٹ اس وقت چٹانوں سے نیچے پانی میں پھینک دیا تھا جب یہ لڑکا وہاں تھا، جب لوگوں نے اسے باہر نکالا تو اس کا پورا جسم بے جان بے حس تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا خوف کی وجہ سے ہوا۔ پھر بھی خدا نے کم سے کم اس کی زندگی بچالی، آپ جانتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کیا یوں اپاہج زندگی گزارنا بہتر ہے......''

خدیجہ ایک بار پھر جلدی جلدی ساری باتیں بیان کر رہی تھی۔

ماضی میں، کسان...... پہاڑ کے لوگ جو حال ہی میں سمندر سے آشنا ہوئے تھے...... ہر وقت ان چٹانوں سے نیچے ڈائنامائٹ پھینکا کرتے تھے۔ ہم نے جانا کہ انہوں نے ہماری زندگیوں کی قدر نہیں کی۔ حسن کو ضرور امید ہوگی کہ وہ مچھلیوں کی پرواہ یا قدر کرتے، وہ انہیں متنبہ کیا کرتا تھا، ''جب وہ ابھی انڈوں میں ہی ہوتی ہیں تم مچھلیوں کو مار دیتے ہو۔ جلد ہی وہاں پانی میں کوئی ایک مچھلی بھی نہیں بچے گی۔''

وہ سب ہنس دیا کرتے تھے، جیسے اب خدیجہ حتیٰ کہ اس اپاہج لڑکے کی بات کرتے ہوئے بھی ہنس رہی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے، ''اس قدر بڑا سمندر، کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی مچھلی نہ بچے؟'' ان کے نزدیک سمندر، پانی، زمین کی طرح، خشکی کی طرح نہیں تھے۔ اس کے لیے توجہ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ مسلسل متواتر جنم دیتیں اور ہمیشہ مادہ کو پروان چڑھاتیں۔ یہ غیر اہم تھا۔ آپ اس پر نہ سوچتے، اس کی گہرائیوں میں، محبت کرتے ہوئے، سہلاتے ہوئے، محتاط رہتے ہوئے۔ آپ عمومی طور پر، غیر مہذب طور پر، اس میں ڈائنامائٹ کے ساتھ چھلانگ لگا دیتے۔ ان کا سمندر کے ساتھ تمام تعلق یہی تھا اور بس......

جب فواد نے چٹانوں کے ساتھ خالی درزوں میں وہ بڑی سفید گرو پر مچھلی پکڑی، حسن نے پہلی مرتبہ محتاط رہ کر ماضی میں جھانکا، زیادہ پرانا ماضی نہیں، پانچ یا دس برس پرانا اور اس ماضی کو ایک قہقہوں بھرے مذاق سے ڈھانپ دیا، ''یہ واحد مچھلی ہوگی جس نے خود کو ڈائنامائٹ سے بچالیا۔'' اس نے ایک بڑے سے اور...... مجھے معلوم نہیں کیوں، مکروہ...... قہقہے کے ساتھ کہا۔

وہ وقت تھا جب وہ سب وہاں آئے تھے، جب ہم سب اکٹھے تھے، جب ہم باغ میں لکڑیوں کے دہکنے کا انتظار کیا۔ میں انہیں لڑکے کے بارے میں انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اسے ڈائنامائٹ نے اپاہج کیا تھا۔ میں نے خدیجہ کے اندازوں کو فوراً ہی اپنے ذہن سے محو کر دیا تھا، اس کی قصور واری کو، دہقانوں اور بچے میں تقسیم کرنے کی کوشش کو بھی، جب اس نے کہا کہ ''بچے کو یہاں اِدھر اُدھر اس قدر آوارہ گردی نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں! لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک بچہ تھا، اس کے دماغ میں بس سمندر ہی بسا تھا۔ وہ گاؤں سے ایسا ایک ہی بچہ تھا۔ اس کے لیے بس پانی، چٹانوں کی درزیں، سمندری غاریں ہی سب کچھ تھیں...... وہ ہمیشہ گھومتا، اِدھر اُدھر گھومتا ہی رہتا...... کیا سمندر تمہاری ماں کی گود ہے؟ کیا تمہاری زبان مضبوط باپ کی سرزمین ہے؟'' ان سب باتوں کو بھلاتے ہوئے میں اس تمنا کے لیے بے حد خوش تھی جو پوری ہوگئی تھی۔ اس خوشی کو ماضی سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔ عداوت کا کوئی سایہ ہم میں سے کسی پر نہیں پڑنا چاہیے تھا...... حسن پہلے ہی رکے بغیر بڑے جوش وخروش سے سمندر کی تہ میں موجود زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ وہاں موجود زندگی کی بے حد خوب صورت کہانی بیان کر رہا تھا۔ محمت اس کے ہر لفظ کو بغور سن رہا تھا، آگے لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ ہماری نگاہوں میں خوب صورت مچھلی اور حسن کے ایک دوسرے کو دیکھنے کا ہر تصور زندہ ہو رہا تھا۔ سمندری غار میں۔ مچھلی نے اپنے فِن شرماتے ہوئے ہلائے، اس کی آنکھیں یوں سہلاتی ہوئی لگتی تھیں، ایسی بھیک مانگتی التجائیہ نگاہیں، کہ حسن نے سوچا کہ وہ کوئی جل پری تھی۔ وہ اس کی تصویر نہیں بنا سکا تھا۔

جل پریوں کی سرگوشیاں، اس پُراسرار موسیقی نے ہماری رات کو معمور کر دیا تھا۔

''آپ ٹھیک سے تو سوئی تھیں؟'' خدیجہ پوچھ رہی تھی۔

میں ہی چلائی تھی، ''خدیجہ خانم!'' یہ میں تھی جس نے اسے بلایا تھا۔ لیکن اب، میری

خواہش تھی کہ جس قدر جلدی ہو، وہ اپنے گھر چلی جائے اور پھر مجھے یہ محسوس کرنے پر شرمندگی ہو۔
''بہت اچھا۔ میں دیر سے جاگی تھی اور قادر بے، میرا مطلب ہے قادر آ گیا۔ خدا اُس پر رحمت کرے، وہ خالی ٹینک ٹرک تک لے گیا تھا۔''

''کسی بھی صورت ٹرک تو خالی جا رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا بھی دے دیا، میرا خیال ہے کہ انہیں بھرے ہوئے مل بھی جائیں گے۔ آپ کو کہنا چاہیے تھا کہ اگر آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت تھی۔ ٹرک والے اچھے لوگ ہیں۔ جب وہ مزدوروں کو لینے آئیں گے تو آپ جو بھی چاہیں وہ لے آئیں گے......''

''میں پھر بھی خود چلی جاؤں گی۔ مجھے ابھی جانا چاہیے۔ میں ذرا تیار ہو جاؤں۔''

میری آواز یا لہجہ ایک بار پھر خدیجہ کو واپس بھیجنے کا مشتاق ہو گیا۔ اس صبح جب اس نے میری بے خبری میں، میرے دن میں خواب دیکھنے کے باعث، مجھے پکڑا، وہ پُل جو اس نے بنانے کی کوشش کی تھی......اس نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے خدیجہ سے زیادہ کھلا اور واضح رویہ رکھنا چاہیے تھا، جو جب سے ہم ملے تھے مجھے کھینچ کر اپنی دنیا میں لے جانے یا میری دنیا میں آ گھسنے کی شوقین رہی تھی۔ مجھے اسے الجھانا نہیں چاہیے تھا۔ میں دو گھروں کے درمیان کھڑے ٹوٹے ہوئے جنگلے کی طرح تھی۔ وہاں تھی اور نہیں بھی۔

خدیجہ نہیں جانتی تھی کہ میں وہ عارضی باڑھ یا جنگلا تھی۔ ''میں عثمان کے ڈائپر اُبال رہی تھی۔ آگ بجھنی نہیں چاہیے۔ بچوں کے جاگنے سے اور میری توجہ چاہنے سے پہلے مجھے جا کر کام ختم کرنے دیں۔'' وہ بولی۔

کس قدر بے وقوفی ہے میرا یہ سوچنا کہ میں نے اسے جانے پر مجبور کیا تھا، یہ کہ وہ میں تھی جس نے اسے باڑھ کے دوسری طرف جانے پر مجبور کیا تھا اور اس لیے مجھے شرمندگی محسوس ہوئی تھی!

جو کچھ بھی ہو رہا تھا، وہ میرے اندر ہو رہا تھا۔ میں اپنے باہر کسی چیز پر کنٹرول نہیں رکھتی تھی۔ خدیجہ جب آنا چاہتی آ جاتی اور جب وہ چاہتی تب ہی چلی بھی جاتی۔

وہ اپنی لانڈری کو واپس چلی گئی۔ ساحل سے ہٹ کر گزرتی موٹر بوٹ بھی غائب ہو گئی۔
کسی وجہ سے میں یہ سوچ رہی تھی کہ ہنڈرڈ گرینڈ مین کا بیٹا اپنے سر پر بے حد رنگین اُونی مخروطی ٹوپی

پہنے ہوئے تھا۔ اگرچہ اس کشتی کی کوئی نشانی نہیں بچی تھی اور وہ سفید لکیر جو اس نے پانی پر بنائی تھی، وہ خاصی دیر گزری ختم ہو چکی تھی، وہ پھندنے والا رنگین مخروطی ہیٹ سب سے بڑھ کر بیرونی خلا کی کسی چیز کی طرح کہر آلود نیلاہٹ میں ایک سے دوسرے مقام تک لہراتا رہا۔ اب میں پوری طرح آگاہ ہوں کہ کیسے وہ ہیٹ مجھے حیران کرتا رہا تھا، جو سمندر کے اوپر خلا میں ان ناقابلِ وضاحت سمجھ سے باہر اڑتی چیزوں UFOs کی طرح گھومتا رہا تھا۔

اولمپس کے دیوی دیوتاؤں اور زمین پر ان کے پارٹنرز کبھی بھی یہاں نہ رکے ہوں گے۔ وہ پتھر اور سنگ مرمر کے کام سب کے سب نقش ثانی یا Replica ہیں۔ بانسری اور بربط کی آوازیں خلا میں نہیں گونجتی ہیں...... بوڑھا Triton اپنی بانسری یا مرلی نہیں بجا رہا ہے...... یہ صرف میناروں سے اٹھتی اذانوں کی آوازیں ہیں، لاؤڈ سپیکروں سے اٹھ کر کیلوں کے جھنڈ میں، ترنج کے پیڑوں میں بہتی اذانیں، جو انفرادی آوازوں، پہاڑی لوگوں کی پکاروں کے ساتھ ضم ہو رہی تھیں...... ایک ڈرم، ایک زرنا (Zurna) یعنی نفیری نے کان بہرہ کر دینے والی آوازوں کے ساتھ خود اپنا دفاع کیا، اپنا دفاع کرنا، چاہے مجھے یہ پسند تھا یا نہیں، چاہے میں یہ چاہتی تھی یا نہیں۔

اس علاقے میں لوگوں کی قبل از تاریخ رزمیہ کہانیوں کو تلاش کرنا بے معنی ہے، جن کا کل تک سمندر سے کوئی تعلق نہ تھا۔

طلوع اور غروبِ آفتاب کے وقت سنگ مرمر کو سجاتی کرنوں تلے اڑتے ہوئے پروں والے گھوڑے، گاڑیاں کھینچتے ہوئے آسمان یا زمین کے کسی بھی دیوتاؤں کو بندرگاہوں سے نہیں لائے اور انہیں شہر کے دروازوں تک نہیں پہنچایا۔ انہوں نے انہیں چوک و بازار نہیں دکھائے۔ کسی فیثاغورث نے اولمپک تقریبات میں ڈسکس پھینکتے کسی اتھلیٹ کو نہیں دیکھا ہے اور کسی نے اس کی صورت کا مجسمہ نہیں بنایا۔ Discobolus کے مجسمے کا دھڑ آخر میں نہیں چاہتا ہے کہ جنگ کے دیوتا اریس (Ares) کی تقلید یا نقل کرے، اس کے پاس زرہ بکتر، جنگوں کے لیے مشقت اور تلوار نہ تھی۔ Discobolus کے مجسمے کا دھڑ عریاں ہے۔ کیوں کہ وہ بحیرۂ روم سے ہے۔ وہ محبت، شاعری اور فنا پر یقین رکھتا ہے۔ ہنڈرڈ گرینڈ مین کا بیٹا ضرور اونی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ وہ پہاڑوں کی برفوں کے خلاف جنگ کے لیے آیا ہے۔ وہ بحیرۂ روم کا اریس نہیں ہے۔ اس نے نہ صرف محبت، شاعری اور

موت کا باہر بلکہ اندر بھی تبدیل کر دیا ہے۔اس نے اپنی کشتی کو لارل کے درخت کی شاخوں سے نہیں سجایا۔اس نے اسے مساوات، بھائی چارے، آزادی وغیرہ کا نام بھی نہیں دیا۔وہ کبھی بھی عیسیٰ کو نہیں جانتا اور اس نے اپنا دوسرا رخسار پیش نہیں کیا۔کئی روز بعد جب وہ نیچے چھوٹی کھاڑی میں لنگر انداز تھا، ہم نے کشتی کا نام پڑھا تھا، ترکان۔(ترکوں کی شجاعت و طاقت کا عکاس نام: وضاحت)۔

اس نام کا تعلق یقیناً قدیم شہر سیدہ سے نہیں تھا۔نہ ہی، Naxos سے، نہ Mikonos سے۔ نہ جل پریاں، نہ بگلے، نہ یونانی دیوتاؤں کا پیغام رساں ہرمز (Hermes)، نہ جل دیوی افروڈائٹ (Aphrodite)۔بلکہ ترکان۔میں بھول چکی ہوں۔مجھے بھولنا نہیں چاہیے تھا۔یہ ان ساحلوں پر موجود واحد کشتی کا نام تھا۔زیادہ مغرب کی جانب کبھی کبھار آپ کو بادِ مغرب (Zephyr)، سمندر کی ہوا اور چند سمندری گلاب مل جاتے۔

کاش میں کل ایک بار پھر قدیم شہر جا سکتی...... کاش میں اپنا قیام کچھ لمبا کر سکتی!......اس آدھے چاند کی رات کے بعد، ہم نے وہاں پورا دن گزارا تھا۔ہم میں سے ہر ایک کسی رومی اداکار کی طرح، ہم ایمفی تھیٹر کے اکھاڑے میں گھومتے رہے۔شہر نے اپنے قدیم دروازے ہمارے لیے کھول دیئے تھے۔ماضی کو حال سے دُور رکھے بغیر۔

میں نے سنگ مرمر کے اُس ستون کے ساتھ جو اندر کی طرف جھک چکا تھا، دوآن کو فواد کے گھٹنوں پر سر رکھے آرام کرتے دیکھا۔محرابوں تلے کھڑا محمت پرانی بندرگاہ کو دیکھتا ہے۔اس نے اپنی سانس اتنی دیر تک روکے رکھی ہے کہ میرا خیال ہے کوئی بحری جہاز بندرگاہ پر آ کر رکا ہے اور اس سے چغوں میں ملبوس رومی ایک ایک کر کے اتر رہے ہیں۔سونے چاندی سے سجی گھوڑا گاڑیاں جنہیں بڑے بڑے گھوڑے کھینچ رہے ہیں، ان کے جھاگ اڑاتے منہ، ساحل پر اترنے والوں کے انتظار میں ہیں۔اب سورج غروب ہو رہا ہے۔سنگ مرمر پر گلابی گرد چھڑک گئی ہے۔سب کچھ شام کے رنگ کا ہے، اناروں کے ان رنگوں میں جو ہر غروبِ آفتاب پر بحیرۂ روم پر چھا جاتے ہیں۔سونے کی سی چمک آہستہ آہستہ مدھم پڑ جاتی ہے۔رومی، ان سایوں کے درمیان، قدیم بندرگاہ اور قدیم بازار میں، ہجوم کی صورت معبدوں میں، تھیٹر اور کتب خانے کے مقام پر جاتے ہیں۔گھوڑوں کی ہنہناہٹ دُور سے سنائی دیتی ہے۔گھوڑا گاڑیوں کے پہیوں کی چر چراہٹ، اطلس جیسے گہرے نیلے آسمان پر

ہلکورے لیتی دُور سے دُور ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم ایک جدید زمانے کے کافی ہاؤس میں ٹھنڈی اناطولی وائن کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ وارنش شدہ لکڑی اور کنکریٹ کے ستونوں والا یہ کافی ہاؤس قدیم فصیلوں کے اندر ہے۔ یوں ہر لمحے ہم پوری طرح ماضی اور حال دونوں میں وجود رکھتے ہیں۔ اگر میں کسی اور جگہ ہوتی، کسی اور وقت میں تو مجھے یہ عجیب لگ سکتا تھا۔ لیکن وہاں اریس اور ہنڈرڈ گرینڈ مین کا ایک دوسرے کو گلے لگانا میرے نزدیک بے حد فطری تھا...... دوآن کا فواد کے گھٹنوں پر آرام کرنا بے حد فطری تھا...... یوں جیسے سب کچھ ایسے ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی درست جگہ پر ہونا چاہیے تھا...... لیکن اب اس لمحے، یہ میرے لیے ایک عجیب ادراک تھا...... میرچ اپنے سر پر سکارف باندھے ہوئے تھی جس کے کناروں پر سرخ مرچوں کے ڈیزائن میں کشیدہ کاری تھی، اس کے کانوں میں جپسی بُندے تھے اور وہ لمبا، کھلا سا سفید کاٹن کا لباس پہنے ہوئے تھی، وہ توجہ کے اس بنیادی سبجیکٹ کے متعلق اپنے حُسن کو بڑی محنت سے دیکھ بھال کرنا بھول چکی ہے، اب دوسری خوب صورت چیزوں کی جانب مڑ چکی ہے، منفرد حُسن جو اس وقت ملتا ہے جب ماضی اور وہ وقت جس میں ہم زندہ ہیں، ہم آغوش ہوتے ہیں۔ وہ روشنیوں کے عکس سے سنگ مرمر پر بننے والے ڈیزائنوں کو دیکھ رہی ہے۔ وہ Galatea ہے، Pygmalion کا مجسمہ زندہ ہو گیا ہے۔ فلومیلا (Philomela) اپنی بُنائی میں مصروف ہے اور فواد اس فکر کو ایک طرف رکھ کر کہ خاتون کون ہے، مرد کون ہے، ایک مرد کے ساتھ شناسا ہو رہا ہے، دوآن کے ساتھ۔ جب فلومیلا اس کی تکلیف کی بات کرتی ہے، اس کی بُنائی، اس کی کشیدہ کاری کے ذریعے اس کی کہانی کہتی ہے، دوآن انسانوں کی زبان سے سب سے قیمتی اور قابل قدر موتی چنتا ہے۔ یوں وہ اپنے رازوں کا انکشاف کرتا ہے۔ محمت اپنے سولھویں سال میں سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والا ایک رومی ہے۔ شاہانہ انداز میں وہ حسن کو سیلیوٹ کرتا ہے، جو پکار رہا ہے، "ارے بچے، مجھے بوتل پکڑاؤ۔" اس کی آواز، کسی عورت کی سی مگر بلند آواز، "ہزاروں برس پرانا یا بوڑھا ایک بچہ، انتہائی مہربان احساسات کے ساتھ آپ کو زندگی کا جوہر پیش کر رہا ہے۔" وہ کہتا ہے۔ وہ ہمیں آبِ حیات کی ٹوٹی ہوئی صراحی سے زندگی کا جوہر یا ست پیش کر رہا ہے۔ اس کی نگاہ ہم سب کو آغوش میں لیتی ہے۔ وہ حیاتِ جاودانی کا وعدہ نہیں کرتی۔ وہ زندہ رہتے ہوئے محبت کرتا اور سمجھتا ہے۔ سو ہم ایک ہی کڑے امتحان میں ایک ہی شخص بن گئے ہیں، وہ امتحان جہاں شاعری، محبت اور موت کو ایک

ساتھ گوندھ دیتی ہے۔ یہ میں ہوں جو وہ سب پی جاتی ہے جو شہد کی صراحی میں بچ رہا ہے۔

وہاں تخت پر، یہ صرف دوآن نہیں ہے جو کہتا ہے:

موت اب ایک شکاری ہے

زندگی ایک غزال

اور ہم محبت اور عداوت کی کراس فائر میں

کسی موت کی پکار ہیں

تباہی کی ترغیب

اس لمحے جب سینہ بہ سینہ ہیں

سمندر اور پہاڑ۔

یہ وہ نظم تھی جو ہم نے یقیناً دوآن کے منتخب کردہ لفظوں کے ساتھ ہم آواز ہو کر پڑھی تھی۔
اس نے مجھے کپکپا دیا تھا لیکن اس نے تیزی سے میرے لہو میں سفر کیا اور جب یہ ختم ہوئی تو مجھے اٹھنے اور ریکارڈ پر وہ گیت بجانے کے لیے مجبور کیا:

"Now you're far away..."

ہماری راتیں ناقابل یقین حد تک خوب صورت، ہماری صبحیں عندلیب کے گیتوں کے ساتھ، دھوپ کی کرنوں کے بہت سے رنگین عکس، اور ایک نظم، ایک گیت۔ ہر قدم پر: کیا یہ خواب ہے، کیا یہ حقیقت ہے، کیا یہ حقیقت ہے، کیا یہ خواب ہے؟

کاش میں اس قدیم شہر ایک مرتبہ پھر جا پاؤں، کل! میں جانے سے اجتناب کرتی ہوں۔
میں اس حقیقت کو کہ میرے پاس بہت کم وقت ہے، بہانہ بنا لیتی ہوں اور شاید اسی وجہ سے میں ماضی کے بارے میں بتانے لگی ہوں۔ صرف بتانا...... خوابوں کو نقصان نہ پہنچانا، بلکہ ان کو رگڑ کر پالش کرنا۔
مشین کا شور، سمندر سے گزرتی ایک کشتی، میرے سامنے گرنے والا ربر کے درخت کا ایک مرجھایا پتا، خدیجہ کے پھٹے ہوئے ہونٹ۔

اپنی پہلی صبح، میں مکمل طور پر اس دن کے اندر تھی، جو اس طرح جیا جا رہا تھا۔
میں گھر کے دونوں دروازے بند کر کے باہر چلی گئی تھی۔ اس بارے میں محتاط کہ دوبارہ

میرا سامنا خدیجہ اور اس کے بچوں سے نہ ہو، میں تیزی سے رستہ طے کر گئی۔ سڑک پر مجھے الانیا جانے والی پہلی منی بس کا انتظار کرنا تھا۔

سورج پوری طرح طلوع ہو چکا تھا۔ کہر کی پتلی سی تہ سمندر اور ساحل کو ڈھانپ رہی تھی، جو کسی ڈھیلی بُنی ہوئی شیفون جیسی لگتی تھی۔ کنویں کے پمپ کے شور نے ایک بار پھر ہر شے کو نگل لیا تھا۔ منظر Tyche کے چھوٹے مجسمے کی یادگار تھا۔ Tyche کے جسم کو ڈھانپنے والا کپڑا بے ڈھنگے پن سے سنگ مرمر پر رکھ دیا گیا تھا۔ نفیس چُنٹ کی بجائے، کپڑے کے ڈھیر نے کولھوں کو چھپا لیا تھا اور بائیں ٹانگ اس طرح باہر نکلی ہوئی تھی کہ کپڑے کا وہ ڈھیر بھی اسے نہ چھپا پا رہا تھا۔ افراط اور کم یابی، مہربانی اور بدتمیزی، پرواہ اور بے پرواہی، ہر کوئی دوسرے کے اندر۔ کیا یہ کوئی مشرقی بحیرۂ روم جیسی چیز نہ تھی، بلاکم و کاست اس بحیرۂ روم میں زندگی؟

سو ایسا ہے، آپ جانتے ہیں: فوارے کے سامنے کسی گزرنے والی منی بس کے انتظار میں، ہر شے میری نگاہوں کو غیر ہم آہنگ اور بھاری لگ رہی تھی۔ وہ ایسی غیر متوازن روشنی تھی۔ روشنی کی کرنیں ایک ہی جگہ پر جمع ہو گئی تھیں، یا دوسری جگہ پر نہیں پڑ رہی تھیں، یا ہر جگہ پھیل اور منتشر ہو رہی تھیں تاکہ وہ دھندلے گدلے پانی میں غرق دکھائی دیں۔ جہاں تک جنگل سے ڈھکے جزیرہ نما کی بات تھی، وہ بھونڈے طریقے سے کسی موٹی سی ٹانگ کی طرح سمندر میں پھیلا ہوا تھا، جو بستر کی چادروں کے ڈھیر سے، سلک کو پھاڑتے، خراب کرتے ہوئے باہر نکل جاتی ہے۔

وہ خوب صورت لمحہ گزر چکا ہے، جب ابھی عندلیب گیت گا رہی تھیں۔ وہ نیلگوں گلابی پن اب گرد آلود زرد ہے۔ اب آپ الانیا کی اندھا کر دینے والی دھول مٹی اور دھوئیں میں چھلانگ لگا سکتے تھے۔ اس سے فرق نہ پڑے گا۔

ٹرک، موٹر سائیکلیں، منی بسیں، نہ ختم ہونے والے شور میں گزرتی چلی گئیں، کنویں کے پمپ کا شور مجھ تک پہنچا، دو آدمیوں نے خاردار تاروں کا بڑا سا ڈھیر کھینچا اور اسے سڑک کنارے سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ فطرت اور فطرت پن دونوں، ہوا میں دونوں ہاتھ اٹھائے، سفید پرچم کی جانب لہرا رہے تھے۔

میں بے صبری ہو گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ ہمیں بہت دیر ہو گئی تھی۔

اب میں پبلک منی بس پر ہوں۔ میں دہقانوں کی باسی دہی کی بُو والی، پھپھوندی زدہ، سیلی اُونی پشم میں گھری ہوئی ہوں۔ پھر بھی یہ واضح ہے، ابھی بارش نہیں ہوگی۔ منی بس پر تقریباً ہر کوئی اونگھ رہا ہے۔ جو کوئی اپنا منہ کھولتا ہے، وہ جماہی لینے کے لیے ہی کھولتا ہے۔

میں نے الانیا کو مس کیا تھا، قلعہ نہیں، سرخ مینار نہیں، قلوپطرہ بھی نہیں۔ (سرخ مینار کو الانیا کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر اناطولی سلجوق سلطان علاؤالدین کیقباد کے دَور میں شروع ہوئی اور یہ 1226ء میں مکمل ہوا۔ اسے تعمیر میں استعمال ہونے والی سرخ اینٹوں کے باعث یہ نام دیا گیا۔ قرونِ وسطیٰ کی فوجی تعمیرات کی بہترین مثال یہ عمارت 108 فٹ بلند اور 41 فٹ چوڑی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، انتھونی اور قلوپطرہ نے الانیا کے سرخ مینار میں اپنا ہنی مون منایا تھا: وضاحت)۔ میں نے اناج اور دالوں کی ان دکانوں کو، سینما کو جو کبھی گودام تھا، اپنے سروں پر اونی ٹوپیاں پہنے پہاڑ سے اتر کر سینما آنے والے گھبرائے ہوئے لڑکوں کو، پہاڑوں کو مس کیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اب وہاں کتنے ہنڈرڈ گرینڈ مین اور ان کے کتنے بیٹے ہوں گے، جو سینما کی پہلی قطار اور باکسز کو اپنی البیلی اونی ٹوپیاں، بڑی بڑی کالی شلواریں پہن کر بھرتے ہوں گے، پائپ کی طرح رول کر کے (گوشت اور سبزیوں سے بنا ایک قسم کا ترک پیزا) لحمجون (Lahmacun) کھاتے ہوئے، موٹے ہونٹوں والی نیم عریاں عورتوں اور لمبی قلموں والے ہیروز دکھائی دیتے، بوسوں میں اس جوش و خروش کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے جو انہیں نگل چکا ہے؟ میں اس حجام کو بھی دیکھ چکی ہوں جو اپنی دکان میں قدیم آئینوں کے ساتھ بال کاٹتا ہے۔ جب میں ان کے سامنے سے گزرتی ہوں تو میں اندر جھانک سکتی ہوں۔ یقینی طور پر وہاں بیٹھا ہوا۔ نیکٹائی اور کالی شلوار والا سلیمان، جس نے اپنی گردن کی گدی سے بال نہیں کاٹنے دیئے اور جو یہ یقین حاصل کرنے کے لیے سینما کے سامنے لگے پوسٹروں والے ہیرو کی طرح اس کی بھی لمبی لمبی قلمیں ہوں، آئینے سے نظریں نہیں ہٹا پاتا۔ دیوار پر موتیوں والا لیمپ شیڈ ہے۔ ایک مرتبہ نوران (Nuran) نے، جو بحری جہاز سے آئی تھی، اس نے زین کی پٹیوں میں پرو کر لیمپ شیڈ بنانے شروع کیے تھے۔ اس نے لوکی پر پہاڑی دیہاتوں کی دلہنوں کے چہرے پینٹ کیے۔ بعد میں بہت سے لوگ نوران کے اس راستے پر چلے۔ خود کو کبھی بھی روکے بغیر۔ ان پہلے کِلم کو پیروں تلے روندتے ہوئے جو اس نے بُنے تھے۔ انہیں برباد کرتے،

خراب کرتے ہوئے۔ زندگی اس قدر آسانی سے کیسے کمائی جا سکتی تھی؟ آسان، کیا یہ تھا؟ بعد میں انہیں نوران اجاڑ ساحل پر ملی۔ ایک لاش جس پر سیاہ اور نیلی خراشیں تھیں۔ تین سلیمانوں کے بعد، تین مصطفی یا تین رمضان، حجام کے آئینے کے سامنے سے اٹھے، بے چاندرات میں، یہ سوچتے ہوئے کہ نوران بھی ان موٹے ہونٹوں والی عورتوں میں سے ایک ہوگی جو انہوں نے سینما کی سکرین پر دیکھی تھی اور جس پر وہ یک لخت چلا اُٹھے تھے......

جب میں یہ سب بتا رہی ہوں تو پلے بوائے کی فرش پر بکھری ہوئی کاپیاں میری نگاہوں کے سامنے آگئیں اور پھر تیزی سے مٹ گئیں۔ منی بس میں دہی کی باسی بُو ہر شے پر چھا رہی ہے۔ میں اپنا رخ سڑک کے ساتھ قطار در قطار کھڑے صنوبر کے درختوں والے ساحل، تنگ ساحلوں، پُرسکون سمندر کی طرف موڑ لیتی ہوں۔ لیکن پھر بھی منی بس دل اچاٹ کر دینے والی یکساں ناگواری، یکساں جھٹکے، مسلسل سوال، مسلسل یہ دہرانا: کچھ دیر بعد وہاں شہر میں، ہر چھجے تلے، میں ایسی کتنی نوران دیکھوں گی جو اب نوران سے مشابہ نہیں، جو اس کے لیے اجنبی ہیں، Aivazovsky (روسی آرمینی مصور) کی ان چاندنی بھری پینٹنگز کی طرح اجنبی، دولما بچہ محل (استنبول میں عثمانی دَور کا محل) سے بہت دُور اور بہت قریب، وہاں کی ملاقاتوں سے؟ میں کتنی نوران، ان کے چرائے گئے پینٹ دیکھوں گی؟ اگر وہ لیمپ شیڈ دوبارہ اس قدر بری طرح سے بنائے جانے تھے، اگر وہ لوکی دوبارہ اس قدر بری طرح سے پینٹ کی جانی تھی تو پھر کیا اور کس کے لیے نوران نے قیمت چکائی تھی؟

میں الانیا میں جو کچھ ڈھونڈ رہی تھی، وہ اب مچھلی، جھینگے، سگریٹ، ڈرنکس، حتیٰ کہ فواد کے لیے ٹانک واٹر کی چند بوتلیں نہیں تھی...... میں انہیں جلد یا بدیر ڈھونڈ ہی لیتی۔ میں جس کی تلاش میں ہوں وہ ایک سوال کا جواب ہے، نوران نے کیا اور کس کے نام پر قیمت چکائی تھی؟

لوگوں کا ایک شہر جنہوں نے برسوں سے سمندر کی جانب پشت کر لی تھی اور جنہیں اچانک معلوم ہوا تھا کہ یہ ایک تجارتی راستہ تھا، Genoese، فونیشیا اور کارتھیج کے رہنے والوں کی طرح اور جنہوں نے بس یہی دریافت کیا تھا۔

اب جب میں رات کے اس پہر الانیا میں مٹر گشت کر رہی ہوں، میں ایک بار پھر خود کو سیدہ میں خیال کرتی ہوں۔ اس امید میں کہ اس قدیم شہر کے سنگ مرمر، بندرگاہیں میرے سوالوں کے

جواب فراہم کریں گی۔ میں پمفیلیا (Pamphylia) (بحیرۂ روم سے کوہِ طورس تک پھیلا ہوا ایشیائے کوچک کا ایک علاقہ) کے مرکزی دروازے سے گزری، جس کی گلیوں اور معبدوں کی ہم نے اکٹھے سیر کی تھی۔ میں وہاں کھڑی ہو گئی۔ سمندر کنارے اس کی ستونوں والی گلیوں میں اور خصوصاً اس کے چوک میں، مجھے ساتویں صدی میں اناروں کے پیڑ ملے۔ میں لیڈیا اور فارس کے لوگوں کے ساتھ چلتی رہی۔ دیکھتے ہیں ان اناروں کو کون جنگی بحری بیڑوں میں بدلتا ہے۔ انار کا ہر درخت کیسے غلاموں کی منڈیوں میں بکا تھا، کیسے ہرمز انہیں درمیان سے پھٹنے سے نہ روک پایا...... آہ ہرمز! تم ہمیشہ اپنے وجود اپنے جسم کے قبضے میں ہو، بڑے عضلات، چوڑی چھاتی...... جو ایک جسم ایک وجود میں تھے انہیں کس نے الگ کیا؟ دیوتا جنہوں نے Silenus کو Hermaphorditus پر فاتح بنا دیا تھا...... وہ دیوتا جنہوں نے ایفروڈائٹ کے بچوں کا خاتمہ کر دیا تھا تاکہ وہ خود معدوم نہ ہو جائیں۔ وہ پہلی علیحدگی پسند تھے اور اسی وجہ سے وہی تھے جو جلاوطنی کی وجہ بنے، Hermaphorditus کو شکست دی، جو ان کے Silenus کی جسمانی طاقت کے خوف کے سامنے ہار مان گیا تھا، اس امید کے ساتھ ایک خاموش اتحاد قائم کرنے کے لیے کہ اس دنیا میں ایک بار پھر ایسا گوشہ تلاش کر لے جہاں وہ پناہ لے سکے۔

جہاں تک اصل بحیرۂ روم کی بات ہے، کسی کو یاد نہیں کہ یہ کبھی پھٹے ہوئے انار جیسا تھا۔ الانیا تک جانے کے لیے ہم نے جو 20 میل کا سفر کیا تھا یہ اس سے واضح تھا کہ وہ جو پہاڑوں سے اتر کر نیچے آئے تھے وہ علیحدگی، جدائی یا مہاجرت کی زمین میں پوری طرح رچ بس گئے تھے، کہ انار کو ٹکڑوں میں توڑتے ہوئے انہوں نے اسے کیلوں اور ترنج کے پھلوں کے مقابلے میں ایک طرف رکھ دیا تھا۔ یہ الانیا مارکیٹ میں، یہاں فطرت میں اور لوگوں میں بالکل واضح تھا۔

وہ انار کا موسم تھا، زرد انار لگتا تھا کہ کسی گوشے میں دست بردار ہو چکا تھا، بھلائے جانے اور نظروں سے پرے ہو جانے پر مجبور اور محض انجیر سے کہیں زیادہ ساکت اور خاموش۔ میں نے مارکیٹ سے تین انار خریدے۔ گوشت اور مچھلی، باسی گلی سڑی سبزیوں، گلے ہوئے انگوروں، انڈوں کی یاد دلاتے پیازوں کی بوریوں کی باس میں ایک قطار میں تین انار رکھے تھے۔ انار، عاشورہ کے مہینے تک انتظار کریں گے۔ وہ اس مکسچر کو سجائیں گے۔ ان کی غیر معمولی خاطر مدارت کی جائے گی۔ وہ گاؤں سے نقل مکانی کرنے والے اور شہر میں دربان یا چوکیدار بن جانے والے کی طرح ہوں گے۔

جہاں تک کیلوں کی بات ہے، وہ اب ہر موسم میں دستیاب ہوتے ہیں۔ کیلشیم کاربائیڈ سے بھرے۔ وہ بے ذائقہ اور کسی خوشبو کے بغیر ہیں۔ مگر ان کا دم خم اور نزاکت اسی طرح ہے۔ یہ شیخی بازی اناروں کو شکست دے دیتی ہے۔ عاشورہ کے مہینے کے علاوہ، لارل کی شاخیں جو وہ اپنے سروں پر لگاتے ہیں، مرجھائی ہوتی ہیں۔ برابری و مساوات کی دیوی بہت بوڑھی اور تھکن زدہ ہے۔ انار، جنہیں تجارت یا لین دین نے ایک طرف سرکا دیا ہے، کسی گلاب کی طرح سرخ ہیں، جن کی سرخی یا شگفتگی، ساحل، پہاڑوں، سمندر تک پہنچ رہی ہے، ساحل پر حُسن کے احساس پر زور دے دے رہی ہے، لیکن اب کوئی بھی اس مرکزی رنگ کو اپنی ہر قسم میں انار کے رنگ کے طور پر نہیں سوچتا۔

اس سڑک پر جو مارکیٹ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی، نوجوان اپنی شور مچاتی موٹر سائیکلوں پر ایک ایک کر کے گزرے۔ ان کی چوڑی سیاہ شلواریں ہوا میں پھڑ پھڑائیں۔ وہ ابھی نہیں جانتے کہ ان میں سے ہر کوئی خود ایک انار تھا۔ ان کی شلواروں پر قرمزی کمر بند نے انہیں کچھ دھوکا دیا اور ان کی پیشانیوں پر آئے ان کے سنہری بال، ان کے گہرے سرخ رخسار......

اخبارات اور کتابیں بیچنے والے شخص کے بچوں نے ہائی سکول سے گریجویشن کی تھی۔ انہوں نے استنبول نقل مکانی کر لی تھی۔ دکان ایک بھتیجے پر چھوڑ دی گئی تھی۔ بھتیجے نے میرے لیے چائے آرڈر کی۔ اپنے تین انار، الکوحل کی بوتلوں اور سگریٹوں کے ساتھ جو میں نے Tekel (تمباکو اور سگریٹ ترک حکومت کی اجارہ داری میں Tekel ہی فروخت کرتی ہے) سے خرید کر بیگ میں رکھے تھے، میں نے اخبارات کا انتخاب کیا۔

مجھے ابھی تک جن کے لیے ٹانک واٹر اور ٹانک نہیں ملے تھے، جو میں فواد کو پیش کرنا چاہتی تھی۔ مجھے وہ تلاش کرنے تھے۔ مجھے جلدی کرنی تھی۔ تقریباً دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ مجھے واپس بھی جانا تھا۔

اور ہو سکتا ہے کہ کوئی میری توقع اور امید سے جلدی پہنچ جائے۔

میرا بیگ بوجھل تھا۔ میں خود بھی بوجھل تھی۔ سب کچھ بوجھل تھا۔ لیکن آخرکار مجھے ٹانک واٹر کی آٹھ بوتلیں مل گئی تھیں۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی، فواد خوش ہوگا۔

پہلی مرتبہ مجھے مانوس جانی پہچانی مارکیٹ بھی اجنبی لگی تھی۔ حتیٰ کہ کراہت انگیز۔

علیحدگی یا مہاجرت کا احساس طاقت پکڑ گیا تھا۔ سیاحت سے متعلق لوگ اُس جانب، دکان دار اِس جانب۔ آئس کریم شاپ درمیان میں تھی۔ دکان کا اگلا حصہ کسی ڈانس پارٹی کی بچی کھچی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔

ایک بال روم یا رقص گاہ جو دن نکلنے پر خالی کی جا چکی تھی۔ پورا الانیا ہی ایسا تھا۔ دعوت ختم ہو چکی تھی۔ سب کچھ گندا اور جلا ہوا تھا۔ پیروں تلے کچلے ہوئے پھول، جھنڈیاں، رنگین کاغذوں کی کترنیں، وہ پھٹی ہوئی اور الجھی ہوئی حالت میں فرش پر بکھرے تھے، ان میں سے کچھ سرخ مینار کی دیواروں پر چپکنے یا لٹکنے کی جگہ ڈھونڈ رہے تھے، لیکن وہ کیکٹس کے ان بے شمار پودوں سے ہی الجھ یا چپک سکتے تھے جو رستے میں آتے تھے۔ یہ کیکٹس اپنی قدوقامت میں خاصے بڑھ گئے تھے، قلوپطرہ کے انتقام کی بے رحمی اس کی محبت جتنی تھی، غلام لا کر پھینکے گئے، جیسے ان کی ہڈیوں سے سارا گوشت اتار لیا گیا تھا، قلعوں کی برجیوں سے لا کر سمندر پر، ساحلوں پر، راکی کی خالی بوتلوں کے ڈھیر...... (یہاں راکی کی خالی بوتلیں...... قلوپطرہ کے غلاموں کی طرح قلعوں کی برجیوں سے گھسیٹ کر پھینکی گئی...... اسے ان عورتوں کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو اپنے شرابی شوہروں کے ہاتھوں زدوکوب ہوتی ہیں: وضاحت)۔

سیاحوں کی چیزیں بیچنے والے، قالین بیچنے والے، تانبا...... سلطان عبدالمجید کے بالکل کل ہی تانبے پر نقش کیے گئے مونوگرام...... (سلطان عبدالمجید نے تنظیمات کے نفاذ کا اعلان کیا تھا، وہ اصلاحات جنہوں نے 1839ء میں ترکی کی ماڈرنائزیشن کا آغاز کر دیا: وضاحت)...... ایک تھکا دینے والے دن کے بعد کسی نائٹ کلب جانے کی تیاری میں چمڑے کے ڈیلر، حشیش کے ڈیلر۔ وہ اب اپنے دروازوں میں داخل ہونے والے گاہکوں پر توجہ نہ دے رہے تھے، ان کے لیے کوئی تکلیف نہ اٹھانا چاہتے تھے...... وہ نہاتے دھوتے، ٹائی لگاتے، ''استنبول'' جاتے...... سب سے بڑے نائٹ کلب...... اسے اپنا بنانے کو۔ آپ انہیں بڑے شہروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر جو جانتے بوجھتے بے دھوپ، تاریک اور سگریٹوں کے دھوئیں سے بوجھل رکھی جاتی ہیں اور کئی بدنام جگہوں پر۔ جہاں تک دکان داروں اور دہقانوں کی بات ہے، وہ سب دندان ساز کے سامنے قطار بنائے کھڑے ہیں تاکہ اپنے سارے صحیح دانت نکلوا دیں اور کسی چمک دار زرد دھات کے یا اس کے

خول والے نئے دانت لگوالیں۔ کیا خدیجہ نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں کہا نہیں تھا کہ ''ہم 80 ہزار ادا کریں گے اور پھر میں اپنے دانت پر سونے کا خول چڑھوا لوں گی''؟ تو پھر بازو میں سونے کے بریسلٹ، گردن میں سونے کے پانچ سکوں کی جگہ ایسی چیز نے لے لی جس کی حفاظت نسبتاً آسان تھی، جو اپنی جڑ سے جسم میں جڑا ہوتا؟...... جہاں تک میرچ بھی بات تھی تو اسے خدشہ تھا کہ اس کا خول والا دانت، جسے اصل سے الگ نہیں پہچانا جا سکتا تھا، اچانک کسی بالکل غیر متوقع وقت پر ڈھیلا ہو جائے گا......

قدیم شہر کے سنگ مرمر سفوف بن رہے تھے۔ ایتھینا ٹیمپل سے یونیورس ٹی ہاؤس لائے گئے Corinthian کیپٹل کے اوپر، انہوں نے نلکے والا ملمع کاری والا کنستر رکھا ہوا تھا۔ جب ہم نے شہر کے جنوبی ساحل پر چہل قدمی کی، ہم نے عبادت کا کمرا بھی دیکھا تھا، جس کی سطح کو عوامی ٹوائلٹ بن جانے والے میڈوسا (Medusa) سروں سے سجایا گیا تھا، فیثاغورث لائبریری صرف رنگ رلیوں کے لیے مخصوص تھی...... ایک، سہ پہر ہمیں چھوٹی چھوٹی نیکروں میں ملبوس، درد کش دوا کے ساتھ بیئر پیتے، بیٹھے گٹار بجاتے، بیئر کی بوتلوں کو ستونوں سے ٹکرا کر توڑتے ہوئے تین لڑکے بھی فصیلوں کے اندر دکھائی دیئے تھے۔

یا پھر، کیا ہم نے نہیں دیکھا؟

میں الانیا سے واپسی پر ایک نئی منی بس میں تھی۔ نئی تہذیبیں: خبردار وہ گرین ہاؤسز، پانی کے پمپس، کنویں، موٹل، نئی طرزِ تعمیر، کنکریٹ کی چار ٹانگوں پر دو بھدے طریقے سے بنائی گئی منزلیں اور رنگین پلاسٹک سے بنے پانی کے بڑے بڑے پائپ...... منی بسوں پر بوریوں میں لادی گئی کیمیائی کھاد، زرعی کیڑے مار دوائیں...... اور جمائیاں لیتے، تھکن زدہ چہروں پر، صحرا میں شیشے کے کسی ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی طرح چمکتے سونے کے دانت......

میں بھی وہاں ہوں: ڈینٹسٹ چیئرز بنانے پر فواد کے اناڑی پن کے لیے میری محبت، میرا اپنے بیگ میں ٹانک واٹر ہونے پر خوش ہونا، میرا اپنی روح کی نگاہوں کو سنگ مرمر پر جمانا، چالیس میل دُور قدیم شہر کے معبد کی دیواریں، میرا ہماری اپنی نظم کو مقدس قرار دینا، تمام شاعرانہ چیزوں کے لیے میری تمنا، میری چاہت...... آرزو۔ یہ تمنا اس منی بس میں سوار لوگوں کے لیے اجنبی ہے، کیلوں

کے جھنڈ میں آگے بڑھتی اس سڑک کے لیے، اس زمین کے لیے جو سمندر تک اترتے ہوئے پہاڑوں کے سروں تک پھیلی ہوئی ہے، ان کے لیے جنہوں نے اس زمین پر ایک کے بعد ایک شیشے کے گھر بنائے اور سب سے بڑھ کر یوسف کے لیے......

اس سہ پہر نیچی سے کھڑکی سے اپنا سر گھر کے اندر گھساتے ہوئے اُس نے میری جانب دیکھا جب میں ٹائپ رائٹر کے بٹن متواتر کا دبا رہی تھی۔ اس نے مجھے دوبارہ بے آرام کر دیا۔ مجھے دیکھا جا رہا تھا۔ بالکل تب جب میں تمنا کی اس شاعری، جو جہاں میں تھی اس سے اجنبی تھی، کی تلاش کے بالکل دہانے پر تھی، میں نے اسے ہاتھوں سے پھسل جانے دیا۔ میں سمجھ نہ پائی کہ میں اچانک سیدہ میں کیسے تھی جب کہ میں الانیا میں تھی، میں اناروں میں اس قدر گم کیسے ہو گئی تھی، میں نے ہرمز کو کیوں پکارا تھا، چاہے جب میں نیچے ساحل پر آ رہی تھی یا جس وقت میں شہر گئی تھی، میں نے چاہت کو زیادہ شدت سے محسوس کیا تھا۔ میں اب بھی ویسی ہوں۔ لیکن اس کی اب مزید کوئی اہمیت نہیں ہے: میری دنوں کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھانے کی، صدیوں کو ایک دوسرے میں گڈ مڈ کرنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں تمنا کے کھنڈرات میں بھٹک رہی ہوں۔

میں اچانک رک گئی۔ میرے اندر کسی قسم کا خوف، میں ایسے علاقے میں ہوں جو زیر آب چھوڑ دیا گیا تھا۔ راتیں اب ٹھنڈی ہیں۔ اب مجھے ضرور بستر پر چلے جانا چاہیے۔ مجھے بستر پر جاتے ہوئے کھڑکیاں ضرور بند کر دینی چاہئیں۔ کل مجھے ضرور قادر کو بیڈ روم کی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شٹر اور دروازے کی چٹخنی کی مرمت یاد دلانی ہوگی۔ مجھے اس چٹخنی کی مرمت کروانی ہوگی، اگر اس کے ذریعے نہیں تو پھر تعمیراتی جگہ پر کام کرنے والے کسی مزدور کے ذریعے۔ چوں کہ اب میں واپس جانے والی ہوں تو مجھے اس کام کو مزید نہیں ٹالنا چاہیے۔ میں اسے ہمیشہ ٹالتی رہی ہوں۔ یوں جیسے خود میں کبھی واپس نہ جاؤں گی۔ یوں جیسے دروازے اور کھڑکیاں بہار کے خواب کے سے اختتام پر کبھی بند نہ ہوں گے۔ اصل میں مَیں تمام مسلسل ختم نہ ہونے والی بارشوں کے دوران یہاں ہوں گی۔ میں اندر آتش دان میں آگ جلاؤں گی۔ لکڑیوں سے اٹھنے والے سرخ شعلوں میں اپنے اُن اندرونی گوشوں کو گرمائش دوں گی، جو اچانک سرد ہو گئے ہیں۔

لیکن چوں کہ مجھے جانا ہے اس لیے مجھے کل قادر کو بتانا ہوگا۔

مجھے رات کی خاموشی میں مزید خلل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے قادر کو اس گھر کے آس پاس چکر لگانے کے لیے اس سے زیادہ مجبور نہیں کرنا چاہیے جتنا وہ کر پائے، اس کو چوکیداری والی سیٹی کو اس سے زیادہ بجانے پر زور نہیں دینا چاہیے، جتنی وہ بجا سکے یا زیادہ دیر تک۔ مجھے کچھ گھنٹوں تک یہ باتیں کہنا یا بتانا ملتوی کرنا ہوگا۔ مجھے اب بستر پر جانا ہوگا۔

☼

جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں، سورج صنوبر کے جنگل سے آگے گزر چکا تھا۔ روئی جیسے بادلوں کے درمیان تیرتے ہوئے وہ بندرگاہ سے اوپر طلوع ہو چکا تھا...... رات کو اپنی نیند میں، مَیں نے خیال کیا تھا کہ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں جاگتے ہی باہر باغ میں چلی گئی۔ زمین پر بارش کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ وہ حتیٰ کہ شبنم سے بھی گیلی نہ تھی۔ جڑی بوٹیاں، ٹیرس کا کنکریٹ کا فرش، لکڑی کے جنگلے، سب کچھ بالکل خشک تھا۔ لیکن پھر بھی ہر طرف بارش کی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔

یہ اب بھی ایسا ہے۔ صنوبر کے درخت ساکت ہیں۔ بندرگاہ ساکت ہے۔ پھر بھی نقرئی پروں والے پرندے پانی کی سطح پر نہیں اڑ رہے۔ سمندر اپنی مخملیں نرمی کے ساتھ رینگتے ہوئے خاصے بڑے علاقے پر پھیل چکا ہے۔ وہ روئی جیسے بادل رفتہ رفتہ گہرے ہو رہے ہیں اور دوپہر سے پہلے انہوں نے سورج کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔ سمندر کی رنگت گہری ہو گئی۔ میں اپنا تیراکی کا لباس پہن کر وہاں نیچے جانا چاہتی تھی لیکن پانی نے مجھے اپنی جانب نہیں کھینچا۔ میں آتش دان میں آگ جلانا چاہتی تھی۔ یوں جیسے میرا اندروں سرد ہونے کو تھا، میں اپنے دل کو گرمائش پہنچانا چاہتی تھی: جس روز فواد آیا، اسی صبح حسن آیا، میرچ اور دوآن کو گلے لگاتے ہوئے، محمت کو اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے......

کچھ دیر پہلے خدیجہ آئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ بچے سو رہے تھے...... وہ باہر رکھے بنچوں میں سے ایک پر خود ہی بیٹھ گئی تھی۔ اپنی قمیص سے اس نے چار حصوں میں تہ شدہ ایک کاغذ نکالا۔
''کیا آپ اسے پڑھ سکتی ہیں؟ قادر کہتا ہے کہ اس نے کھیت، گھر میرے نام کر دیا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ کیا واقعی اُس نے ایسا کیا ہے؟''
میں ہنسنا چاہتی تھی لیکن خدیجہ خاصی سنجیدہ تھی۔ اس کی کچھ سنجیدگی مجھ تک سرایت کر گئی۔

''تمہارا خاوند تمہیں دھوکا نہیں دے گا، ہے ناں، خدیجہ خانم؟''

جیسے ہی میں نے یہ کہا مجھے یہ بے حد مضحکہ خیز لگا، میں بے آرام ہوگئی۔لیکن خدیجہ نے پرواہ نہ کی۔وہ بڑے جانے بوجھے انداز میں اپنا سرنفی میں ہلاتی رہی۔''کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ اس کا شوہر کیا کرے گا؟ آپ کیسے جانتی ہیں کہ وہ اسی طرح کسی اور لڑکی کی تلاش میں نہیں ہوگا جیسے وہ میرے پیچھے تھا؟''

اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور پھر اس نے میری عریاں بانہوں اور میرے چہرے کو یوں دیکھا کہ میں الجھن میں پڑ گئی اور میری زبان نے میرا ساتھ نہ دیا۔میں نے جلدی سے اپنے لباس کے بٹن بند کیے، میں نے سوچا کہ میں اس نگاہ سے اسی طرح خود کو آزاد کروانا چاہتی تھی جیسے کوئی قالین کو جھاڑتا ہے۔پھر میں نے خود کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، میں اتنی مضحکہ خیز لگ رہی تھی کہ چاہتے ہوئے یا نہیں، میں نے ایک بڑا سا بناوٹی قہقہہ لگایا۔اور خدیجہ نیم شک سے ہنس دی،''اوہ، آپ ہنس دیں؟''

لیکن اس کی ہنسی اس حقیقت کو مزید واضح کر رہی تھی کہ اس کا وجدان درست تھا۔یقیناً خدیجہ نے پیش بندی کی تھی کہ قادر کسی دوسری عورت کے پیچھے نہ جائے۔اس نے اس بارے میں سوچا اور اس کا حل نکالا تھا۔اس نے اپنے تحفظات بیان کیے: عثمان کافی نہ ہوگا...... یوسف دوسرے شوہر سے ہے...... اسے ایک کے بعد ایک، قادر کے لیے اور بیٹے جنم دینے کی ضرورت تھی، یہ پہلی بات تھی۔دوسرے، وہ اس تعمیراتی جگہ کی طرف، جہاں مزدور تھے، اپنے بازو پھیلا کر ان کے سامنے اپنے جسم کی نمائش کرنے والی تھی۔تیسرے،''میں اپنے لیے کولون کی بڑی سی بوتل لوں گی۔ہر رات، ہر صبح، میں وہ اپنے پورے جسم پر چھڑکوں گی......''

میری نگاہیں بلا ارادہ اس خوشبو دار لوشن کی بوتل پر پڑیں، جو میں نہانے کے بعد کبھی کبھار اپنی ٹانگوں اور بازوؤں پر لگایا کرتی تھی، میں وہاں حیران کھڑی رہ گئی۔اور مجھے رات کو اتنی دیر سے نہیں سونا چاہیے...... یہ فیصلے میرا دم گھونٹ رہے تھے۔سب سے بڑھ کر، خدیجہ کے قادر کو ہر طرح سے مضبوطی سے اپنے سے جوڑے رکھنے کے فیصلے کے سامنے میرا اس بارے میں تذبذب کہ میں حسن سے اپنا رشتہ توڑ دوں یا مضبوط کروں...... میری اس کے ساتھ یہاں ایک مرتبہ پھر اکٹھا

ہونے کی تمنا اور میری یہ خواہش کہ اس کے آنے سے پہلے یہاں سے بھاگ جاؤں کیوں کہ وہ پانی کا والو بند کرنا بھولا نہیں تھا...... میری ہچکچاہٹیں...... اگر فواد عین میری اس ہچکچاہٹ کے بیچ نہ آ گیا ہوتا تو میں مخالف سمت میں بھاگ چکی ہوتی اور بہار کا یہ اختتام کبھی نہ جیا گیا ہوتا۔

اس صبح وہاں ہم تین تھے۔ حسن اور فواد، سکول کے برسوں کی تھکن اتارتے دو طلبا کی طرح، گہری نیند بے خبر سو رہے تھے۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ جنگل پر پھیکی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ سمندر کی نمی، موسم گرما میں شمال کی طرف پہاڑوں کی جانب واپس پلٹ چکی تھی اور گہرے بادل ساحل پر چھانے کے منتظر تھے۔ میں کچن کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ لہریں تاریک اور بڑی بڑی تھیں۔ سمندر اور آسمان تقریباً ایک سے دکھائی دے رہے تھے۔ اگرچہ دونوں میں سے کوئی بھی غضب ناک اور متلاطم دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے Turner کی پینٹنگز کی یاد دلا دی۔ شاید مجھے جس چیز نے اس کی یاد دلائی وہ میرے اردگرد پھیلے سرمئی زرد رنگ تھے۔

اور پھر ہوا چلنے لگی۔ میں پُرامید ہو گئی۔ ہوا بادلوں کو بکھیر دیتی۔ ابھی موسم گرما کا اختتام نہیں ہونے جا رہا تھا۔ سب کچھ نکھر جائے گا، صاف اور روشن ہو جائے گا۔ حسن جلد ہی جاگ جائے گا اور وہ جاگتے ہی سمندر کی جانب بھاگے گا۔ فواد بھی۔ میں انہیں ہلانا، ان دونوں کو جگانا چاہتی تھی کہ تا کہ ہم اور وقت ضائع نہ کرتے لیکن میں نے خود کو روک لیا۔ میں ایک اچھی، محبت کرنے والی ماں تھی۔ حسن چند گھنٹے پہلے ہی پہنچا تھا اور فواد بھی پچھلی رات تھوڑی دیر ہی سو پایا تھا۔ میں نے انہیں ان کے خوب صورت خوابوں میں رہنے دیا۔ میں ساحل پر سیر کے لیے چلی گئی۔

میں وہاں اپنے نہانے کے لباس میں جانے اور تیر کر گھر واپس آنے کا سوچ رہی تھی، جیسے ہی میں ایسا کرنے کے بارے میں پُرجوش ہوئی مجھے معذور لڑکے کی اداس پریشان کرنے والی نگاہ کا سامنا ہوا جو دو راتیں قبل میرے لیے پروپین ٹینک لایا تھا۔ وہ وہاں کھڑا تھا، بظاہر دھند لکے میں اپنے گنجے سر کے ساتھ ہر چیز پر غالب آتے ہوئے اس کی آواز یوں لگتی تھی جیسے اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ میں نے اپنا نہانے کا سوتی لباس پہنا اور اسی طرح ساحل کی طرف چلی آئی۔ میں جلد ہی معذور لڑکے کو بھول گئی۔ موسم اس وقت سرد اور بے حد اچھا تھا۔

نیچے ساحل پر جانے کے لیے اگر آپ سمندر یا تعمیراتی جگہ کے قریب سے نہیں گزرتے تو

آپ کو ہمارے سامنے موجود چھوٹی کھاڑی کی شمالی جانب عمودی چٹانوں پر سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ وہ خاصی مشکل چڑھائی ہے اور اس وجہ سے یہ آپ کے اندرونی شک و شبے اور آپ کے گھرے ہونے کے احساس دونوں کو بھلا دیتی ہے۔

میں پوری کوشش کر رہی تھی کہ ٹھوکر کھا کر گر نہ جاؤں اور اس نے مجھے آزاد ہونے اور صبح کے بازوؤں کو پرے دھکیلنے میں مدد دی، جو مجھے دوبارہ سونے کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ میں آہستہ آہستہ حواسوں میں آ رہی تھی۔ میں نے لمحے بھر کو چٹانوں پر ٹھوکر کھائی اور رک گئی۔ میں نے اپنا رخ گھر کی جانب یہ دیکھنے کو موڑا کہ آیا ان میں سے کوئی جاگا تھا یا نہیں، آیا میں فواد یا حسن کو ٹیرس پر دیکھوں گی۔ وہاں دونوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ لیکن مجھے وہاں ایک براؤن سر دکھائی دیا جو تیزی سے گھر کی مغربی جانب صنوبر کے درختوں میں سے ہوتا ہوا گزرا اور راستے اور کھیتوں کو الگ کرنے والی پتھر کی دیوار کے قریب اچانک غائب ہو گیا۔ وہ دیوار کے قریب تیزی سے دکھائی دیا اور غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ شاید میں ابھی تک کچھ نیند میں ہی تھی۔

معذور لڑکے کا جسم، جو ڈائنامائٹ کے دھماکے کے بعد مفلوج ہو گیا تھا، میں چاہوں یا نہیں، میری آنکھوں کے سامنے کبھی کبھار آ جاتا ہے۔ ایسا اب بھی ہوتا ہے...... خدیجہ نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس نے میرے اندر گہرا نشان چھوڑا ہوگا، میرے علم میں آئے بغیر غیر معمولی طور پر تیز رنگوں سے کوئی تصویر کھینچ دی ہوگی...... وہ تصویر اس قدرتی منظر کے برعکس تھی، ساحل پر بسر کیے گئے انتہائی خوب صورت دنوں کے برعکس۔ اگرچہ ہم نے اسے زیادہ سے زیادہ صرف تین بار ہی دیکھا تھا لیکن ہمارے لیے اس کے مکمل طور پر مضروب جسم کے بارے میں سوچنا ناگزیر ہی تھا، وہ خرخراتی آواز۔ وہ قادر کے حکم بجا لانے کی اپنی سی کوشش کرتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ ہماری نگاہوں کے سامنے کبھی نہ آتا۔ کیوں کہ وہ خود کو دنیا سے پوری طرح مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے گوشہ نشین ہو چکا ہے۔

میں نوکیلے پتھروں اور چٹانوں میں موجود گہری دراڑوں کو پھلانگتی ہوئی نیچے تنہا الگ تھلگ ساحل پر چلی گئی۔

فواد نے یہاں اپنی پہلی صبح خیال کیا تھا کہ وہ ان تیز نوکیلے پتھروں کو کبھی عبور نہ کر پائے

گا۔دو چٹانوں کے درمیان بے یقینی اور گومگو کے عالم میں رکتے ہوئے وہ واپس جانا چاہتا تھا،''کیسا ہو اگر میں تیرتے ہوئے اُدھر آ جاؤں؟''

''ٹھیک ہے۔لیکن چٹانوں کی اس جانب اس قسم کے درخت ہیں جو تم نے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔سلک کے درخت..... کیا تم انہیں دیکھنا نہ چاہو گے فواد؟''

فواد نے اس بارے میں سوچا،ان بہت سی چٹانوں پر نگاہ دوڑائی جنہیں اسے ابھی عبور کرنا تھا،سلک کے درخت دیکھنے کے بارے میں اپنا فیصلہ بدلا اور اپنی گردن جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس نے پانی کے قریب چٹانوں میں سے ایک پر سے سمندر میں چھلانگ لگائی اور جب تک میں ساحل پر پہنچی وہ واپس آ گیا۔ہم ساحل کی ریت پر پھیلنے والی لہروں کے ساتھ ساتھ کچھ دیر بھاگتے رہے۔پھر ہم جنگل میں چلے گئے۔وہ خاصا لمبا پیدل راستہ تھا۔دن ڈھل رہا تھا لیکن موسم پُرسکون اور گرم تھا۔ہم نے بہت کم بات کی۔جس وقت ہم جزیرہ نما کے جنوب مغربی سرے پر موجود جنگل کے کنارے پہنچے،سورج غروب ہو چکا تھا۔پانچ دن کا چاند،ہلال ابھی ہمارے سامنے ظاہر ہوا تھا۔ اس کی نوک کے قریب ستارہ اس سے کچھ دُور تھا،کچھ اکیلا،اداس۔

ہم نے صنوبر کے قدآور گھنے درختوں تلے جزیرہ نما کی سیر کی۔پھر ہم بھربھری چٹانوں کے قریب پہنچ گئے۔ہم نے سنہری شفق میں ڈوبتے سورج کی کرنوں کو سمندر پر بہتے دیکھا۔بالکل مخالف سمت،خاصے فاصلے پر موجود گھر اس وقت سایوں میں ڈوب چکا تھا۔چیونٹیوں جیسے دکھائی دیتے مزدور چٹانوں پر،ساحل پر پھیل گئے اور سمندر میں اتر گئے۔اب سورج جلدی ڈوب جاتا ہے۔کام ابھی ختم ہوا تھا۔اس روشنی میں اور اتنے فاصلے سے،مزدور جو گھر کے اس قدر قریب تھے، اصلی دکھائی نہیں دیتے تھے۔

یہ کس قدر اچھی بات تھی کہ فواد اور میں اس وقت ساتھ ساتھ تھے!ہم نے اسے محسوس کیا۔لمبی خاموشی کے بعد میرے بھائی کی آواز نے واضح طور پر اس کی طرف اشارہ کیا،''میں ایک لامتناہی طمانیت محسوس کر رہا ہوں،حتیٰ کہ سکون......''

اٹل،ناگزیر چاہت کے ساتھ میں نے اپنا ہاتھ اس کے سانولے اور گرم ہاتھ پر رکھ دیا۔ہم اس قدر قریب کبھی نہیں رہے تھے۔شہر میں فواد ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ فون کر لیتا تھا اور وہ

ہفتے میں ایک مرتبہ ملنے بھی آیا کرتا تھا۔ ایسے وقت بھی ہوتے جب وہ اس معمول کو توڑنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ اپنی عادتیں ختم کرنے میں بھی سست تھا۔ ''اس ہفتے مجھے کافی کام ہے۔ شاید میں اس ہفتے تمہیں دوبارہ فون نہ کر پاؤں۔ میں آج رات فارغ ہوں، اگر تم بھی فارغ ہو تو کیا تم میرے ساتھ ڈنر پر جانا پسند کرو گی؟''

اس کی آواز پوری طرح ایک بھائی کے احساسِ ذمہ داری، اُس کے بوجھ میں ڈوبی ہوتی۔ احساسِ ذمے داری سے جنم لینے والی قربت کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے میں اس سے بالکل ہی اکھڑ جاتی، ''ہم ان گندے ریستورانوں میں کیا کریں گے؟ اگر تمہارے پاس جانے کو کوئی بہتر جگہ نہیں ہے تو یہاں آ جاؤ۔ اگر تم پسند کرو۔'' اور اس مرتبہ میرا خدشہ، یہ سوچتے ہوئے کہ کیا ہو اگر وہ کہہ دے، ''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔'' اور مجھے اسے دعوت دینے میں خلوص کی کمی جو میری آواز ہی سے اس قدر عیاں ہوتی کہ فواد آنا ہی نہ چاہتا۔ ہم حتیٰ کہ مزید فاصلے پر چلے جاتے۔ بیشتر اوقات میں حیرت زدہ ہوتی کہ ہم نے اتنے سارے الفاظ ایک تار کے ذریعے آخر کیوں ادا کیے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو آخر کیوں مسلسل کچوکے دے رہے اور پرے دھکیل رہے تھے؟......

''تمہیں ضرور بہت تکلیف ہوئی ہوگی!''

اس نے وہاں بھر بھری چٹانوں کے بیچ میرا ہاتھ اپنے رخسار سے لگا کر کہا۔

میں پہلی مرتبہ، واضح طور پر، اس میں سے بلا جھجک بہتی گرم جوشی کو محسوس کیا۔ میں کچھ نہ بول پائی۔ میں نے خود کو اس سے مجھ تک آتی حدت یا گرم جوشی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ فواد اپنے پیروں پر اچھل پڑا، ''ہمیں جلدی کرنی چاہیے نوین! حسن اب آنے والا ہوگا!''

وہ مخلص تھا۔ غم یا اداسی کو پیچھے ہٹانے ختم کرنے کی خواہش میں اور یہ اظہار کرنے میں بھی کہ اس نے حسن کی حقیقت میں کمی محسوس کی تھی۔ اچانک میں بھی بے صبر ہوگئی۔ میں نے حتیٰ کہ یہ بھی سوچا کہ واپسی پر جنگل کے راستوں کے کسی موڑ پر میرا اچانک حسن سے سامنا ہو سکتا تھا۔ میرے اندر موجود شک مٹ چکا تھا...... میں مین روڈ سے گزرنے والی ہر گاڑی کو یہ سوچتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ اس میں حسن تھا یا نہیں۔ اگرچہ سڑکیں جن پر حسن سفر کرتا، وہ طویل تھیں۔ چاہے وہ کہیں نہ رکتا تو بھی وہ نصف شب سے پہلے ہم تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

وہ صبح کے قریب ہی یہاں پہنچ پایا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں تھکن سے سرخ تھیں۔ اس کے ہونٹ تھوڑے سے سوجے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی ایک خوش باش حسن، بچوں کی طرح مسرور۔ ایک ایسا حسن جس نے پہلے پہل مجھے بہت حیران کیا، اس نے ان دنوں کومزید خوب صورت بنانے کا عہد کیا تھا جنہیں خوب صورت بنانے کی تمنا کی گئی تھی۔ اسے دھکیلے، زبردستی کیے بغیر۔ آنکھ مچولی کھیلتے کسی شخص کی طرح وہ اچانک آپ کے سامنے ہر گوشے سے جھانکتا ہے، اپنے سامنے موجود لوگوں کو "Boo" کہہ کر چونکاتے ہوئے، اور اس سے بے حد لطف اٹھاتے ہوئے۔ ایک بالکل نئی چیز جو میں نے اس میں دیکھی، ایک ایسے جوکر کی سی خصوصیت جو اپنے گردوپیش کو ہر لمحے خوش اور محظوظ رکھتا ہے۔ بظاہر ایسی مزاحمت سے جو کچھ کھو گیا تھا اس نے اس کی جگہ پُر کردی تھی۔ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی نیچے سمندر کو چلا گیا۔ چاند خاصا بڑا تھا اور پانی تقریباً روشن، فواد اور میں نے اوپر سے دیکھتے ہوئے، کاغذ پر کسی گہرے رنگ کے سٹکر کی طرح، اس پانی میں حسن کا بالکل برہنہ جسم پہچان لیا تھا۔ فواد کچھ شرمیلا تھا۔ اس نے حسن کو اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ہم اندر چلے گئے۔ ہم نے حسن کے لیے ناشتے کی میز سجائی، جو سمندر سے واپس آنے ہی والا تھا۔ میری تمنا تھی کہ عندلیب گیت گانے لگیں...... ان کے لیے، اس شبے اور سوال کو پھر سے ڈھانپ لیں جو دوبارہ میرے اندر سر اٹھانے لگے تھے...... جہاں تک حسن کی بات تھی، ناشتے کی میز پر بھی اس کی آنکھیں بند تھیں اور پھر بھی خود کو بار بار ہلاتے ہوئے اس نے ہمیں اپنے ناقابل تصور لطیفوں سے ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔

پھر وہ آرام کرنے چلے گئے۔ میں اکیلی عندلیبوں کے گیت سنتی رہی۔ سورج طلوع ہوا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ آسمان کا شمالی حصہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا......

تب میں چٹانوں سے آگے اور نیچے ساحل پر چلی گئی۔ کہیں کوئی بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے حتیٰ کہ قادر بھی دکھائی نہ دیا جو میرا خیال تھا کہ کسی چٹان کے قریب یا سِلک کے درختوں کے آس پاس اپنے کندھے پر بندوق لٹکائے اپنی گردن میں لمبا سا براؤن سکارف ڈالے میرے سامنے آجائے گا۔ جہاں تک اس بھورے بالوں والے سر کی بات تھی جو کھیتوں کی منڈیر کے قریب مجھے دکھائی دیا

تھا۔ اس نے مجھ میں کوئی مبہم سا نشان چھوڑا ہوگا جو کسی بڑے سے رات کے پرندے کے وہاں سے پرواز کرنے اور کسی اور جگہ جا بیٹھنے سے رہ گیا ہوگا۔ کیوں کہ صرف اب جب میں اس صبح کا بتا رہی ہوں جس کا اختتام ایک تنہا اداس سہ پہر پر ہوا تھا، کیا میں شعوری طور پر سمجھتی ہوں کہ میں صبح کی اس تنہا سیر میں کوئی ایسی چیز دیکھی تھی۔

جہاں سمندری لہریں پیچھے ہٹی تھیں وہاں چھوٹی چھوٹی کنکریوں نے پتلے سے نیکلس بنا دیئے تھے۔ میں اپنی سکرٹ کمر میں اڑس کر، جوتے ہاتھ میں اٹھا کر ننگے پیر چلتی رہی، اس بارے میں محتاط کہ ریت پر لہروں کے پلٹنے سے بننے والے وہ نیکلس توڑ نہ دوں۔ جیسے جیسے آپ جنگل کے قریب جاتے، وہ کنکریاں بڑی ہوتی جاتیں۔ آپ سمجھتے کہ آپ کسی کھاڑی کی تہ میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک دن قبل، رات کو، ہم ان پر سے پھلانگ کر آگے بڑھے تھے۔ لیکن صبح کو، میں واپس پلٹ گئی۔

جب میں اس مقام پر پہنچی جہاں ساحل اور چٹانیں ملتی ہیں، مزدور ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ لیکن قادر اپنے کندھے پر اپنی رائفل لٹکائے جھونپڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتا تھا اور اس نے دیکھ لیا۔ لیکن نہ دیکھنے کا دکھاوا کرتے ہوئے اس نے اپنی پشت میری طرف کر لی۔ میں نے اپنی سکرٹ اتاری اور اسے اپنے سر کے گرد لپیٹ لیا۔ میں پانی میں چلی گئی جو ابھی تک بے حد پُرسکون تھا۔ جب میں کھاڑی کے آدھے راستے میں تھی، میں نے حسن کو دیکھا۔ وہ جاگ گیا تھا اور ٹیرس سے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا، ''رُکو، میں آتا ہوں!''

اس نے اپنا نہانے کا لباس پہن رکھا تھا، بے حد خوب صورت لباس، براؤن اور سفید کا امتزاج۔ حسن نے اس میں خاصا نوجوان دکھائی دیتا تھا...... میں کیا کرنے جا رہی تھی...... کیا میں اس سے پانی کے والو کے بارے میں پوچھنے والی تھی؟ کیا میں اس سے قریب ہونے والی تھی؟ کیا میں اس سے بھاگنے والی تھی؟ میں نے مبہم طور پر محسوس کیا تھا کہ میں اسے چاہتی تھی۔ اس کے لطیفوں نے مدد کی تھی، میں اس خواہش پر قابو پا چکی تھی۔ جب میں بھی سمندر سے اس کی جانب ہاتھ ہلا رہی تھی، میں نے ایک زیادہ واضح زیادہ طاقت ور خواہش محسوس کی۔ میرے بدن کو جو سہلا رہا تھا، وہ سمندر کا پُرسکون کھارا پانی نہ تھا۔ وہ حسن کے ہاتھ تھے جو کبھی بے حد پیار سے سہلایا کرتے تھے۔ پھر بعد میں غم اور غصے، شکست اور ایک بناوٹی بہادری کے درمیان مجھے آغوش میں لے کر یہ کہتے ہوئے، ''میں

نہیں کرسکتا، میں نہیں کرسکتا، میں نااہل ہوں۔'' اس کی کوششیں غائب ہو چکی تھیں۔ ایک نیا حسن پہاڑ سے نیچے دوڑتے ہوئے میری جانب آرہا تھا۔ یہ وہ حسن نہ تھا جو صدیوں کا غیر انسانی بوجھ اٹھائے ہوئے تھا، جسے اسیر کیا گیا تھا اور جو مرد کی طرح دکھائی دینے کے نام پر خود قید ہو چکا تھا۔ وہ مختلف ہے، اب وہ مختلف ہے......

جب ہم یوسف، قادر اور خدیجہ اور حتیٰ کہ مزدوروں میں گھرے ہوئے تھے، میں خود کو لامحدود آزادی کی حالت میں محسوس کرتے ہوئے کھاڑی کے وسط میں کھڑی تھی، اگرچہ محاصرہ زدہ ہی سہی۔ میں سمجھ نہ پائی کہ روم کے آخری ایام اس قدر بدصورت کیوں تھے۔ لیکن پھر دوبارہ، شاید وہ بدصورت نہ تھے۔ شاید وہ دن منفرد طور پر اس قدر خوب صورت تھے کیوں کہ وہ بے حد پُردرد تھے۔ کیوں کہ سب کچھ کی پہلے ہی بھاری پیشگی قیمت چکائی جا چکی تھی۔ کل اس سے زیادہ بھاری قیمت چکائی جائے گی۔

وہ موسم گرما جب میں اور حسن یہاں اکیلے تھے، جب ہم محمت اور گونے کو الوداع کہہ چکے تھے، سورج ابھی بے حد گرم تھا۔ چٹانیں گرمی سے جل رہی تھیں۔ میرا دل...... ایک ماں کا دل...... فکروں اور اندیشوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں حسن میں پناہ لیتی رہی۔ ہر قسم کے میڈیا کے ذریعے لاپتہ لوگوں کی فہرستیں ہمارے سامنے پڑی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ہمارے گرد گشت کرتے سیاہ سائے ہمارے دروازے تک آن پہنچے تھے اور سورج بے حد گرم تھا۔ چٹانیں جل رہی تھیں۔ میرے اندر، زندگی اور موت میں جنگ ہو رہی تھی۔ کیا مجھے نئی زندگیوں کو سورج کی روشنی میں لانے کی ضرورت ہے یا پھر میں زندگی کا گلا اسی وقت خود گھونٹ دوں جب وہ ابھی میری گود میں ہو، دوسرے ہاتھوں کو اس نوخیز پودے کو مٹی سے اکھیڑنے اور پرے پھینک دینے کی اجازت نہ دوں؟ گرم سورج نے مجھے زندگی واپس لانے کا کہا۔ میرے دماغ اور میرے جسم کے درمیان جنگ۔ صرف اس کراس فائر میں...... نظم۔ کیا وہ دوآن کی نظم تھی یا میری؟ ہماری نظم...... ہم چٹانوں کے نیچے کھڑے تھے۔ میں نے حسن کو یوں گلے لگایا جیسے اپنے بیٹے کو گلے لگا رہی ہوں۔ وہاں ان گرم چٹانوں کے نیچے، میں پہلی مرتبہ تنہا اور بے بس رہ گئی تھی اور حسن وہاں نہیں تھا۔ میں نے سورج میں پناہ حاصل کی۔ کیوں کہ حسن پہلی مرتبہ یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اچانک بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ وہ زخمی تھا، ترش رُو۔ کسی قصوروار لڑکے کی

طرح، اس کا جھکا ہوا سر اور اسی وقت غصے میں اور سرکش بھی، وہ اس احساسِ تفاخر کے دفاع کے لیے جو اس کے جسم پر انحصار کرتا تھا، علاج ڈھونڈنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے خدا! میں اس تبصرے کے بارے میں کیسے بالکل بھی سوچ نہیں سکی ہوں؟ ان گرم چٹانوں پر جب ہماری نگاہیں وسیع سمندر کو اپنی آغوش میں لے رہی تھی، اس سے ذرا قبل جب میں نے اپنی بانہیں اس کے گرد ڈالیں اور اس کے وجود میں پناہ لی تھی، کیا اس نے کہا نہیں تھا، ہم نے گو نے کو دُور بھیج دیا۔ کیا وہ ہمارے پاس دوبارہ آئے گا؟''

کیا اس نے یہ کہا نہیں تھا؟

میں نے اس کا تبصرہ بظاہر پہلی بار سنا تھا، جب حسن اپنے نہانے کے براؤن اور سفید لباس میں پہاڑ سے دوڑتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ میں اس بارے میں پہلی مرتبہ آگاہ ہوئی۔ سو تب، اس لمحے، اس لمحے میں ان گرم چٹانوں پر میں حسن میں پناہ لینا چاہتی تھی، کیا میں بھی اپنی جنگ لڑ رہی تھی، اپنی لائن آف فائر میں؟

پرانے خون اور گلے سڑے گوشت کی بُو پورے ملک میں زیادہ سے زیادہ چیزوں پر چھاتی چلی گئی۔ خوش ہونے کی کوشش کرنا تو ایک طرف خوشی کا تذکرہ کرنا بھی مشکل ہو چکا تھا۔ محبت موجود نہ تھی، غیر حاضر تھی، اسے مکمل طور پر بھلایا جا چکا تھا۔ موت ابھی ایسی چیز نہ بنی تھی جس کے ہم عادی تھے، لیکن ایسا ہونے کے قریب ہی تھا۔ دروازے سختی سے بند کیے جا چکے تھے۔ لوگوں کے دلوں پر ہر بدترین طریقے سے قفل ڈالے جا چکے تھے...... لیکن کوئی بھی نہیں، ہم میں سے کوئی بھی، اس بارے میں آگاہ نہیں تھا کہ خون کی باس اور سڑن ہماری خواب گاہوں تک میں داخل ہو چکی تھی، اس وصل کو ٹکڑوں میں کاٹتے اور انہیں مرجھاتے ہوئے ہمارے وصل میں داخل ہو چکی تھی۔ ''کیا گو نے ہمارے پاس واپس لوٹے گا؟'' میں یہ ادراک کیوں کر نہیں کر پائی تھی کہ حسن نے گرم سورج تلے خود کو مجھ پر گرانے سے قبل یہ کہا تھا؟ وہ بھی اس سے آگاہ نہیں تھا، دماغ اور جسم نے ایک دوسرے کو بلاک کر دیا تھا...... ہم یہ سب فوراً ہی اور خود بخود کیسے سمجھ سکتے تھے؟ موت کے عادی ہونے کے دہانے پر ہوتے ہوئے، کیسے؟

ہم جلد ہی شہر واپس آ گئے تھے۔ فواد ہم سے ملنے آیا تھا۔ وہ ایک اداس اور خاموش ڈنر

میل تھی۔ ہم سب کے چہرے اداس روئے روئے سے تھے...... مسلسل اذیت...... میرا خیال ہے یہ اس کے چند روز بعد کی بات ہے جب فواد سول سرونٹ کے طور پر اپنی نوکری کے لیے جا چکا تھا۔ اس نے اپنے مینیجروں، باسز، اپنے کولیگز کے بارے میں شکایتیں کی تھیں۔ وہ ابھی تک ان گرد آلود، پھپھوندی زدہ دنوں کے بوجھ تلے تھا جو اس نے ان کمروں میں گزارے تھے۔ جب کہ نئے دن اس کے سامنے تھے، کسی بہتری کا کوئی نشان تک نہ تھا، شاید اسے صحافت میں اپنے کام کی کوئی پوشیدہ خواہش تھی۔ شاید واقعات کا ایک تماشائی بن جانے نے ہر کسی کو، سب سے بڑھ کر اسے خود اس کی اپنی نگاہ میں قصوروار بنا دیا تھا اور اسے علم نہیں تھا کہ وہ کل کہاں سے شروع کرے...... میں ان باتوں کے بارے میں اب سوچتی ہوں......

''کوئی بھی کسی سے محبت نہیں کرتا، کوئی بھی کسی کو نہیں سمجھتا۔ بہتر ہو کہ تم اب اسے سمجھ جاؤ!'' اس نے کہا تھا۔ اس کے کہنے کا مطلب تھا کہ تین لوگوں کی اس تنگ سی دنیا میں جس کا آغاز تم نے کیا ہے، میں بھی تم سے محبت نہیں کرتا۔ یا ایسا میں نے سمجھا تھا۔ میرے دن جب میں باتوں کو اس طرح سے سمجھنے لگی تھی...... حسن اس سے آگاہ نہیں تھا...... حقیقت میں، میں حسن سے آگاہ نہیں تھی...... حسن بظاہر یہ خیال کرتا تھا کہ فواد مایوس اور پریشان تھا کیوں کہ اس کا نیا تجربہ ناکام رہا تھا اور یہی اس کے پریشان حال ہونے کی واحد وجہ تھی...... یہ سچ ہے، کوئی بھی کسی کو نہیں سمجھتا...... جب فواد جا چکا تھا اور وہ تیزی سے اس کے بارے میں سب کچھ بھول چکا تھا، کسی قصوروار لڑکے کی طرح اپنی نگاہیں فرش پر جما کر اس نے کہا تھا، ''فواد کے ساتھ بات کرتے ہوئے میں نے تمہاری جانب دیکھا اور...... تم بے حد خوش مزاج عورت ہو...... سب کچھ کے باوجود، زندگی سے بھرپور......''

میں گڑبڑا گئی تھی۔ کیا اس کی آواز میں احساسِ خطا کے اس بے معنی احساس کو دباتے ہوئے ایک قسم کا حسد نہیں گونج رہا تھا...... یا مردانگی؟ میری زندہ دلی سے کسی قسم کا حسد؟

''تمہارا مطلب ہے؟''

''جس حالت میں مَیں ہوں، میں نہیں چاہوں گا کہ تم ضائع ہو۔''

''اچھا پھر ٹھیک ہے!''

یہ کہنے کے بعد میں باتھ روم چلی گئی تھی۔ میں نے حسن کو کمرے میں اکیلا چھوڑ دیا تھا،

اکیلا، اکیلا اور حتیٰ کہ اس کے بکھرنے کے زیادہ احساس کے ساتھ...... اسے ایسا ہی ہونا تھا...... عقد نکاح، دستخط، گواہان...... جس چیز نے ہمیں غیر فطری بنایا تھا وہ کاغذ کے ٹکڑے پر دستخط شدہ وعدوں کے سائے میں تسلسل کی خواہش تھی۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی، اچھا ڈیئر، چاہے تمہارے نامردی ہر لمحے ہی رہے تو اس سے کیا ہوگا اگر ہم سب زندگی میں اس قدر بزدل، بے قرار اور کمزور ہیں؟ میں نے باتھ روم میں اپنے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارے لیکن اس سرکشی کو ٹھنڈا نہ کر پائی جو مجھے محسوس ہوئی تھی۔ میرا لاشعور ضرور مجھے حسن کے حقیقی مسئلے کی طرف دھکیل رہا تھا، ٹھوکے دے رہا تھا لیکن وہ ایک اسیر شعور کا لاشعور تھا۔ یہ زیادہ انکشاف نہ کر سکتا تھا اور بلاشبہ وہ نہ کر پایا۔ مثال کے طور پر، گرم چٹانوں تلے، وصل سے لمحہ بھر پہلے تک، یہ حسن کے اس سوال کے اصل معنی دریافت نہ کر پایا تھا کہ ''کیا گو نے ہمارے پاس واپس لوٹ کر آئے گا؟''

''اچھا، پھر ٹھیک ہے!''

میرا حسن کو جواب، جلدی، مختصر اور سادہ تھا۔ ایسی قبولیت اور فوری پسپائی دکھانے کی بجائے میں حسن کے مسئلے کی کھوج لگا سکتی تھی۔ میں اسے کم سے کم بتا سکتی تھی، ''حسن، تم اس بات سے آگاہ بھی نہیں ہو کہ تم نااہل کیوں ہو! تم اس گہرے خوف سے آگاہ نہیں ہو جو تمہارے اندر پھیل چکا ہے۔'' یقیناً ہمیں بے بسی گھیر چکی تھی۔ سب کچھ ترک کیا جا چکا تھا۔

میں نے یوں جھرجھری لی جیسے گھرے ہونے کے احساس کو جھٹک دینا چاہتی تھی۔ میں ساحل سے دُور، پانی میں، حسن سے ملی تھی۔ ہم کھاڑی کے دُور والے سرے کی جانب گہرے پانیوں کی طرف تیر گئے۔

سمندر کی گہرائیوں میں ایک دوسرے کو تھامنے سے قربت کا احساس ہوا۔ اس کے بعد کوئی ''پہلے'' یا ''بعد'' نہ تھی۔ ہر چیز میں آئیوڈین، حنا اور صنوبر کی خوشبو تھی۔ حتیٰ کہ سورج بھی۔ سورج میں بھی خوشبو یا باس تھی۔ شام کا دھندلکا دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا، ہم پر سورج کی کرنیں پڑیں......

پھر حسن اپنے منہ سے پانی کی پچکاری نکالتے ہوئے سطح پر آیا، ''میرے منہ میں کنیر کا ذائقہ ہے۔''

اس نے ایسا کہا۔

''میرے منہ میں کینر کا ذائقہ ہے۔''

میرا خیال ہے کہ اس مقام پر میں یہ سب بتاتے بتاتے رک گئی تھی کیوں کہ خود میں بھی اپنے منہ میں اچانک کینر کا ذائقہ محسوس کر سکتی تھی۔ بتدریج مجھ پر پھیلتے ہوئے اس ذائقے نے اپنے زہریلے مزے میں مجھے لپیٹ لیا۔ میں باغ میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ شبنم اور نمی سے بھیگے گلاب میرے دل میں کھل اٹھے اور دوپہر کے قریب، اس تعمیر ہونے والے موٹل کے مالک اوزبے کے ساتھ قادر چلا آیا۔ جب میں اندر اپنی میز پر بیٹھی یہ سب پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے میرے کام میں مخل ہونے پر مجھ سے معذرت کی۔ یہ اُس طرح سے کام نہیں تھا جو ان کا مطلب تھا۔ میں جی رہی تھی۔ میں چیزوں کے اپنے معنی و مطالب میں کام کر رہی تھی۔ میں یہ دکھانے کی مشتاق تھی کہ خالص پن...... جو عرصہ ہوا ختم ہو چکا تھا...... اور اکٹھے رہنے کے سیدھے سادے طریقے یا قسمیں بحیرۂ روم کے علاقے میں انتہائی حیران کن ثبوت کے طور پر وجود رکھتی تھیں...... ایک معجزہ...... بیسویں صدی کے اختتام کا ثبوت۔ اگر یہ کام تھا تو یہ ایک ایسا کام تھا جو مجھے بے حد پسند تھا۔ یہ روزمرہ زندگی کے ان کاموں جیسا نہیں تھا جو ہمیشہ شکایتوں کے ساتھ کیے جاتے ہیں، یہ اوزبے کے موٹل کی تعمیر جیسا نہیں ہے۔ اور اوزبے نے پہلے ہی شکایت کی کہ موٹل کی تعمیر اس تیزی سے نہیں ہو رہی تھی جیسی وہ چاہتا تھا، جس طرح وہ چاہتا تھا۔ میونسپلٹی کی Zoning اور پرمٹ آفسز کے بارے میں، رجسٹریوں کے بارے میں...... چند مربع فٹ زمین پر کتنے کمرے تعمیر کیے جانے چاہئیں، اس کی اجازت دینے میں ان دفتروں کی عدم آمادگی کے بارے میں شکایتیں...... وہ کہتا ہے کہ وہ اس گھر اور باغ کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کو تیار ہے تاکہ وہ اس جگہ کو اپنے موٹل میں شامل کر سکے۔ یوں وہ اپنے مربع فٹ رقبے میں اضافہ کر لے گا اور پھر کمروں کی تعداد بڑھا سکے گا۔ وہ کہتا ہے، ''برائے مہربانی، اس بارے میں سوچیے۔ یہ اچھا ہوگا اگر آپ یہاں سے جانے سے پہلے اس پر راضی ہو جائیں۔ میرے لیے پراجیکٹ کی منظوری لینے میں زیادہ آسانی ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں مجھے کمروں کی تعداد کم کرنے پڑے گی۔ یہ نفع بخش نہیں ہوگا، میری رقم ڈوب جائے گی۔ ڈسکو؟ نہیں، میں وہ نہیں چھوڑ سکتا۔ نوجوان ڈسکو کا ہی پوچھتے ہیں۔ غیر ملکی ایسی دُور افتادہ جگہ پر، جہاں

کرنے کو کچھ نہ ہو، شب بسری پسند نہیں کرتے......"

اس نے جو کچھ کہا، اس میں سے مجھے ایسی باتیں یاد ہیں۔ میں نے اس کے چہرے کو خاموشی سے دیکھا، حیران ہوئی کہ وہ اس دنیا سے کیسے غافل ہو سکتا تھا جو ہم نے اس باڑھ کے اس پار تعمیر کی تھی جو ہمیں الگ کرتی تھی۔

میں ہماری جگہ کا دفاع کرنے والی تھی، میں نے ان سے وعدہ کیا تھا جو جا چکے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ جب میں نے خاموشی سے اوز بے سے عدم اتفاق کیا جو اس میں سے کوئی بات نہ سمجھا تھا جو میں نے کہی تھی کہ "ہمارا یہاں سے جذباتی تعلق ہے" اور "جذباتی تعلق" کے الفاظ پر ایک مذاق اڑاتی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی تھی۔ میں قادر سے کچن کے دروازے کی چٹخنی کا ذکر کرنا دوبارہ بھول گئی تھی۔ اور شاید کسی طرح میں یہ یقین نہ کرنا چاہتی تھی کہ بارشیں شروع ہونے والی تھیں اور مجھے وہاں سے جانا تھا۔

ایک بار پھر، رات۔ ستاروں کے بغیر پہلی رات۔ پورے چاند کو بادلوں نے پوری طرح چھپا لیا ہے۔ کچھ دیر پہلے جب میں باہر گئی تو میں نے دیکھا کہ آسمان کسی گہرے کنویں کی طرح تاریک تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ کل، یا حتیٰ کہ آج رات بارشیں شروع ہو جائیں گی۔ Hyade گرلز نے دیر گزری بادلوں کے پیچھے اپنی جگہ سنبھال لی تھی۔

اگرچہ میں سویٹر پہنے ہوئے تھی، پھر بھی مجھے سردی محسوس ہوئی۔ بجری پر پتھر کے تندور میں راکھ جمع ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے گرد ہماری ہنسی کی بازگشت، ہماری سرگوشیوں کی آوازیں بھی سنیں لیکن اس تندور سے شعلے بلند نہیں ہوئے۔ ہمارا باغ اب ایک اجاڑ قدیم شہر ہے۔ سنگ مرمر، جس پر روشنی کی گلابی کرنیں پڑتی تھیں، اپنی جگہ رنگ برنگے دھاری دار سیاہ سنگ مرمر کو دے چکا ہے۔ ایسا قدیم شہر ہے ہمارا باغ۔

میں اندر آ گئی۔ کچھ دیر پہلے کمرا گرم تھا۔ پھر بھی میں آتش دان کے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے خرنوب اور صنوبر کی خشک شاخوں اور مخروطے یا کوزے اکٹھی کیں اور انہیں آگ دکھا دی۔ یوں جیسے میں صرف اپنے جسم کو نہیں بلکہ اپنے اندر اپنی گہرائیوں میں ہر چیز کو گرم کرنا، سرد راکھ میں موجود شعلوں کو پھر سے زندہ کرنا چاہتی تھی، میں اٹھتے ہوئے شعلوں پر نظر جمائی۔ صنوبر کی چٹخنی لکڑیوں کے

عین بیچ ہمارا گیت شروع ہوا:

"Now you're far away..."

حنا اور گوند یا لاکھ کی خوشبو والے شعلوں کے درمیان سلجوقی تاجر نمودار ہوئے۔ اپنے گھوڑوں، چادروں، ڈاڑھیوں اور برچھیوں، گلاب، دارچینی اور کالی مرچ کی خوشبوؤں کے ساتھ، انہوں نے مارکو پولو کے پیچھے قطار بنالی۔ وہ ہجوم کی صورت میں گزرے، کارواں نے مغرب اور شمال کا سفر کیا، چائے دانی سے نکلتی چیونٹیوں کی طرح۔ کارواں سرائے میں، گرم مصالحوں سے بھری بوریوں کا بوجھ اٹھائے تھکے ماندے اونٹ زمین پر بیٹھ گئے۔ کارواں سرائے کے عین درمیان بڑے بڑے الاؤ روشن کر دیئے گئے۔ ان الاؤ کے اوپر بھیڑیں اور بکریاں کھال اتار کر لکڑی کی سیخوں پر پکائی گئیں۔ جلے ہوئے بالوں، خون اور پگھلتی ہوئی چربی کی بُو آسمان کی جانب اٹھی۔ سرخ شعلوں کے درمیان ایک بڑی سی لکڑی گرم راکھ پر جا گری۔ دہکتے ہوئے انگاروں سے اٹھنے والی چنگاریاں سیاہ سنگ مرمر جیسے آسمان کی طرف اٹھیں۔ بھیڑیں اور بکریاں جو انگاروں پر آہستہ آہستہ بھونی جا رہی تھیں، ان کا رنگ پہلے انار جیسا سرخ ہوا۔ اپنے پیروں میں ہرن کی کھال کے جوتے پہنے جو بھوسی میں ڈبو کر رکھے گئے اور پھر انگور کے پتوں سے رگڑے گئے تھے، کارواں کا لیڈر آگ کے قریب نمایاں جگہ پر بیٹھ گیا۔ غیر شادی شدہ مرد، لڑکے، جنہوں نے آنکھوں کو کاجل سے سجا رکھا تھا، اِدھر اُدھر بھاگتے رہے۔ کچھ نے دودھیا نیلے یا اونٹ کے بالوں کے رنگ کے پاجامے پہن رکھے تھے، کچھ کی عریاں بغیر بالوں والی ٹانگیں شلواروں سے دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے سرخ یونانی وائن تقسیم کی جو مقامی لوگ مٹی اور لکڑی کے برتنوں میں لائے تھے۔ سرخ جلتی ہوئی راکھ کو مکئی، گندم اور جوار کو بھوننے کے لیے الگ بکھیر دیا گیا۔ سب سے اگلے گدھا سوار نے اپنے کپڑے اتارے۔ جو لڑکے اپنا کام ختم کر چکے تھے وہ انہیں لے کر چشمے پر نہانے دھونے چلا گیا۔ باقی لڑکوں نے جانوروں کو پانی پلایا۔ گوشت بھونا جا چکا تھا اور تیار تھا۔ لڑکے اپنے گیلے بالوں کے ساتھ آگ کے قریب بیٹھ گئے۔ کارواں کے لیڈر نے انہیں ایک ایک کر کے وائن دی جسے کچھ گرم کیا گیا تھا۔ ایک پتلی کمر اور نازک خدوخال والے گورے سے لڑکے نے اپنے کانوں کی بالیوں کے پیچھے عطر کے دو قطرے لگائے۔ انگاروں کی دہکتی سرخی اس کے چہرے سے منعکس ہوئی۔ وہ کھڑا ہوا، اس نے لیڈر کا ہاتھ چوما اور اسے

اپنی پیشانی سے لگایا۔

عین اسی لمحے آتش دان کی آگ سے ایک بڑی سی چنگاری اچھلی۔ میں بھی اچھل پڑی۔ گرم مصالحوں کے کارواں اور کارواں سرائے مدھم پڑ گئے۔ کارواں کے لیڈر، نخرے باز نازک اندام لڑکے، اونٹ، سب غائب ہو گئے۔

میں نے صنوبر کے گرم انگارے کو جو لکڑی کے فرش پر پڑا جل رہا تھا، اٹھایا اور واپس آگ میں پھینک دیا۔ لکڑیاں جو کوئلے بن چکی تھی، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں، شعلے کم ہو گئے۔ آتش دان سے اٹھنے والی روشنی نے کمرے کو نیم تاریک کی جگہ نیم روشن کر دیا۔ میری نگاہوں کو، جو شعلوں پر جمی رہی تھیں، کمرا اصل سے زیادہ تاریک لگا، یوں جیسے انہیں سورج نے چندھیا دیا تھا۔

لیکن اب میں ان روشن دنوں میں ساکت ہوں۔

حسن اور میں سمندر سے باہر آئے۔ فواد جاگ چکا تھا۔ وہ صنوبر کی دو شاخوں کے پتوں پر یاسمین کے پھولوں کو ترتیب دے رہا تھا۔ اس نے تنکوں سے بنے ہیٹ میں پھول جمع کیے تھے اور انہیں صنوبر کے پتوں کے اوپر ترتیب دے کر سجا رہا تھا اور یہ بس لمحے بھر میں مکمل ہونے والا تھا۔ آخر میں وہاں دو بے حد خوشبودار برف سے سفید گل دستے تیار تھے۔ فواد نے کسی دھن کی سیٹی بجاتے ہوئے پھولوں کو ترتیب دی تھی۔ اس نے ایک گل دستہ مجھے دیا اور دوسرا حسن کو: ''محبت کے باغات سے۔''

اس پہر جب سورج سب سے زیادہ تیز تھا، ہم کھاڑی کے سرے پر دکھائی دینے والے ریت کے ذرّات تھے۔ بے حد اچھی طرح چھانے گئے ریت کے چمکتے ہوئے، صاف شفاف، لہردار ذرّات۔

حسن نے یاسمین کا گل دستہ دھاگے سے باندھا اور اسے اپنی گردن میں لٹکا لیا۔ میں نے اسے بالوں میں سجا لیا۔ جب دوآن اور میرچ آئے، فواد کے پھولوں کے گچھے ہماری گردنوں کے گرد اور ہمارے بالوں میں تھے۔

دوآن اور میرچ ہماری توقع سے جلد پہنچ گئے تھے۔ حسن ابھی تک وہ مچھلی پکڑ نہیں پایا تھا جو وہ ان کے لیے پکڑنا چاہتا تھا۔ لیکن فواد ایک بے حد اچھا سلاد بنا چکا تھا اور پھر اس نے اپنا

Harpoonاور Finsاٹھائے اور نیچے سمندر پر چلا گیا۔

خدیجہ نے ہمارے ہاتھ دس تازہ انڈے بیچے تھے۔ حسن اور میں پنیر والا آملیٹ بنانے والے تھے۔ اسی دوران ہم لیموں کی خوشبودار چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میوزک سن رہے تھے۔ جب اس کا ایک پسندیدہ گیت شروع ہوا، حسن پوری طاقت سے اس کے ساتھ ساتھ گانے لگا۔ اس سے وہ بالکل بچوں جیسا لگ رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ بدل رہا تھا، اس کے تندوتیز لطیفے، اس کا دوسروں کو حیران کرنے کا شوق، یہ ختم ہونے میں ہی نہ آرہے تھے۔ واحد چیز جو اس نے بدلی نہیں تھی وہ اس کا ہوشیاری واحتیاط سے ماضی سے گریز تھا۔

میں اس سے کہہ چکی تھی، ''مجھے امید ہے کہ تمہیں میرچ پسند آئے گی۔''

''جو اپنے آپ سے محبت کرتا ہے، وہ ہر کسی سے محبت کرتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا، ''جو اپنے آپ سے مطمئن ہو، وہ ہر کسی سے مطمئن ہوتا ہے......''

کیا وہ موت تھی جو ہمیں پھر سے سنوار رہی تھی؟ اس پہر، جب نصف شب گزرے بھی دیر بہت ہو چکی ہے، جب آتش دان میں ایک چنگاری بھی باقی نہیں رہی، میں بے صبری سے ان دنوں کے آہنگ یا باتوں کو پاک صاف کر رہی ہوں جو ہم نے جیے تھے، جو محبت میں گندھے ہوئے تھے۔ میں نے حسن کے ان الفاظ پر خود کو مخملیں حدت کی حالت میں گزرتے چھوڑ دیا کہ ''جو خود اپنے آپ سے محبت کرتا ہے، وہ ہر کسی سے محبت کرتا ہے''، گیت کو درمیان میں کاٹتے ہوئے۔ جب حسن اس طرح بات کرتا تو میں ہمیشہ اس کی حامی ہوتی تھی۔ میں نے پنیر کو کدوکش کیا۔ کوئی ضرور دروازے پر دستک دیتا رہا تھا، لیکن ہمیں دستک تب ہی سنائی دی جب حسن نے گانا بند کیا اور ٹیپ ریکارڈر بند ہوا۔ حقیقت میں اس وقت جب مجھے صرف حسن پر اپنی توجہ مرکوز کرنے پر خوف آیا اور میں نے اپنی تمام حسیات بیرونی دنیا کی جانب موڑیں۔ میں دروازہ کھولنے بھاگی۔

اپنے مسخ شدہ چہرے اور دھندلی کمزور نگاہ کے ساتھ وہ معذور لڑکا۔ میں نے پہلی بار قریب سے اور دن کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے گنجے سر پر کچھ بڑے کچھ چھوٹے، بٹنوں جیسے سفید نشانات تھے۔ گزشتہ رات وہی پروپین ٹینک لایا تھا جو قادر نے اس کے ہاتھ بھیجا تھا۔ میں دھندلکے میں کھڑی تھی، میرا دماغ فواد اور دوسری بہت سی چیزوں پر مرکوز تھا...... جب میں

نے اچانک اس لڑکے کو اپنے سامنے دیکھا، میں حیران رہ گئی۔ وہ تب آکر خاموشی سے جا بھی چکا تھا۔ اس مرتبہ مرکزی دروازے کے سامنے تیز روشنی میں اس نے میری جلد کو چھید کر اندر گھستی نگاہوں کے ساتھ مجھے دیکھا۔ مجھے بے آرامی کا احساس ہوا کیوں کہ میں ابھی تک اپنا نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ لڑکا میرے عریاں بدن سے اپنی نگاہ کو آزاد کروانا چاہتا تھا لیکن اس کی خواہش اس قدر طاقت ور تھی۔ وہ ایسی نگاہ تھی جس نے اس کے ارادے کے خلاف مزاحمت کی، اسے شکست دے دی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اس وقت یہ پوری طرح سمجھ گئی تھی۔ لیکن اب...... اب، میں اسے زیادہ مؤثر طور پر سمجھتی ہوں۔

میں نے کہا، ''ایک منٹ۔'' میں جلدی سے جا کر کپڑے پہننے والی تھی۔ پھر میں نے اپنا ذہن بدل لیا، یہ بالکل واضح ہے: سو یہ کیسے تھا کہ اس کی نگاہ نے مجھے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا یہ اب کرتی ہے؟ میری ہچکچاہٹ ڈھکی چھپی تھی اور تھوڑی سی دیر ہی رہی اور شاید اس لمحاتی وقفے کے بعد میرے تیزی سے اپنی قدرتی حالت میں لوٹنے نے اسے اپنی نگاہ بدلنے میں مدد دی جس نے اپنی تمام تر پُراسراریت سے مجھے بھر دیا تھا۔ اب وہ شرمیلا اور باادب دکھائی دیتا تھا۔ ''وہ آپ کے لیے یہ لائے تھے......''

ایک ٹیلی گرام۔

اب جب کہ میں یہ سب بتا رہی ہوں، میں دوبارہ پوچھتی ہوں۔ کیا اس نے ہمیں تب دیکھا تھا جب لارل یا تیز پات کے سدابہار درختوں تلے حسن اور میں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا تھا اور دوبارہ جب صورتِ حال سنگین تھی؟ میں اب بھی اس بارے میں سوچتی ہوں...... جہاں تک اُس وقت کی بات ہے، میں اُس خوشی میں مگن تھی جو ٹیلی گرام کے آنے سے ہوئی تھی۔

وہ ممت کی طرف سے تھا: ''میں استنبول میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میں اپنی ہمیشہ بڑھتی آرزو کے ساتھ آپ کے پاس ہوں گا۔''

''شکریہ بھائی، بہت شکریہ!''

میں نے دروازہ بند کیا اور حسن کی جانب بھاگی۔ ''ممت آ رہا ہے! وہ فوراً ہی آ رہا ہے! شاید آج ہی!''

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو اس حسد ورقابت سے آزردہ دل جو وہ اپنے سے کم عمر لوگوں کے لیے محسوس کرنا شروع ہو گیا تھا، حسن اپنے خول میں واپس چلا جاتا۔ لیکن اس صبح اس نے انڈے پھینٹنا بند کیا اور چلایا، ''اب مجھے ایک زیادہ بڑی مچھلی پکڑنی ہوگی!''

فواد...... وہ وہاں تھا۔ وہ پانی ٹپکاتے ہوئے کچن کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ مچھلی پکڑنے والی بنسی بھی سمندر لے گیا تھا۔ اس کی چٹکی میں ایک مچھلی لٹکی ہوئی تھی۔ مچھلی جو اپنے منہ میں اٹکی ڈوری سے لٹکی ہوئی تھی۔ یہاں اس سے پہلے اور بعد میں پکڑی جانے والی سب سے بڑی مچھلی......

فواد کسی ایسے رومی جنرل کی طرح دروازے میں کھڑا تھا جو بہت سی فتوحات کر چکا ہو۔ اس کے بال، جو درمیان سے کم ہو گئے تھے، آگے سے گھنے تھے۔ اس کی پیشانی پر اس کے بال کھاری پانی سے چپکے ہوئے تھے۔ مچھلی کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے سینے سے سانس خارج کی: ''بحیرۂ روم سے ہمارا پہلا بڑا انعام! سمندروں کا بادشاہ، ادب واحترام سے یہ آپ کو پیش کرتا ہے!''

میری نگاہوں کے سامنے نیپچون اور وینس کی شادی کا جلوس گزر گیا۔ لیکن میں جلوس زیادہ دیر تک نہ دیکھ پائی۔

یوسف بھاگتا ہوا آیا، ''واؤ، اتنی بڑی مچھلی!''

وہ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس کے گھومنے کے دوران عثمان ہل رہا تھا، جسے ان کی ماں نے یوسف کی کمر سے باندھ رکھا تھا۔ شادی کے جلوس میں بنسی سے لٹکتی مچھلی ہی باقی رہ گئی تھی۔

حسن نے تعریف بھری نگاہ سے دیکھا، گلابی سفید جلد والی چمکتی ہوئی مچھلی کو نہیں بلکہ فواد کو اور شام کو جب ہم مچھلی کھانے کے لیے میز پر اکٹھے ہوتے تو وہ اسے چھیڑتا، ''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یاسمین کے پھول چننے والے ہاتھ کوئی مچھلی بھی پکڑ سکتے تھے۔''

میں فوراً ہی ٹیپ ریکارڈر کے پاس گئی اور ٹیپ بدل دی۔ مجھے واضح طور پر یاد ہے:

''تمہیں فواد سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں فواد سے تمام اچھی، خوب صورت اور مفید چیزوں کی توقع رکھنی چاہیے، کیا تم یہ بھول گئے ہو؟''

میرے وہ تمام ابتدائی اندیشے بے وجہ اور غیر ضروری تھے۔ فواد مشتعل نہیں ہوا تھا۔ وہ

اپنی مونچھیں چباتے ہوئے یہ کہہ کر خاموش نہیں ہوا تھا کہ ''یہ ٹھیک کہتا ہے، میں تمہارے جتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں اور میں عملی چیزوں میں بے سلیقہ بھی ہوں۔ میرا مچھلی پکڑنا بھی تم لوگوں کو اتنا ہی حیران کر دیتا ہے جتنا میرا یاسمین کے پھول چننا......''

میرے لیے یہ کس قدر نامعقول تھا، موسیقی، کسی نظم یا ممت کے سفروں کا آسرا تھامنا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد خوب صورت چیزوں کے خراب ہونے کے ڈر سے میرے دل کی دھڑکن کا تیز یا سست ہونا! ہاں، یہ بے معنی تھا! کچھ بھی برا نہیں ہونے والا تھا۔ ایسا نہیں ہوا، آپ جانتے ہیں۔ نہ ہی تب جب ہم میز پر اکٹھے ہوئے، نہ تب جب حسن نے فواد سے کہا، ''میں توقع نہیں کر سکتا......'' جو کچن کے دروازے پر اپنے بچوں کو خوش کرنے والے باپ کی طرح یا کسی رومی جنرل کی طرح کھڑا تھا۔ درحقیقت اس کے بالکل برعکس۔ جب فواد وہاں اس طرح کھڑا تھا، حسن نے فوراً ہی مزید کہا تھا، ''اور جھینگے مجھ پر قرض ہیں! بالکل چھے!''

اور پھر یوسف کو بھولے بغیر جو جوش کے عالم میں مچھلی کے گرد اچھل رہا تھا، ''نہیں جناب، بلکہ سات! اور سب سے بڑے والا اس بچے کے لیے ہوگا!'' اس نے کہا تھا۔

یوسف نے ٹیرس پر کچھ دیر اچھلنے کے بعد ہمیں اصل خبر سنائی تھی:

''آدمی یہاں آ چکا ہے!''

''وہ کون ہے؟''

''ان جگہوں کا مالک، آپ جانتے ہیں۔ وہ رات کو آیا۔ اب وہ وہاں نیچے ہے۔ مزدوروں کے ساتھ۔ وہ وہاں تالاب کھدوائے گا۔ وہ سمندر جتنا بڑا تالاب ہوگا۔ میں اس میں جاؤں گا۔ بابا نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے......''

اُسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ مجھے مشین کی آواز سنائی دی جو میں ہر صبح سویرے سنتی تھی۔ میں نے بہ خوبی محسوس کیا کہ یہ بڑی سی مشین گردو مٹی کی طرح ہمارے ان ایام کو ایک ایک چیچ کر کے ایک طرف پھینک دینے کے قابل نہ ہو پائے گی۔ میرے وہ خوف اور اندیشے جو ماضی میں یہاں آمد کی پہلی رات مجھے تھے، مکمل طور پر غائب ہو گئے۔ جنگلے یا باڑھ کے اس جانب صرف ہم تھے۔ ہمارا دھوپ سے بھرا ٹیرس، جڑی بوٹیاں، سمندر جہاں ہزاروں پرندے گاتے، ان کے ہر لمحہ رنگ بدلتے

پر اور راستے میں گہرا سرسبز جنگل...... کچھ بھی اب دُور نہ تھا۔ سب کچھ ہمارے قریب تھا، ہمارے قریب، ہمارے اندر۔ جہاں تک محبت کے باغوں کے مرجھائے پژمردہ پھولوں کی بات تھی، وہ بہت دُور تھے، ماضی میں، ہمارے باہر...... اب دوآن اور میرچ اور محمت بھی بلبلوں کی چہچہاہٹ سے جاگنے والے تھے۔ اب راستے کے پار بڑے جزیرہ نما کے اوپر سے شام کو پورا چاند طلوع ہونے والا تھا۔ حتیٰ کہ پہلے روز سے ہلال اپنے کنارے پر تنہا ستارے کے ساتھ اپنی صورت مکمل کرتے ہوئے ہمارے لیے تیاری کر رہا تھا، خود کو اس طرح بھرتے ہوئے جیسے یہ پانیوں کو نقرئی نیلاہٹ میں دھونے کے لیے کوئی پیالہ تھا۔

قدیم شہر میں جب ہم دائروی معبد کی 9 سیڑھیاں چڑھے، چبوترے پر رُکے، اتفاق سے پورے چاند کی رات تھی۔ عبادت کے کمرے کی چھت سے اترتی چاندنی کی کرنیں بارہ Corinthian ستونوں پر پڑیں۔ تمام پتھروں کو دودھیا نیلی اطلس کے رنگ کے پتھروں میں لپیٹتے ہوئے Tyche سے منسوب معبد کے نقش و نگار کو پالش کیا۔ انہوں نے زیتون کے درختوں کے پتوں کو ڈھانپ لیا، کانٹے دار پودے جو سنگ مرمر کے درمیان خاصے لمبے ہو گئے تھے اور نیکر (Nacre) یا Mother-of-Pearl میں انجیر کے درخت۔ روشنی کی جھاگ دار آبشاریں سمندر سے منعکس ہو کر ساحل پر پڑیں۔

ہم کسی اور وقت یا زمانے میں تھے۔ ہم بندرگاہ شہر کا ناگزیر حصہ تھے جہاں روشنی کی کرنوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ مکمل چاند میں لپٹی اور گھری ہوئی ہر شے ہمارے بغیر نامکمل ہوتی۔ وقت ہمارے بغیر اپنا پنڈولم کھو دیتا۔ وہ ہم تھے جنہوں نے گزرے کل کا تعلق اس لمحے سے جوڑا اور اس لمحے کا آنے والے کل سے۔ وہ ہم تھے جنہوں نے سنگ مرمر کے ستون جہاں ٹیڑھے ہو گئے تھے، وہاں انہیں سیدھا کر کے نصب کیا تھا، جس نے انہیں سمندر اور چاند کو گلے لگوایا تھا، جنہوں نے Mother-of-Pearl کے لبادے والے انار اور زیتون کے پتے بنائے، ان کی جڑوں سے ملایا۔ ہم تھے جنہوں نے شہر کے داخلی رستے پر صدیوں میں پہلی مرتبہ فوارے سے پانی جاری کیا تھا اور گرما کے آغاز میں پہاڑوں سے بہ کر آنے والے پانی کے لیے ایسی نہریں بنائی تھیں جو شمال کو پھیلی ہوئی تھیں اور ہم ہی تھے جو کیوپڈ کی کھینچی گئی محبت کی سواریوں کے ساتھ ان گلیوں میں چلے تھے جن کی

دونوں جانب سنگ مرمر کے ستون تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں پورے چاند کی جادوئی نقرئی چھڑیاں تھیں، ہر شے جسے ہم نے چھوا، اُسے اپنے وقت یا زمانے میں دوبارہ زندگی مل گئی۔

اب چاند تھک چکا ہے۔ وہ شام کو دیر سے نکلتا ہے۔ مغربی کھڑکیوں سے بڑے سے زرد نارنجی ہوا نکلے غبارے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس پہر جب رات صبح بن جاتی ہے، یہ دیر تک ان کھڑکیوں میں بیٹھا رہتا ہے۔ بعد میں سورج طلوع ہوتا ہے۔

مجھے آتش دان کی راکھ میں دُور سے چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے اندر کی خاموشی تک پہنچ گئی، ان آوازوں نے مجھے ماضی سے حال میں گھسیٹ لیا۔

فاصلے پر، قادر چند مرتبہ اپنی سیٹی بجاتا ہے...... خدیجہ تمام رات میری مدھم روشنی کو دیکھ کر اپنے ذہن میں برے خیالات نہیں لائے گی...... کتا، قادر کو بھونک کر جواب دیتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سائے، پیروں کے نشانات، سانسوں کی آواز کی طرح گھومتے ہیں، چٹخنے کی آواز خزاں کے قدم دھرنے کی آواز ہے جو صنوبر کے مخروطوں اور پتوں کے کنکریٹ کے ٹیرس پر زیادہ سے زیادہ گرنے سے میرے مزید قریب آ گئی ہے، بڑے بڑے موٹے پتوں سے، یوں جیسے وہ ہر رات ہوا میں زیادہ ہانپتے ہیں۔

میں ہار مانتے ہوئے خود کو اپنے ماضی کے خوب صورت دنوں کو اپنے خوابوں میں ساتھ لے کر چلنے کے لیے تیار پاتی ہوں۔

قادر نے بیڈ روم کا شٹر شام تک ٹھیک کر دیا۔ لیکن کچن کے دروازے کی چٹخنی ٹھیک ہونے کی کوئی امید نہیں۔ قادر نے وعدہ کیا کہ وہ جائے تعمیر سے کوئی نئی چٹخنی تلاش کر کے لا دے گا۔ شاید بہتر یہ ہوگا کہ کل میں شہر جاؤں اور خود خرید لوں۔

میرے پاس اس کے لیے وقت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں متواتر چیزیں بیان کر رہی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ ابھی تک وہ سب بتانے کے قابل نہیں جو میرے دل کے کناروں تک بھرنے کے بعد اوپر سے باہر بہ گیا۔ پسپا ہونا اور رخصت ہونا، واپس جانا اور یوں مٹ جانا جیسے کبھی کچھ زندہ رہا ہی نہیں گیا تھا، یوں جیسے دل دھڑکے ہی نہ تھے...... میں خزاں کے لیے تیار ہوں، بارشوں کے لیے بھی۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتی۔

مجھے اس تھوڑے سے وقت سے، جو ہمارے پاس رہ گیا ہے، پورا پورا فائدہ اٹھانا ہوگا......

☼

میں شہر میں نہیں گئی۔ میں قدیم شہر بھی دوبارہ نہ گئی۔ ہر پہر میں کبھی بادلوں کو جمع ہوتے، کبھی آسمان کو صاف ہوتے دیکھتی، سمندر کسی وقت جھاگ دار اور کسی وقت بالکل پرسکون ہوتا۔ میں نے لہروں کو مسلسل رنگ بدلتے دیکھا۔

میں وسط سہ پہر کے وقت میں ہوں۔

رات کو جنوب مغرب کی ہوا چلنے لگی۔ شمال سے، پہاڑوں کے اوپر سے بادل، قریبی پہاڑیاں جنوبی مغربی ہوا سے بے رحمی سے لڑتی ہوئیں۔ ساحلی ہوا نے ایک بار پھر جنوب مغربی ہوا کو پسپا کر دیا۔

صبح کے سورج کی کرنیں یخ بستہ شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے منعکس ہوئیں۔ واضح طور پر یہ میرے آخری موقعوں میں سے ایک تھا۔ میں نے نہانے کا لباس پہنا اور نیچے پانی کی طرف چلی گئی۔ گرد آلود سیڑھیوں پر مجھے خیال ہوا کہ میری ایک بازو دوآن کے بازو میں تھی اور دوسری حسن کی کمر میں......لیکن مخالف سمت میں، نیچے اترتے ہوئے نہیں بلکہ اوپر چڑھتے ہوئے محمت ٹیرس پر تھا۔ اپنے ہونٹوں کے گوشے پر مذاق اڑاتی مسکراہٹ لیے۔ میں نے اسے دیکھ کر منہ چڑھایا۔

مزدوروں نے ابھی اپنی شفٹ شروع نہ کی تھی۔ میں نے خود کو دھندلے تاریک سرمئی پانی کے حوالے کر دیا۔ کیا یہ ختم ہوا؟ کیا یہ آخری مرتبہ تھا؟ میں نے تیرنا جاری رکھتے ہوئے اس کے خلاف مزاحمت کی۔

جب میں سمندر سے باہر نکل رہی تھی ایک فورمین اپنی موٹر سائیکل پر قریب سے گزرا۔ اس نے شور مچاتے ہوئے باڑھ کے قریب موٹر سائیکل پارک کی۔ اس نے اپنا رخ میری طرف موڑے بغیر مبہم طور پر سلام کیا۔ میں نے ''صبح بخیر'' کہا۔ ایک خاموش ''صبح بخیر''۔ میں باغ میں شاور کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ میں بے حد ٹھٹھر گئی۔

خدیجہ باڑھ کی دوسری جانب سے آئی۔

''وہ آج کنکریٹ ڈالیں گے۔''

پھر مشینیں بھی آ گئیں۔ کنکریٹ مکس کرنے والی مشین نے کان بہرے کر دینے والا شور کیا۔ میں اپنی دنیا میں فرار ہونے، وہاں اپنی میز پر پناہ لینے کے لیے جلدی میں تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے خدیجہ کو اندر بلا لیا۔ وہ عثمان کو بانہوں میں اٹھائے اندر چلی آئی۔ بچہ مسلسل روتا رہا۔ اس کے چہرے پر سرخ نشانات تھے۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

خدیجہ نے اپنے کندھے اچکائے، ''یقیناً میرے دودھ نے اسے بیمار کیا......''

میں نے تیز چائے تیار کی۔ میں نے ہم دونوں کے لیے ایک ایک گلاس بنایا۔ چائے نے مجھے بارشوں، گیلے تاریک سرمئی دنوں کی یاد دلا دی۔ میرے اوپر، لکڑی کے تختے کیڑوں کے کترے ہوئے سوراخوں سے پُر تھے۔ چھت کی ٹائلیں گر چکی تھیں۔ چمنی عرصہ ہوا گر چکی تھی۔ میں ابھی آئی تھی، کیا میں پہلے ہی جا رہی تھی؟ میں گھر کو اس کے حال پر چھوڑ جاؤں گی۔

''کیا آپ نے سنا، لوگ کہتے ہیں کہ کوئی راتوں کو یہاں گھومتا ہے؟ کیا میرے شوہر نے آپ کو بھی یہ بتایا؟'' خدیجہ نے پوچھا۔

اس کی آواز، اس کے تاثر میں ہمیشہ وہی چبھتا ہوا طنز...... اگر قادر نہیں تو کسی اور نے مجھے ضرور بتایا ہوگا...... شاید خدیجہ کا رویہ اس فاصلے کا انتقام لینے کا ایک طریقہ ہے، جو میں نے ہمارے درمیان رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیشہ وہی بداعتمادی، ہمیشہ اتنی ہی دشمنی جتنی وہ دوست تھی۔ جتنی حقارت اتنا ہی احترام۔ جارحانہ پن اور اس قدر چاپلوسی۔ بیزاری اور اتنی ہی حقارت......

نہیں، نہیں...... صرف مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔ بالکل جیسے قادر جائے تعمیر کی چوکیداری کرتا ہے، خدیجہ میری چوکیداری کرتی ہے۔ میری غلام اور آقا، دونوں۔

میں نے اسے کہا کہ میرے بارے میں فکر نہ کرے۔ ہاں، یقینی طور پر میں کچھ ہلنے کی آوازیں سنتی رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ صنوبر کے درخت، خرنوب کے اس بڑے سے درخت کی شاخیں اور ربر کا درخت، چھت کے ساتھ رگڑ کھاتے تھے۔ چھت کی ٹوٹی ہوئی ٹائلیں ان سے ہلتی تھیں اور ہلکی سی بھی ہوا سے کھڑکیاں بجنے لگتی تھیں۔ سردیاں بے حد قریب تھیں......

''بہر حال میرا وقت بھی محدود ہے، میرا وقت پورا ہو چکا ہے، میں جلد ہی چلی جاؤں گی۔''
میں نے کہا۔

خدیجہ بے حد افسردہ ہوگئی۔ وہ پریشان اور مضطرب ہوگئی۔ ''اتنی تھوڑی سے دیر کے لیے گھر کو کھولنا تھا؟ ابھی تو آپ آئی تھیں اور اب آپ جا بھی رہی ہیں؟''

اس کے ساتھ ساتھ میں اس کے گھر صرف ایک مرتبہ گئی تھی۔ میں ہمیشہ فاصلے پر رہی تھی، ہم کبھی بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ نہ رہے تھے...... ''اگر آپ کو رات کو یہاں کسی کے گھومنے پھرنے کا شبہ ہو تو بس فون کر دیں۔ فکر نہ کریں۔ میرا خاوند سوتا نہیں ہے۔ وہ ہر شے پر نگاہ رکھتا ہے...... '' وہ بولی۔

وہ اپنے ہونٹوں کو پھیلاتے ہوئے ہنس دی جو گرمیوں میں بھی اس قدر خشک اور پھٹے ہوئے تھے کہ ان سے تقریباً خون رِسنے کو تھا۔ ''آپ جانتی ہیں، یہاں کی ہوا اچھی ہے، سمندر اچھا ہے، گرم ساحل اچھے ہیں۔ آپ کا دوبارہ بچہ ہو جائے گا، فکر مت کریں۔ کیا یہ گھر آپ کے نام ہے؟''

میں اسے جواب نہ دے پائی۔ خدیجہ نے چائے کا ایک اور گلاس پیا۔ اس نے کہا کہ اگر انہیں اس موسم سرما میں دوبارہ جیل بھیج دیا گیا تو وہ بچوں کے ساتھ ایک خاندان کے طور پر جائیں گے۔

''یوسف اس کا عادی ہے، لیکن میں پریشان ہوں کہ یہ دوسرے چھوٹے بچے کیا کریں گے؟''

وہ اندر سے بہت فکر مند تھی۔ کسی بھی طرح اسے یوسف کے ساتھ تجربہ ہو چکا تھا۔
بہر حال، تین سالہ بچے، پانچ سالہ بچے اپنی ماؤں کے ساتھ جیل آتے جاتے رہتے ہیں۔
عثمان ابھی تک رو رہا تھا۔ ہوا کا رُخ مغرب کی طرف ہو چکا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ دیواروں سے بجتے رہے۔ یوسف جاگ چکا تھا اور عثمان کے رونے چلانے سے اسے معلوم ہوگیا کہ اس کی ماں میرے پاس تھی۔ اس نے دھکے سے کچن کا دروازہ کھولا اور خدیجہ کی اسے بھگانے کی کوششوں پر کوئی توجہ نہ دی۔

''جاؤ شدمان کے پاس کھڑے ہو!'' وہ بولی۔

شدمان بھی دروازے کے سامنے کھڑی تھی، خدیجہ نے اسے اندر کھینچ لیا۔ یوسف فوری طور پر ٹائپ رائٹر کے قریب گیا...... اس وقت کیا واقعی ایسا ہوا تھا یا میں اب یوسف کی اس مشین میں ضدی دلچسپی کو معنی دینے کی کوشش کر رہی ہوں؟...... اس نے اس میں یہاں وہاں دخل دینا شروع کر دیا۔ بالکل آج، اس صبح کی بات ہے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا۔

''آپ مجھے نہیں دکھائیں گی کہ اس پر کیسے لکھا جاتا ہے؟''

میں دیر گزری بھول چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یوسف بھی بھول چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اس سے وعدہ کیا تھا، کیا تھا ناں؟ حقیقت میں، میرا خیال تھا کہ کھدائی کی مشین آنے پر اس کی ٹائپ رائٹر میں دلچسپی ختم ہو گئی تھی، جیسا کہ ایسا ہونا چاہیے تھا۔

میں نے مشین میں کاغذ لگایا اور چند بٹن دبائے۔ یوں جیسے یوسف کو نہیں بلکہ خود کو بہلانے کو۔ یوسف فوراً ہی میری جانب آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر چند بٹن دبائے۔

''تم نے کھڑکیوں سے جھانک کر بار بار دیکھ کر تیزی سے سیکھ لیا۔'' میں نے اسے کچھ مذاق سے کچھ ملامت سے کہا......

''میں نہیں دیکھتا۔ میں کھڑکیوں سے نہیں جھانکتا!'' اس نے ایک بار پھر ضدی پن سے کہا۔ میں نے اصرار نہیں کیا۔ ہر لمحے اور میری ہر جانب یوسف، اور ہر لمحے اور میری ہر جانب اس کی پیچھا کرتی نگاہیں۔ کیا ایسا ہی نہیں تھا؟

''اس کے بابا اسے پیٹتے ہیں۔ انہیں پریشان نہ کرو، وہ کہتا ہے۔'' خدیجہ نے تبصرہ کیا۔

''ہم جیل جانے والے ہیں۔ میرے وہاں دوست ہیں۔''

''دفع ہو جاؤ!'' اس کی ماں نے کہا۔ اس نے اس کے سر پر مکہ مارا۔ وہ مزید بولی، ''ہمیں کیسے پتا ہو کہ وہ عورت ہماری دوبارہ نگرانی کر رہی ہے یا نہیں؟ قادر بتاتا نہیں۔ اسے سب پتا ہوتا ہے لیکن وہ بتاتا نہیں کہ کیا ہوا ہے!''

میں نے بچوں کو بسکٹ دیئے تھے۔ انہوں نے اس کے ٹکڑے بکھیر دیئے۔ خدیجہ بسکٹوں کے ریزے اٹھا اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال رہی تھی۔ ''ہمارا وکیل بھی ہے لیکن اسے اس کی زیادہ

پرواہ نہیں۔ وہ عورت اسے رشوت دیتی ہے یا پھر کچھ اور بات ہے، میں نہیں جانتی......''

اس کے دانتوں کی درمیانی خالی درزیں بسکٹوں کے ریزوں سے بھر چکی تھیں۔ دھکیلتے اور دھکے دیتے ہوئے اس نے بچوں کو کھڑا کیا۔ وہ چلے گئے۔

میں پریشان تھی۔ میرے...... یا ہمارے...... باقی رہ جانے والے وقت میں بار بار مداخلت کی جا رہی تھی۔ ان کی وجہ سے یا پھر نیند یا پھر شک وشبہ، جو جلد یا بدیر اس میں مداخلت کرتا جو میں بتانے جا رہی ہوتی ہوں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی مداخلت کرنے والی چیز مجھے روک دیتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ ایسا ایسا ہے، میں یہ بتانے کے ناقابل ہوں کہ ایسا حقیقت میں ہے بھی یا نہیں۔ کھدائی کی مشین کا کان پھاڑ دینے والا شور میری شاعری سے بھری دنیا کو ہلا دیتا ہے۔ میں واضح طور پر سوچ نہیں پاتی ہوں۔

اس لمحے میں پُرسکون ہوں۔ میں اپنی دنیا میں ہوں۔ جب میں خدیجہ کے بارے میں سوچتی ہوں، تو اپنے لمبے سیاہ بالوں، شفاف جلد، موجودہ زمانے کی نوجوان عورت، جو کہ آزاد ہے، کے تاثر کے پیچھے چھپی اس کی مقید ذات کے ساتھ میرچ میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

ہم ان پہاڑیوں کی سیر کر رہے تھے جو شمال کی طرف بتدریج بلند ہو جاتی ہیں۔ وہ سورج طلوع ہونے کے بالکل بعد کا وقت تھا۔ اس صبح دوآن سب سے پہلے جاگا تھا۔ اس کے لبوں پر اشعار تھے:

یہی وقت ہے جب سرد، سخت زمین
ساحل کی طرف بہتی ہے۔
وقت جب زندگی کھو گئی ہے
پہاڑی وادیوں میں......

ہم نے گزشتہ رات کوہ پیمائی کی تیاری کی تھی۔ ہم پہاڑوں پر چڑھ کر وہاں سے کھلے سمندر کو دیکھنا چاہتے تھے۔

محمت نے فواد کو بہت مشکل سے جگایا تھا: ''جاگ جاؤ فواد ابی! ہم پوری دنیا کو دوبارہ دریافت کرنے والے ہیں!''

اس کے ہونٹوں کے گوشوں پر، اوپر سے دیکھتے ہوئے ہمیشہ وہی مسکراہٹ اور اسی وقت دوسروں سے یہ جھگڑا کرتے ہوئے: ''جاگ بھی جاؤ، ہم دنیا کو دوبارہ سے دریافت کرنے والے ہیں!''

زیادہ دیر نہ گزری تھی، جب میرچ اور میں تنگ سڑکوں پر، پہاڑوں کے جنگلوں میں، باتوں میں گم ہو گئے تھے، محمت کی یہ بات اکثر میرے کان میں گونجی تھی اور مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا اور اس صبح، جب خدیجہ مسلسل بولتی رہی، یہ میرچ تھی۔ اس کی باتیں، سوالات، فکریں، اندیشے...... میری وضاحت کرنے کی، بتانے کی کوششیں۔ اب وہ سب ایک دوسرے میں مل جل گیا تھا۔ لیکن صرف ایک چیز خاص طور پر واضح ہے۔ ان پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے ہم بغیر سانس لیے ان چیزوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے، جن پر عرصہ پہلے قابو پایا جانا چاہیے اور انہیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔

ہم تیزی سے ساحل اور مرکزی سڑک سے گزرنے کے بعد پہاڑوں کے سرے پر پہنچ گئے۔ ایک پرانی اجاڑ ہائی وے، اب ایک غیر واضح سا ٹریک، پیدل راستہ، گہرے گھنے جنگل کو جاتا تھا۔ گھنے سایوں والے درخت۔ ڈھلانوں پر، ترنج اور کیلے کے جھنڈ ندیدے پن سے صبح کی حدت جذب کر لیتے۔ حسن نے اپنے ہاتھ میں ایک چھڑی تھام لی تھی۔ وہ آگے آگے چلتا گیا اور گھنی جھاڑیوں کو ہٹا کر ہمارے لیے راستہ بناتا گیا۔ پھر ان مہربان کاموں کے بعد اس کے وہی ڈرا دینے والے مذاق، اس کی وہ ''Boo'' کی آوازیں، نیا حسن۔

جب ہم پہلی پہاڑی کے چبوترے پر پہنچے، ہمیں جنگل کے دیہاتوں سے نیچے آتے لوگ ملے۔ وہ پانی کے ایک ذخیرے کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ ایک بکری کی کھال اتار رہے تھے جسے انہوں نے درخت سے لٹکا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک جانور کی کھال میں پھونک مار رہا تھا، جس کا گلا کاٹا جا چکا تھا، اس میں کسی ڈرم کی طرح ہوا بھر رہا تھا۔

دوآن فرار ہو چکا تھا...... دوآن کا فرار ہونے، کترانے کے رجحان...... میں خاصے مسئلے مول لے چکا ہوں، میں خود اپنی تکلیفوں کے ساتھ یہاں ہوں!...... محمت جو آخر میں ہر شے کے بارے میں متجسس تھا، جو کچھ جانے بغیر کسی چیز یا بات کو جانے نہیں دیتا تھا، خصوصاً حیران ہوتے ہوئے کہ وہاں کیا ہوگا اس کے ساتھ، جہاں وہ جیسے مسحور تھا، ششدر رہ گیا تھا۔ فواد جو ہمیشہ پُر اسرار، یا نمائشی

ہوتا، ان لمحات میں اس نے کہا، ''کون کہتا ہے کہ میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن کسے پرواہ ہے، دیکھو، زندگی گزار کر میں اس سے زیادہ جانتا ہوں جتنا تم کتابوں سے جانتے ہو!'' وہ میرچ کو بتا رہا تھا، ''جانور ضرور سفر میں بیمار ہوں گے۔ اس کا خون اس کے مرنے سے پہلے جسم سے بہا دینے کو انہیں وہ ذبح کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ان کے لیے بڑا ناشتہ ہوگا......''

میرچ اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے...... اس کی لمبی خوب صورت انگلیاں...... بڑبڑائی تھی، ''کراہت انگیز! خوف ناک!''

وہ اس کٹے ہوئے سر کو دیکھ رہی تھی، جسے گردن سے لٹکایا گیا تھا...... وہاں، مجھے اپنے بیٹے کی پتلی سی نوجوان گردن دکھائی دیتی ہے جو ہر رات متواتر میری آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے...... ایک جوان بکری۔ جانتے بوجھتے یا نہیں...... وہ جس نے اس کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بیماری سے نہ مرے، اس کا خون نکل کر بہ جائے، وہ میں نہیں ہوں، اس کا باپ نہیں ہے! وہ جسے آپ نے جنم دیا، جسے آپ نے خود پروان چڑھایا، اس پر آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ آپ کا اختیار نہیں! حسن سمجھ گیا۔ اس نے انتہائی دلفریب انداز میں سب سے زیادہ یقین دلانے والے، انتہائی ضروری الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے، دہرائی ہوئی ایک بات: ''شاید انہیں قربانی کی ضرورت ہو۔''

اس کی آواز پھٹی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑا سا ہکلایا...... اسے اپنے کہے پر خود بھی یقین نہ تھا...... یہ میرا اب کا تجزیہ ہے۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ حسن اپنی انتہائی قائل کرنے والی، انتہائی خوش امید حالت میں تھا، یہ کہ وہ ایسا اچھا انسان تھا۔ وہ تو وہ بلاشبہ تھا۔ کیا نہیں تھا؟

ہم دوبارہ سڑک پر آگے روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد، دوآن نے پوچھا، ''کیا وہ کوئی دعوت تھی؟''

وہ کوئی دعوت نہیں ہو سکتی تھی۔ دہقانوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ تو کوئی جنازہ سا لگتا تھا۔ فواد نے ان میں سے ایک سے بات کی تھی۔ اس نے خوشی خوشی ثابت کیا کہ وہ یہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ ''جانور سفر میں بیمار ہو گیا تھا۔ اگر وہ اسے ذبح نہ کرتے، اس کا خون نہ بہنے دیتے تو وہ اسے کھا نہیں سکتے تھے۔ وہ ضائع ہو جاتا۔'' اس نے کہا۔

وہ ضائع ہو جاتا۔ سب کچھ ضائع ہو جاتا۔ چراگاہیں، پچکارنا، ہاتھ پھیرنا، بے

خوابی، پہاڑی راستوں میں صرف کیے گئے اتنے دن، امیدیں......

وہ خوف ناک تھا۔ایک بکری جس کی حلقوں سے باہر اُبلی ہوئی آنکھیں تھیں۔

میرچ۔اس کا خوب صورتی اور حُسن کا جذبہ اور اس کے احساسات دونوں بری طرح متاثر ہوئے تھے۔فواد کی عقل پر مبنی وضاحتیں، اس کا مقامی جغرافیے کا علم، میرچ کی کوفت کو کم نہ کر پا رہے تھے۔اپنے متناسب وجود اپنی آنکھوں کے ساتھ، جو عجیب پُراسرار طور پر وان بلیوں (ترکی میں وان جھیل کے علاقے کی بلیاں، جن کی آنکھیں نیلی یا بھوری، یا ایک نیلی اور ایک بھوری ہوتی ہیں) کا خیال دلاتی تھیں، اس قدر پریشان حال اور دکھی دکھائی دیتی تھی کہ وہ تقریباً مر ہی سکتی تھی۔

گھاٹی سے گزرنے کے بعد ہم دوسری پہاڑی پر چڑھے۔

وہ، محمت اور میں سب کے پیچھے ہی رہے۔میرچ کی لمبی خوب صورت انگلیاں اس کے بالوں، رخساروں اور گردن پر گھومتی رہیں۔یقیناً وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ خصوصاً گردن، ان کی مناسب جگہ تھی یا نہیں۔اچانک اس نے پوچھا۔

''جب ہم مرجائیں گے تو ہم کیسے لگیں گے؟''

......جب ہم زندہ ہیں تب ہم کیسے لگتے ہیں؟......

کیا مجھے یہ چیخ اپنے اندر سے سنائی دی تھی یا محمت کے اس جسم سے جو اچانک رک کر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے اس کے جسم سے کوئی بڑی سی سوئی گزار دی گئی ہو، اس جسم پر اچانک جھریوں زدہ چہرے پر؟

میں نے میرچ کا کانپتا ہاتھ تھام لیا۔''تم اتنی نوجوان ہو......موت کے بارے میں بوڑھے لوگوں کو سوچنے دو۔''

میں نے ایک رٹی رٹائی بات کہی تھی، میں جانتی ہوں۔کیوں کہ یہ رٹی رٹائی تھی یا یہ کسی اور وجہ سے تھی، میں خود اپنے آپ کو بھی مؤثر نہیں لگی۔کاش موت کسی قابل پیش گوئی طور پر آتی......سو یہاں ہو تم، جب خوب صورت دن جیسے جا چکے اور ختم ہو چکے ہیں، ایک مرتبہ پھر لمحے بھر کو میں نے اچانک خیال کیا کہ ان خوب صورت دنوں میں پوچھا گیا ہر سوال، یہ بے مثال قدرتی صورتِ حال، مصنوعی تھی اور یہ کہ دیا جانے والا ہر جواب، ایسا جواب تھا جو سچ سے بہت دُور تھا،

لیکن کیوں؟......

محمت یہ کہتے ہوئے بدمزاج ہو گیا تھا، ''کیا کوئی اس عمر اور موت کو بھلا نہیں سکتا؟''

میں اب بھی سنتی ہوں:

''میں بھول نہیں سکتی۔'' میرچ کہتی ہے۔

''محبت میں یقین رکھو۔ محبت میں اور جینے میں!'' محمت نے بے حد مضبوط انداز میں کہا۔ وہ اس سوئی کو نکال کر پھینک چکا تھا، وہ کانٹا جو اس کے اندر چبھ یا گڑ گیا تھا۔

''ہم سب کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔'' میرچ نے اسی مضبوطی سے کہا......تم وہ نہیں ہو جو بالوں، آنکھوں اور ایک جسم (ایک واحد دانت) کی اہمیت کے ساتھ زندہ ہے!......

محمت نے اجاڑ قلعوں کے شہزادے کی طرح سیلوٹ کیا۔ بڑے سلیقے اور انداز سے وہ ہمارے سامنے ہلکا سا جھک گیا۔ اس نے ہمیں ہم پر چھوڑ دیا۔ وہ صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں میں گھسا اور چلا گیا۔ ہم نے کچھ دُور سے اس کی آواز سنی۔ اس کی آواز جو نہ کسی مرد کی آواز تھی نہ عورت کی، حتیٰ کہ اس کی عمر کے چرچ میں مناجات پڑھتے سڑکوں، مسجدوں میں اذان دیتے نوجوانوں کی یاد دلاتی آواز: ''تم! وہ سپاہی جو اس سرزمین کے لیے زمین پر گر چکا ہے! جینے کے سوا یہاں ہے ہی کیا، مجھے جواب دو!''

وہ جنگل کے کسی پرندے کی طرح دکھائی دیتا تھا، کچھ مذاق اڑاتا، کچھ سنجیدہ، پھر بچوں کی سی ہنسی کی پھوار سنائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ فاصلے پر غائب ہو گیا۔ یوں تھا جیسے وہ سب کچھ یہاں ان زمینوں پر چھوڑ گیا تھا، سب کچھ کے باوجود، اور لامتناہی آسمان میں واپس چلا گیا تھا۔ اس نے اپنی سیڑھی لگائی اور ہمیشہ واپسی کے راستے پر اوپر چڑھتا چلا گیا۔ ان پھولوں کو ابھی بھی اپنے ہاتھوں میں لیے جو وہ صحراؤں میں لایا تھا۔ تباہ ہو چکے پھول۔ جو کہیں بھی کاشت نہ کیے جا سکتے تھے، پامال پھول۔ کسی قدر مرجھائے ہوئے، اپنے مالک کے بغیر۔

یہاں اس پہلی حقیقتاً گرم جگہ جسے وہ جانتی تھی، میرچ کسی بلی کے بچے کی طرح میرے بازو سے چپک گئی: ''وہ نہیں سمجھ سکتے نویم۔ لیکن آپ کو سمجھنا چاہیے۔ ایک عورت ہوتے ہوئے آپ مجھے سمجھ سکتی ہیں۔ میں دو آن کے ساتھ اچھا محسوس کرتی ہوں۔ اس کے بغیر میں بنجر، بے جڑ، بے بنیاد،

گم ہوجاؤں گی۔لیکن......''

پھر بہار میں کھلتی کلی کی طرح وہ کہہ اٹھی، ''ذرا سوچیں، میں اسے چھو بھی نہیں پاتی ہوں۔ میں نے اسے کبھی بوسہ نہیں دیا۔ میں اپنے وجود کو اس کے قریب نہیں کر سکی۔ میرا وہ آگے کا دانت...... میرے اس سامنے کے دانت کی وجہ سے......''

......چیزیں جن کے حقیقت میں معنی ''کچھ نہیں'' تھے،، انہیں اہم بنالیا گیا تھا......

میرچ کہتی ہے، ''ہنسئے مت، حیران مت ہوں، غصہ مت ہوں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے، ہے ناں؟ جب بھی میں اسے بوسہ دینے والی ہوتی ہوں، میرا سامنے کا دانت میرے دماغ میں اٹک سا جاتا ہے۔ میں فوراً خود کو محفوظ کر لیتی ہوں، میں اس سے گریز کرتی ہوں۔ میرے دو آن سے ملنے سے قبل میرا یہ دانت ٹوٹ گیا تھا اور جب میں نے اس کی جگہ نیا دانت لگوالیا تو مجھے اب اس کا خیال صرف تب آتا ہے جب میں اسے بوسہ دینے والی ہوتی ہوں۔ میں اس بارے میں سوچنے سے رک نہیں سکتی، یہ میری جان نہیں چھوڑتا۔ لیکن اس وقت مجھے اس کا خیال نہیں آتا جب میں لیموں چبا رہی ہوتی ہوں۔ ایسا دو بار ہوا، ایک مرتبہ جب میں ناشپاتی کھا رہی تھی اور پھر دوسری مرتبہ جب میں انار کھا رہی تھی۔ پہلی مرتبہ میں مارکیٹ میں تھی۔ میں نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ میرے سامنے کا دانت جا چکا تھا۔ آئینے میں دکھائی دینے والا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ مجھے لگا کہ میں کسی اور کے جسم میں تھی۔ وہاں عارضی طور پر مقیم۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں ہمیشہ اس عارضی حالت میں ہوتی ہوں......''

اب جب میں یہ سب باتیں بتاتی ہوں، میں پوچھتی ہوں: سامنے کا ایک دانت کسی کچی ناشپاتی سے ٹوٹ سکتا ہے، جسے ہم بڑے ذوق وشوق سے دانتوں سے کاٹتے ہیں، یہ باہر آ سکتا ہے۔ کیا اس کا حُسن میں کوئی مقام نہیں؟ ہمارا محبت اور عشق میں ٹوٹا ہوا، شکستہ حال اور درماندہ ہونا کسی اَن چھوئے کامل پن کے حُسن سے کم کیوں ہے؟ نہ جیے گئے کامل پن، بے نقص ہونے کا حُسن، حُسن کیوں ہے؟

میرچ پیچھے ہٹتے اور اپنے سیاہ بالوں کو سلجھاتے ہوئے جو صبح کی ہوا بادِ نسیم میں الجھ گئے تھے، بولی، ''اور اب اگر میں اسے بوسہ دیتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ یہ سامنے کا دانت گر جائے گا۔''

جب میرچ یہ سب بیان کر رہی تھی، میں ہنس رہی تھی لیکن میں مزید نہ ہنس پائی۔ اس کے کچھ برعکس، مجھے اپنے اس قسم کے پرانے خوف اس سے بانٹنے کی خواہش ہوئی۔ شاید میں اپنی

موجودہ ذات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہتی تھی یا اسے تسلی دینا چاہتی تھی:

''میں تم سے بدتر صورتِ حال میں تھی میرچ۔ یہ جاری رہی یہاں تک کہ میں نے جان لیا کہ میں مکمل تھی۔ میری ان جگہوں پر جو ہمیں دی گئی تھیں، جو ہمارے لیے ترتیب دی گئی تھیں، حُسن کی حُسن کے احساس کی مسلسل کھوج اور اسی لیے جگہیں جو ہماری نہ تھیں۔ میرا دستیاب اور غیر استعمال شدہ حُسن کو حُسن کے احساس کے طور پر لینا۔ میرے خوف، اندیشے...... ایسا ایک مرتبہ لندن میں ہوا تھا۔ جب میں ایک اخبار کے فارن نیوز سروس کے شعبے میں کام کر رہی تھی۔ مجھے ایک اہم ایونٹ کے فالو اپ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی وہاں ایک آرٹسٹ بھی تھا۔ میں اس رات بالوں کی Extension لگا کر ایک میٹنگ میں گئی تھی۔ میں وہ دوروں پر اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ ایسی صورت میں کہ مجھ ایک سے دوسری جگہ بھاگتے اپنے بالوں کی دیکھ بھال کا وقت نہ ملتا...... وہ چیز اپنے سر پر لگا کر میں نے خیال کیا کہ میں نے اپنے بالوں کا ایسا انداز بنا لیا تھا جو مجھے سوٹ کرتا تھا۔''

مجھے معلوم نہیں، شاید ایسا تھا، شاید نہیں۔ یہ میرے میٹنگ سے آنے کے بعد ہوا۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور کپڑے بدلنے لگی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ میں واقعی بہت تھکی ہوئی تھی، میں خواہش سے معمور تھی۔ میں نے حسن کی بے حد کمی محسوس کی۔ تبھی کسی نے میرے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ وہی آرٹسٹ تھا۔ وہ بے حد حساس تھا۔ وہ بے پناہ پیارا تھا۔ آپ اس کے ساتھ اپنی فطری حالت میں رہ سکتے تھے، اس پہر اپنے اندر اترتی تنہائی یا اکیلے پن کے احساس کو بھول سکتے تھے اور اپنی آرزو کی تکمیل اس کے ساتھ کر سکتے تھے اور اس کی واحد تمنا میرے ساتھ رات گزارنا تھی۔ آپ سوچتے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مر جاتا۔ اس قدر مخلص۔ اس قدر مکمل۔ ہماری راہ سے گزرنے والا ہر شخص ہمیں اس اخلاص کا احساس نہیں دیتا۔ لیکن وہ، وہ ایسا ہی تھا۔ پھر میں نے اسے مسترد کر دیا، ایسی کسی بات کے لیے نہیں جو مجھے سکھائی یا پڑھائی گئی تھی نہ کسی نیکی بدی کے احساس کے لیے، میرا مطلب ہے اس لیے نہیں کہ میری حسن سے شادی ہو چکی تھی اور میں ایک تیرہ سالہ بچے کی ماں تھی بلکہ اس لیے کہ میں نے سوچا کہ کیا ہو کہ جو چیز میں نے سر پر سجا رکھی ہے، وہ اچانک اس کے ہاتھ میں آ جائے۔ میں نے صرف ان نقلی بالوں کے ہاتھوں زندگی بھر کے وہ لمحے کھو دیئے۔ کیا حسن کے ساتھ یہ کچھ مختلف ہوتا؟''

خوشی اور تکلیف کے درمیان کہیں میرچ نے پوچھا، ''اس کے ساتھ کیسا تھا؟''

''ہماری شادی سے کچھ عرصہ پہلے ہونے والے میرے اپنڈکس کے آپریشن کے نشانات تب بھی کچھ کچھ دکھائی دیتے تھے۔ میں تب 18 سال کی تھی۔ حسن اور میری تب ملاقات ہوئی ہی تھی۔ حسن اس قدر گرم جوش تھا اور مجھے اس گرم جوشی کی اس قدر ضرورت تھی اور زندہ دلی کی...... جب میں حسن کے ساتھ ہوتی تھی تو میرا اپنا ماضی، اس ماضی نے مجھے اخلاقیات کے جو اصول سکھائے تھے اور وغیرہ وغیرہ، ان سب کا کچھ مطلب نہ تھا۔ میرا ماضی، میرے ڈاڑھی والے بابا، مجھے چھوڑ رہے تھے، میرے اندر سے نکل کر کہیں جا رہے تھے۔ یہ مجھ سے وہ نہیں کروا سکتا تھا جو یہ کہتا تھا۔ تم جانتی ہو، ہم خود کو ہمیشہ کسی آبجیکٹ کس شے کی طرح دیکھتی ہیں اور پھر ہم مردوں پر غصہ کرتی ہیں کہ وہ ہمیں کسی آبجیکٹ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ہم دکھی ہو جاتے ہیں۔ اپنڈکس کے آپریشن کے اس داغ نے مجھے حسن سے اس وقت قریب ہونے سے روکے رکھا جب میں سب سے زیادہ اس کے قریب ہونا چاہتی تھی۔ میں کہا کرتی تھی کہ اس نے میری حفاظت کی، میرے خدایا، یہ کہ کتنا اچھا تھا کہ اس نے میری حفاظت کی۔ اپنڈکس کے آپریشن کے ایک نشان نے میری حفاظت کی، اس نے مجھے بچایا! ہاں، یہی لفظ تھا۔ اس نے مجھے ''بچایا۔'' یہ لفظ تھا، میری سوچ یہ تھی۔ ہمیشہ حفاظت میں رہنا۔ خود اپنی سچی ذات نہ ہونا...... اگر بچایا جانا محفوظ رہنا یہی ہے...... خود کو قید کرنا...... اگر آزادی یہی ہے...... میرا مطلب ہے کہ سب کچھ ہو جاتا، لیکن جہاں اس سے آگے کی بات تھی، جہاں تک اس نشان کو لباس تلے سے باہر لانے کی بات تھی، میں رک جاتی۔ میں حسن کو بھی روک دیتی۔ میں کسی خچر کی طرح مزاحمت کرتی، خود کو اپنے سیل میں مقید کرتے ہوئے...... اور حسن، شاید وہ اندر ہی اندر مسرور ہوتا، اسے ایک قسم کے شرمیلے پن، ایک قسم کے کنزرویٹو رویے اور میرے ''اخلاقیات کے پابند'' ہونے پر محمول کرتا تھا۔ ہاں، میں شرمندہ تھی۔ لیکن کیا یہ اس لیے تھا کہ میں نے محبت کا کھیل تب کھیلا، جب مجھے حسن سے محبت نہ تھی؟ یا اس وقت یہ دکھاوا کرتا کہ مجھے اس کی آرزو نہیں تھی جب کہ تھی؟ نہیں، اپنڈکس کا نشان، خراشیں اور میرے بدن کی وہ خامیاں جن کے لیے میں ذمے دار نہ تھی...... تمہیں سمجھنا ہوگا، میں اپنے ایک ''نیک نوجوان لڑکی''، ''ایک صالح عورت'' ہونے کے لیے ان کم بخت مفروضہ خامیوں، رکاوٹوں کی مقروض ہوں۔''

میری نظریں زمین پر جمی رہیں۔ میرے پیروں تلے خشک ٹہنیاں چرمرائیں۔ کسی طرح میں اپنا سر اٹھانے کے آخر قابل نہ ہو پائی۔ اگر میں اپنا سر اٹھاتی تو مجھے خیال تھا کہ میرا سامنا ان لمحوں سے ہوتا جو حسن یا دوسروں کے ساتھ اصلی حسین صورت میں جیے نہ گئے تھے۔ جب میں اپنا سر ایک قبل از وقت موت کی دیوار سے ٹکرا بیٹھی تھی، مجھے عزیز ترین شخص کی موت، اس کے بہت دیر بعد، یہاں بہار کے اختتام پر، میرے خود کو اپنے باکس سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں، مجھے بلاشبہ حسن وخوب صورتی کے کھوئے ہوئے لمحات کو مقید کرنے کی، سچی محبت کا تجربہ کرنے کی آرزو تھی......

میرچ میری بازو سے مزید چمٹ گئی تھی: ''آپ اس قدر کھل کر بات کر لیتی ہیں نویم۔ آپ خوب صورت ہیں۔ آپ پہلے کبھی سے کہیں زیادہ حقیقی ہیں۔ میں دوسروں کے ساتھ اس قدر کھل کر کبھی بات نہ کر سکتی تھی۔''

درخت زیادہ گھنے طور پر ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے۔ آسمان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شاخوں کے بیچ سے کچھ سنہری دھوپ چھن کر آ رہی تھی۔ دائیں اور بائیں طرف پرندے قدموں کی آہٹ سن کر پر پھڑ پھڑاتے مگر اڑ کر دُور نہ جاتے تھے بلکہ قریب ترین ٹہنی پر دوبارہ بیٹھ جاتے تھے۔ وہ صبح کا وقت تھا جب میں بہ مشکل خود اپنا مذاق اڑانے، اپنے آپ پر ہنسنے کے قابل ہو پائی تھی۔ کسی طور میں کبھی ایسی مسکراہٹ کا اظہار نہ کر پائی تھی جو اب مجھ میں سے پھوٹی تھی۔

''ہم دنیا کو دریافت کرنے جا رہے ہیں!'' اگر محمت کی یہ بات میرے کانوں میں نہ گونجی ہوتی، میں خود پر ہنسنے میں کبھی کامیاب نہ ہو پاتی۔ ایک دوسرے کا تعاقب کرتی خزاں کی تتلیوں کے ایک جوڑے پر نظریں جماتے ہوئے میں پچھتاوے کے ایک گہرے احساس میں گھر گئی تھی......

''لیکن یہ حقیقت ہے کہ حُسن کا احساس یا شعور جو ایک مرتبہ حاصل ہو چکا ہو، پوری طاقت سے جیا جاتا ہے اور ہر سطح پر، نویم؟''

میں نے میرچ کو بتایا کہ حُسن، خالص پن اور ڈسپلن سے ہم آہنگ ہونا چاہیے، جو کچھ قدرتی تھا اس سے اور ہمارے اس پر کنٹرول سے ہم آہنگ۔ لیکن کسی خالص پن اور ڈسپلن سے، کس فطری پن اور کنٹرول سے؟ ہر شے کے لیے بہت سے ممکنات ہیں۔ حسن کے شعور یا احساس کو بھی ان بہت سے ممکنات کے انتخاب سے بھی ہم آہنگ ہونا چاہیے۔'' میری پیاری میرچ......جس کا مطلب

ہے کہ ہمارے پاس لاتعداد ممکنات بے حد کم رہ جاتے ہیں۔ Corset کی بات کی جائے تو دیکھو، یہ سنو: ایک مرتبہ میرا ایک دوست جو اس کمپنی کے لیے تراجم کرتا تھا جس کے لیے میں کام کرتی تھی، اچانک آیا۔ وہ ایک پیراگراف پر مشورے کے لیے آیا تھا جس کی اسے ٹھیک سے سمجھ نہ آ پائی تھی...... مل کر کام کرتے ہوئے ہمارے درمیان چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ بے ساختہ...... وہ ہم آہنگ تھا۔ لمحے بھر کو یا زندگی بھر کو، میں نہیں جانتی، اس سے فرق بھی نہیں پڑتا، لیکن تم جانتی ہو، ہمارے درمیان ایک کلی سے کھل گئی تھی۔ میں کافی کا کپ اپنے ہونٹوں تک لے جانے ہی والی تھی، یا اس کھلی ہوئی کلی کو تھامنے اور سونگھنے والی تھی، لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ اس روز میں Corset پہنے ہوئی تھی۔ ہلکی خوب صورت سکرٹ کے ساتھ پہنا جانے والا Corset جو ہمارے احساسِ حسن سے موزوں رہتا...... دوبارہ وہی حُسن کے نام پر۔ لیکن اب وہ ہمارے راستے میں تھا، اس قدر بے لچک، خالص حقیقت کے سامنے اپنی تمام تر بدصورتی کے ساتھ۔ میرا بدن اکڑ سا گیا تھا۔ یعنی جیسے ہی میں نے یہ جان لیا میرا بدن اکڑ گیا، یا میں ''معصوم'' بن گئی۔ اس طرح کہ، آخر میں میرے دوست کو معذرت بھی کرنی پڑی، تم سمجھتی ہو؟ وہ میری حالت سے واقف نہیں تھا؟......'' اب میں پاگلوں کی طرح ہنسنا چاہتی تھی لیکن اس دوست کے سامنے، ہنسنا ناممکن تھا، حتیٰ کہ اپنا مذاق اڑانا بھی...... میرے احساسِ حسن کی حدود اتنی ہی کھلی تھیں جتنا میرا Corset، وہ بے حد تنگ تھیں۔''

جب میرے دوست کا معذرت خواہانہ چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آیا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آئی۔ میں ہنس رہی تھی، بار بار یہ کہتے ہوئے کہ Corsets بے حد تنگ ہیں، ہم کیسے دفاع کر سکتے ہیں، ہم ان کے ساتھ کیسے بچ سکتے ہیں؟

جہاں تک میرچ کی بات تھی تو وہ اس قدر سنجیدہ تھی کہ پہلے کبھی نہ رہی ہوگی: ''اور میں، آپ سمجھتی ہیں، کہ میں اپنے اگلے دانت کے احساس پر کبھی قابو نہ پا سکی۔ میں یہاں پھنسی ہوئی ہوں۔ اور پھر میں بات کرتی ہیں اس کے بارے میں، اس کے پیچھے بھاگتی ہوں، خوب صورتی یا حُسن کا احساس، اب کیسے اس طرح بھاگ سکتی ہیں؟ ہاں، یا Corset یا سامنے کا دانت...... تنگ چھوٹے چھوٹے قید خانے...... آپ نے اس پر کیسے قابو پایا نویم؟ کیا آپ نے اس پر قابو پالیا؟''

چاہے میں اس پر قابو پا سکی تھی یا نہیں، کیا کچھ اور ایسا نہیں تھا جو ضروری تھا؟ دیکھتے ہیں

آیا میرچ واقعی دوآن کو چاہتی تھی! یا دوآن، میرچ کو چاہتا تھا؟ کیا وہ محفوظ رہنا اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے؟ ہم ظلم و جبر نہیں چاہتے لیکن ہم پر ظلم و جبر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک اندرونی طاقت کا استعمال خود کو ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کرتے ہیں لیکن یہ سوال بھی پوچھا جانا چاہیے۔ میرا دوست جو ترجمے کے لیے آیا تھا، یا وہ آرٹسٹ، کیا وہ صرف خوش اخلاق تھے یا پھر ان کی تمنا یا چاہت میں کوئی کسر تھی؟ یا کیا ہمارا یہ جوش و جذبہ پہل کاری کرنے کی خواہش اس قدر محدود اور کم تھی کہ ہم نے خود کو Corsets، نقلی دانتوں اور بالوں کے پیچھے چھپالیا؟ مرد، عورت، ہر کوئی ہر کسی کو خود کو نقصان پہنچائے بغیر اس سب سے پیچھے کھینچنا ہوگا۔ گھر بدلنے ہوں گے لیکن فرنیچر اور نمک دانیوں کو ان کی مناسب جگہوں پر ہی رکھنا ہوگا۔

میرچ چاہتی تھی کہ میں باتیں جاری رکھوں، وہ اصرار کر رہی تھی۔ میں نے مزید بات نہیں کی...... یقیناً میں نے انہیں اپنی میز پر آخری دنوں کے لیے بچالیا تھا، جیسے جیسے بارش پہنچتی...... کیوں کہ وہاں لزبن (Lisbon) کی رات بھی تھی۔ پرتگال میں حکومت کا تختہ الٹے جانا۔ سالازار کی حکومت ختم ہوگئی تھی۔ مجھے ایک بہت پرانے صحافی دوست کی جانب سے دعوت نامہ ملا تھا۔ میں اپریل کی شب کا کہر آلود بحیرۂ روم اور اوقیانوس کا امتزاج نہیں بھول سکتی، دیر گئے رات کی کہر جو تندور سے تازہ نکلی ہوئی روٹی کی طرح بھاپ دے رہی تھی۔

قدیم شہر میں سڑک پار چرچ آف سانتا لوسیا کے سامنے چھوٹا سا ریسٹورنٹ جہاں سے Tejo کی بندرگاہ دکھائی دیتی تھی...... (کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ میں یہ سب دوآن کے ساتھ دوبارہ جینے کی کوشش کر رہی تھی؟)

خلیج آتش بازی سے سجی ہوئی تھی۔ وہ جو تازہ ترین خبط کے پیچھے تھے، ہر گوشے میں لوک گلوکار گیت گا رہے تھے۔ انہوں نے پرانے لوک گیتوں کو نئے بول دے دیئے تھے۔ ردھم بھی بدل چکا تھا۔ ہم اس چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے ٹیرس پر تھے۔ میرا دوست جوز، تین سویڈش ٹی وی کے لوگ اور میں۔ کچھ دیر پہلے ہی ہم ہزاروں لوگوں کے لیے بنائے گئے اس ہال میں منعقد تقریب سے آئے تھے۔ ہر طرف خوشی کا دور دورہ تھا، سڑکوں پر گاڑیاں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جشن کچھ مشکل سے شروع ہوا تھا، لیکن ایک بار شروع ہونے کے بعد یہ صبح تک جاری رہا۔ مجھے جشن کے

انتہائی زندہ دل لمحات میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، جو تقریباً عجلت میں سامنے آئے تھے۔ یوں جیسے ڈکٹیٹر کو اسی روز نکال باہر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اسے ''انقلاب'' کہا۔ شاید وہ ٹھیک کہتے تھے۔ ریسٹورنٹ آنے سے پہلے ہم نے قدیم شہر کی سڑکوں پر چہل قدمی کی۔ مچھلی کے ریسٹورنٹ، Calamari فروخت کرنے والے، مے خانے، قحبہ خانے، سب مصروف تھے۔ وہ سب باہر تک بھرے ہوئے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ آنے والے کل میں ان کے ساتھ کیا ہوگا، تمام رستے بانہوں میں بانہیں ڈالے باہر جاتے لوگوں سے بھرے تھے، تمام راستے ان تنگ گلیوں اور چھوٹے پلازوں میں آتے جاتے، گاتے، رقص کرتے لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ Figueira سکوئر میں، Agustino de Carvelho میں اور بظاہر Cristo-Rei پر، شہر کے سارے راستوں پر۔ شہر کے مرکز Rossio میں روشنیاں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ بوڑھی طوائف الفاما (Alfama) جو جشن میں شریک تھی، کسی مہربان خوب صورت چہرے والی دادی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جس نے اپنے میک اپ کی تہیں اتار دی تھیں۔ اپنا مسکارا اتار دیا تھا۔ واحد شے جس سے اس نے خود کو سجا رکھا تھا وہ اس کے سر پر Barcelos Rooster تھا۔ جب وہ اس روسٹر کے ساتھ ہجوم کا حصہ بن گئی، آپ کو لگا کہ الفاما کبھی بھی کوئی بوڑھی طوائف نہ تھی۔ وہ درد انگیز اشعار، صوفیانہ، اداس گیتوں کی ممتا بھری آغوش ہے۔ دیواروں پر، گھروں کی نیلی Limoges ٹائلوں پر، ابھی تک نقش ہے: "...!Morte Ao Fascismo"۔ گھروں کے کوئی اگلے دروازے نہیں ہوتے، گلیوں میں کوئی فٹ پاتھ نہیں ہیں۔ اس کے برعکس یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ وہ جگہ گھروں کا سامنے کا حصہ تھی یا پچھلا صحن۔ سڑکوں کی کاریں جو ایک دوسرے کے قریب سے گزرتی تھیں اور گھروں کی کھڑکیاں پہاڑی پر چڑھتی نسبتاً چوڑی سڑک پر کھلتی ہوئی، کاریں مزید حرکت نہ کر سکتی تھیں کیوں کہ اب ہجوم بے حد زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل اپنے ہارن بجا رہے تھے۔ ہارن کی آوازیں چرچ کی گھنٹیوں کے ساتھ گڈمڈ ہو گئیں۔

سویڈش پروڈیوسرز پہلے لمحے ہی سے مسحور تھے۔ جب وہ بھیڑ کے قریب سے گزرے، ان کی خوشی خوف میں گڈمڈ ہو گئی۔ وہ لوگوں کی دیوانہ وار حرکت میں شامل لگتے تھے لیکن ایک قسم کے خطرے یا اندیشے میں ملا ہوا خوف ان کے چہروں پر دیکھا جا سکتا تھا۔ ملک کے لوگ جو نظم و ضبط کے ضرورت سے زیادہ عادی ہو چکے تھے، یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی وقت میں، اس پاگلانہ ہنگامے میں،

جنت اور جہنم دونوں میں جی رہے تھے۔اس شور وغل کے دوران ان میں سے ایک Gustav نے یہ پرواہ بھی نہ کی کہ اس کی قمیص، پینٹ سے باہر نکل رہی تھی یا اس کے پیر کچلے جا رہے تھے، اسے اس سب کی حتیٰ کہ خبر بھی نہ تھی، وہ واقعتاً لوگوں کے اُس جوش وخروش میں شامل ہو رہا تھا، جس کی کوئی حدود نہ تھیں۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

ریسٹورنٹ ایک چھوٹے سے پلازا کے کونے پر تھا۔اس کے ٹیرس پر پانچ یا دس میزیں ہی لگ سکتی تھی۔ پلازا کے دوسری جانب، Tejo کے سامنے کی پہاڑی پر چرچ آف سانتا لوسیا تھی۔ ہم ٹائلیں اور سجاوٹوں سے ڈھکی اس کی بیرونی دیواریں دیکھ سکتے تھے۔ پام کے درختوں تلے، بچے دائروں میں ناچ رہے تھے، ان میں سے بیشتر اپنے قومی لباس میں۔ جوز کس قدر خوش تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آنے والا روز ان میں سے کسی کے لیے نئ مشکلات حتیٰ کہ کوئی ایک مسئلہ بھی لے کر نہ آتا۔ سالازار کی حکومت الٹ گئ تھی۔ اگر یہی معاملہ تھا تو جوز الفانسو کی پیدائش کے وقت سے جاری اذیت وتکلیف کا خاتمہ ہونے جا رہا تھا۔ سپاہیوں کی رائفلوں کی نال میں سرخ کارنیشن تھے...... یوں لگتا تھا جیسے لوگوں کی پچھلی خاموشی کبھی وجود ہی نہ رکھتی تھی......

ریسٹورنٹ کی مالکہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ وہ بھی قومی لباس پہنے ہوئے تھی۔اس نے اپنے سیاہ بالوں کی دو چوٹیوں کو سر کے گرد کسی تاج کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔اس کے ہونٹ آتشی سرخ رنگ کے تھے۔ جب اس نے جوز کو دیکھا، وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے دونوں رخساروں پر بوسہ دیا اور جوز نے اسے گلے لگاتے ہوئے زمین سے اٹھایا، ایک چکر دیا اور پھر دوبارہ اسے زمین پر کھڑا کر دیا۔ وہ بچوں کی طرح تھے۔ کچھ دیر وہ مل کر باتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوب صورت تھے اور اس میں کوئی مصنوعی یا بناوٹی بات نہ تھی۔ وہ اس تکلیف و کرب سے اکٹھے گزرے تھے اور انہوں نے مل کر ان دنوں کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ میرا انہیں دیکھ کر جی نہ بھرا۔ کچھ دیر بعد مجھے خبر ہوئی کہ Gustav میرا بازو تھامے ہوئے تھا۔اس نے میری کہنی تھام رکھی تھی اور اسے دبا رہا تھا۔اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا۔اس نے مجھے حیران کر دیا۔ میں لڑکھڑا گئی۔ مجھے اپنے دل میں ایک درد سا محسوس ہوا۔ میرے گھٹنے کپکپا رہے تھے...... میں نے اچانک خود کو وہاں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر گرا دیا۔

''کیا دن تھا! میں تھک گئی ہوں!''

اور ہوٹل کی مالک فرانسسکا نے ہمیں ایک میز پر بٹھا دیا۔ Gustav، اس بات کا انتظار کیے بغیر کہ کوئی اسے بیٹھنے کو کہتا، میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ دوسرے سویڈش اپنا پسینہ پونچھ رہے تھے اور کپڑے سیدھے کر رہے تھے۔ جوز ہمارے آرڈرز فرانسسکا تک پہنچا رہا تھا۔

''تم ان دیوانوں کے ہجوم کے ساتھ خاص موزوں ہوگئی تھیں۔ تم بالکل بھی غیر ملکی یا اجنبی دکھائی نہیں دیتی ہو......'' Gustav، اس کا منہ میرے کان کے بالکل قریب۔ میں دوبارہ کانپ گئی۔ یہ اس قسم کی کپکپاہٹ نہیں تھی جو آپ کو کان میں کسی بال کے گھسنے یا کسی کیڑے کے اسے چھو جانے سے ہوتی ہے۔ اس زندہ دل روشن رات میں مَیں چاہتی بھی تو خود کو اپنی خاموش تاریکی میں واپس نہیں کھینچ سکتی تھی۔ میں نے گھروں کی کھڑکیوں سے جھانکتے بوڑھے چہرے دیکھے تھے جن پر گلیوں میں دیوانہ وار خوشی منانے پر فکرمندی تھی۔ میں نے انہیں بھی دیکھا تھا جو پلازا کے کناروں پر کھڑے تھے، گانے اور ناچنے میں شامل نہ ہو پائے تھے اور بے جان سے چہروں پر بے جان دھندلی آنکھوں کے ساتھ اردگرد دیکھ رہے تھے کہ کیا ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے اداس کر دیا۔ آسمان پر رنگ دکھاتی پھٹتی آتش بازی کی چنگاریاں جب نیچے گرتے ہوئے بجھ جاتیں تب بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا۔ زندگی کے انتہائی جوشیلے، زندہ دل، روشن لمحے میں بھی، میں معلوم کر لیتی کہ موت موجود تھی۔

کسی ملک میں جہاں آپ غیر ملکی ہیں، آپ اس کے عوام کی موجودہ حالت میں دلچسپی رکھتے ہیں، وقت جس میں وہ زندہ ہیں۔ صرف تب جب آپ اپنی دنیا سے باہر ہوتے ہیں، کیا آپ ماضی اور مستقبل سے الگ ہو جاتے ہیں۔ آپ پوری طرح صرف ''اب'' میں زندہ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کا تنہائی اکیلے پن کا احساس بھی مختلف ہے۔ اسے بیان کرنا واضح کرنا آسان ہے۔ یہ وقت کے صرف اُس دورانیے کے لیے ہے۔ یہ تبدیل ہوسکتا ہے۔ آپ خیال کرتے ہیں کہ جیسے ہی آپ ان لوگوں کو چھوڑیں گے جن کی زبان اور عادات سے آپ واقف نہیں، یہ ختم ہو جائے گا۔ یہ گزر جائے گا، بیت جائے گا اور اسی وجہ سے یہ اتنا مقرر یا لگا بندھا، مایوسی بھرا اور غمگین نہیں ہو جاتا، جیسا کہ وہ اکیلا پن جو آپ اپنے ملک میں محسوس کرتے ہیں۔ اس کی بجائے یہ بہت اونچی آگ کی طرح ہے۔ جب آگ بجھتی ہے، یہ بھول جاتا ہے۔ چھپ کر گزرنے اور چلے جانے کے لیے۔ یہ بالکل کسی

ٹرین، بس یا جہاز کے ٹکٹ کا سا معاملہ ہے۔

میں ہلکے سے Gustav پر مسکرادی۔ میں دوسری طرح ایسا نہ کرسکتی تھی۔ اور جب تک کھانا آیا، فرانسسکا اور دوسرے ایک لمبی بحث میں گم ہو چکے تھے۔ فرانسسکا کی کمر میں اپنا بازو ڈالے جوز جھوم اور گا رہا تھا:

"Eles comen tudo / Eles comen tudo"

انہوں نے یک آواز ہو کر گایا۔ وہ گیت خون آشام بلاؤں کے بارے میں تھا۔ انہیں بیان کرتے ہوئے جن کا تختہ الٹا جا چکا تھا، یہ برسوں تک سینہ در سینہ گزرنے کے بعد حال میں پہنچا تھا۔ ''خون پینے والی...... خون پینے والی......'' جوز نے اسی دوران ان الفاظ کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا۔ لیکن میں اسے بہ مشکل ہی یاد رکھ پائی۔ مجھے آج یہ بھی یاد نہیں آپایا کہ "Enao..." کے بعد کیا تھا۔ Gustav کا رخسار میرے رخسار سے جڑا تھا۔ اس کا منہ مسلسل میرے کان میں، اس کی وہ مسلسل کپکپا دینے والی آواز: ''یہ دیکھنا کہ کوئی، جسے آپ جانتے ہیں کہ غیر ملکی ہے، ان سڑکوں کے ساتھ مسلسل ہم آہنگ ہے، یہ عمارتیں، یہ صورتِ حال، حتیٰ کہ کیسل آف سینٹ جارج یا ''Barcelos Rooster'' بھی مجھے Tejo کے اوپر برستی روشنیوں کی برسات سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ یہ مجھے ان لوگوں کی ناقابل قابو مسرت کی نسبت زیادہ جذباتی بنا دیتا ہے۔ یہ مجھے بے حد پُرجوش بنا دیتا ہے۔ مجھے خود کو تمہیں چومنے سے روکنے میں بڑی مشکل ہو رہی ہے......''

کچھ ہوا۔ میں مڑی اور میں نے اسے بوسہ دیا۔ چاہے میرے منہ کے 32 دانت ہی نقلی ہوتے، میں یہی کرتی۔ میز پر موجود دوسرے لوگوں کی تالیوں میں مَیں اس سے جدا ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں مکمل طور پر الگ ہو پائی تھی۔ وہ سب کہہ رہے تھے، "Enao...."

Gustav نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں نے فوراً ہی خود کو جھڑک دیا ہوتا۔ ایک ایسے شخص کی آنکھوں میں دیر تک دیکھنا جسے میں آج ہی ملی تھی، مجھے مضحکہ خیز، بے حد رومانوی...... فرسودہ لگا ہوتا۔ لیکن میں اپنی نگاہوں کو اس کی نگاہوں سے آزاد نہیں کروا پائی۔ کیوں کہ کچھ نیا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے، جو میرے اندر تک اتر گئی تھیں، کسی بچے کی طرح اس کے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے۔ شبنم جیسے خاموش آنسو...... ایک ناقابل رسا احساس کے لیے اس قدر

"Eles comen tudo!.....Eles comen tudo!"...... کی پکاریں اس طرح ختم ہوگئی تھیں کہ گہری تمنا!...... میز پر ہر کوئی ان خاموش آنسوؤں کی خاطر خاموشی کا یہ لمحہ دیکھنے کے لیے خاموش ہو چکا تھا......اس دیوانی رات میں......ایسے بچے کے آنسو جسے عمر بھر کے لیے کسی گرمی، کسی گرم جوشی کے بغیر چھوڑ دیا گیا تھا......

اس بارے میں بعد میں سوچتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا، ''گرین ویلی سے وائن بالکل درست وقت پر پہنچی ہے!''

وائن کے گلاس بلند کیے گئے، وہ میز کے درمیان آپس میں ٹکرائے۔ "Salut"۔ ہم نے کہا۔ ہم نے پیا۔

سحر زائل ہونے کو تھا۔ وہ بہت تھوڑی دیر رہا لیکن وہ بہت طاقت ور تھا۔ آفاقی اصطلاحوں میں کچھ پاک ہو چکا تھا، تطہیر ہو چکی تھی۔ ملن کا ایک احساس، جنس سے کہیں آگے۔ میں نے کیسے ایک لمحے کو خود کو Gustav کے ساتھ ایک پایا تھا؟ کیسے باقی سب ہمارے ساتھ ایک ہو گئے تھے؟ میرا خیال ہے کہ اس رات مجھے جس چیز نے قید خانوں سے بچایا، جس کے بارے میں میرچ نے بات کی اور جسے میں نامعقول مثالوں کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ زندہ دل فضا تھی جس میں ہم نے خود کو گہرے طور پر جمے پایا، داخلی راستے کا کسی جشن کا سماں، قلعے سے شہر پر ہوتی آتش بازی کی برسات، ہر جانب سے فضا کو بھرتی گٹار کی آوازیں، جدید زمانے کے Fados (پرتگالی لوک گیت) جنھوں نے اپنے غم اور اطاعت گزاری کو خوشی اور بغاوت میں تبدیل کر لیا۔ دیوانگی بھرے جذبوں کو منعکس کرتے چہرے، ان لوگوں کے جذبے جو اس طرح لوک گیت گا رہے تھے جیسے وہ ہر لمحے اس اطاعت گزاری اور تکلیف کے خلاف بغاوت کر رہے تھے جو برسوں سے چلی آ رہی تھی، مختصراً آزادی کا وہ احساس جس نے ہمیں گھیر لیا۔ ہمیں یہ سوچنے کی اجازت نہ دیتے ہوئے کہ گزرا کل کیا تھا، آنے والا کل کیا ہوگا۔ ہم ہمیشہ خود پر اترتے دھوئیں کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری ناک میں گھستی گلنے سڑنے کی بو، مبالغہ آرائی کر کے، رخ موڑ کر، خوب صورتی کے احساس کا رستہ بدل کر۔ ایسا کرتے ہوئے ہم اپنی مایوسی پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے جیسے قدیم لوگوں نے اپنے مذہب اور خدا پر اپنے یقین کے ذریعے اسی مایوسی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مایوسی کو جڑ سے اکھاڑنے کی

بجائے ہم خدا پر یقین کے برخلاف اس کی جگہ خوب صورتی کے مکمل اور بدلے ہوئے احساس کو دے کر اپنی اناؤں کے دفاع کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے ناممکنات سے انکار نہیں کر رہے تھے۔ ہم یہ دکھاوا کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے کہ یہ ممکن تھا۔

جب خوشی کی طرح تکلیف اس نقطے پر پہنچ جاتی ہے جب آپ آنے والے کل کے بارے میں مزید نہیں سوچتے تو ایسا ہی ہوتا ہے...... وہ رات جب میں بس ٹرمینل پر دوآن سے ملی...... وہ عجیب رات جب میں نے خوشی اور تکلیف دونوں کو مختلف دلوں مگر ایک جیسی شدت کے ساتھ محسوس کیا......

☼

فواد بالکل آگے تھا۔ حسن اور دوآن پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ ہماری طرف یہ کہتے ہوئے ہاتھ ہلا رہے تھے، ''اس طرف سے، اس طرف سے۔'' وہ ہمیں وہ جگہ دکھا رہے تھے جہاں سے ہم عبور کر سکتے تھے۔ فواد کی پیشانی اپنی ٹوپی تلے پسینے کے قطروں سے بھری ہوئی تھی۔ حسن نے اپنا رومال اپنی گردن میں باندھ لیا تھا...... اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ منظر جو میری آنکھوں کے سامنے دوسری بار ظاہر ہوتا ہے، وہ اس قدر نفرت انگیز کیوں لگتا ہے؟ اس لمحے ایسا دو چہروں والا دوآن کیوں؟ ایسا بے ذائقہ بے بُو حسن؟ اور......

ہم ایک کلیئرنگ تک آئے تھے۔ آگے جنگل کا چوڑا راستہ پھیلا ہوا تھا۔ آسمان جس پر صبح جب ہم جاگے تھے تو بادل یہاں وہاں گھوم رہے تھے، اب سیسے کے رنگ کا ہو چکا تھا۔ ٹھنڈک اب گرم مرطوب ہوا میں بدل چکی تھی جو بڑھتے ہوئے زیر کر رہی تھی۔ صنوبر کی درختوں کی ایک شاخ ایک پتا تک نہیں ہل رہا تھا، ہمیں صرف صنوبر کے مخروطوں کی چیخ کر کھلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جو ان آتش بازی کے پٹاخوں کی یاد دلاتے تھے جو بچے سڑکوں پر چلاتے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب چھال چٹختی ہے اور اپنے بیج اردگرد پھیلا دیتی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے سرما کی پُرسکون بارش نہیں بلکہ آندھی آنے سے کچھ دیر پہلے کا وقت تھا۔ یوں تھا جیسے صنوبر کے مخروطوں کے چٹخنے کا شور طوفان کا پیغام بر تھا۔ میں محمت کو نہ دیکھ پائی۔ میرا دل اچانک ممتا بھری فکروں سے پریشان ہو گیا۔ میرچ نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا۔ وہ رستے کے متوازی پھیلی ہوئی صنوبر کی ایک شاخ سے بچنے کے لیے نیچے

جگی۔ وہ رک گئی اور دوبارہ پوچھا، ''آپ خاموش ہو گئی ہیں نویم؟ سوچ میں گم؟''

سب کچھ ماضی میں تھا اور ہم حال میں تھے۔ لیکن حال مضبوطی سے گزرے اور آنے والے کل سے جڑا ہوا تھا۔ میری نگاہوں نے محمت کو تلاش کیا۔ میں بے حد فکر مند تھی۔

''محمت کہاں ہے؟''

میں اسی شاخ کے نیچے سے گزری جہاں سے میرچ گزری تھی۔ میں دوبارہ اس کے ساتھ تھی۔ میں سمندر کو دیکھنے کے لیے گھومی جو دُور نامعلوم جگہوں پر سرمئی سبز ہو رہا تھا۔ موجیں بڑے جزیرہ نما کے ساحل سے بار بار ٹکراتی تھیں اور یوں پیچھے ہٹتی تھیں جیسے انہوں نے اپنا منہ کئی چیزوں سے بھر لیا تھا۔ میرے ہونٹ نیم وا ہوئے۔ میں چلانا چاہتی تھی، ''محمت!''

میں نے خیال کیا کہ میں اسے اچانک دُور لہروں میں گم کر بیٹھی تھی، بے پایاں سمندر کے منہ میں، میرچ نے مجھے پکارنے کا وقت نہ دیا۔

''ہمارا شہزادہ ٹھیک ہے، نویم''۔ وہ بولی، ''لیکن میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میں دوآن کے بغیر ٹھیک ہو بھی نہیں سکتی اور پیچیدہ بات یہ ہے کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کے ساتھ ٹھیک ہوتی ہوں۔ میں تعریف کرنا چاہتی ہوں ان وقتوں کی جب دوآن مجھ میں پناہ لیتا ہے، اپنے مشکل دنوں، اپنی زندگی، اپنے بابا کا بوجھ اٹھانے کی کوششوں کے بعد۔ میں امید کا یہ ذرا سا ذرہ برباد نہیں کرنا چاہتی۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں مگر پھر میری راہ میں ایسی رکاوٹ آ جاتی ہے جس پر قابو پانا مشکل تقریباً ناممکن ہے۔ میں اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ میں اس جگہ سے نہیں نکل پائی جہاں میں دوآن کے یہ کہنے پر ٹریپ ہو جاتی ہوں کہ ''مجھے چھوؤ، بوسہ دو، میں تمہیں جاننا چاہتا ہوں، زیادہ اہم یہ کہ میں خود کو جاننا چاہتا ہوں، میں محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ میں وجود رکھتا ہوں۔'' نویم، یوں لگتا ہے جیسے میری نجات یہ ہو گی کہ میں اس وقت خود کو سمندر کی گہرائیوں میں چھوڑ دوں، اگر میں وہاں غائب ہو جاؤں۔ میری نجات اور دوآن کی بھی......''

میرچ ایسی باتیں کہتی ہے۔ جہاں تک میری بات ہے، میں فوراً دوآن کی طرف بھاگنا چاہتی، اسے گلے لگانا اور اس سے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔

''میرچ کو یہ جاننے مت دینا کہ یہ رات ہم دونوں کے لیے اس قدر مکمل اور سکون بخش

رہی ہے، ٹھیک ہے نویم؟''

یہ انتباہ، جس نے اچانک چٹانوں میں موجود مینار سے ہم پر پڑتی روشنی کو آن کر دیا، نائٹرک ایسڈ کی دھاریں، اس نے معنی بدل دیئے جب کہ جنگل بتدریج کھلا ہو رہا تھا۔ میرے ہر جانب پرندے گیت گاتے ہیں حتیٰ کہ کووں کی بدصورت آوازیں بھی ایسے خوش آہنگ نغمے ہیں جنہیں کوئی دُور تک سن سکتا ہے...... میرے پیروں میں ندیاں ہلکورے لے رہی ہیں اور جب ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے جو سمندر کو اپنی تمام وسعت کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے، مجھے پر پھڑ پھڑا کر اڑ جانے کی ایک نا قابل مزاحمت خواہش محسوس ہوتی ہے۔

میں کرنوں کے ایک ایسے سیلاب تلے تھی جو مینار سے نیچے اترتی روشنی سے لاکھوں گنا شدید تھا۔ اگر میرچ نے بات نہ کی ہوتی تو مجھے کیسے علم ہوتا کہ وہ موت کی ایسی شدید خواہش رکھتی ہے! کون جانتا ہے کہ اگر اسے کسی ایسی رات کے بارے میں علم ہو جب دوآن کسی اور کے ساتھ اس قدر مکمل ہو سکتا تھا تو اس کی یہ ختم ہونے، سمندر کی گہرائیوں میں غائب ہونے کی یہ خواہش کس قدر بڑھ جاتی!......اور میرچ کتنی نوجوان ہے......

''میرچ کو معلوم نہ ہونے دینا کہ یہ رات اس قدر سکون بخش رہی ہے، ٹھیک ہے نویم؟''

ٹھیک ہے دوآن!

کیا دوآن خود واضح طور پر سمجھ نہیں گیا تھا کہ وہ کسی عورت یا مرد کی نہیں بلکہ ایک انسان کی تلاش میں تھا؟ جب میں نے میرچ کی زخمی، ناامید آواز سنی، میں وہ سب کچھ سمجھنا شروع ہو گئی جو میں تب سمجھ نہیں پائی تھی جب دوآن نے اس رات وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس انتباہ کے اصل معنی میں امتیاز کر سکتی تھی...... وہ جس نے مجھے نائٹرک ایسڈ سے جلا دیا تھا، جھلسا دیا تھا، تکلیف دی تھی......صرف تب جب ہم اس پہاڑی کی چوٹی پر اس صبح پہنچے تھے۔ لیکن ایک خوب صورت اتفاق کے بعد، چاہے چند گھنٹوں کے لیے سہی تکلیف اور خوشی کو بھانپ لینے کے بعد اور جب خود دوآن نے ایسی وارننگ دی تھی، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس زمین پر اب شک وشبے سے خالی کوئی بے خوف خالص خلا باقی نہ رہا تھا۔ میں اس رات کے اختتام پر جدا ہو گئی تھی۔

اور جب ہم دوسری پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے، میں الجھن میں تھی، کیا مجھے اب دوآن کو گلے

لگانے کے لیے بھاگنا چاہیے، کیا مجھے میرچ کو گلے لگانا چاہیے، کیا مجھے ممت کی زنانہ آواز کی طرف یہ کہتے ہوئے مڑنا چاہیے کہ "ہم دنیا کو دوبارہ دریافت کرنے جارہے ہیں"؟ میں نامکمل ہونے پر فکر مند تھی۔ میں ان میں سے کسی کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ نہ حسن کو، نہ فواد کو، کسی کو بھی نہیں، کسی کو بھی نہیں......

ایک بار پھر میری مدد کو جو آیا وہ میرا دل تھا۔ اس نے ان سب کو اپنے اندر جگہ دے دی۔ میں نے ان سب کو آغوش میں لے لیا۔ میں ایک دوسری جہت میں محبت کرنا سیکھ رہی تھی۔ میرے اندر گہرائی میں ہواؤں کے طوفان یا گرد باد نہیں بلکہ بہار کی ہوائیں تھیں۔ میرے مدو جزر ختم ہو چکے تھے۔ میرے اندرونی طوفان......

آخر کار میں نے میرچ سے کہا، "نقلی بال، دانت، وہ Corsets، ہماری رکاوٹیں اور سب، ضرور وہ چیزیں تھیں جن میں ہم نے پناہ لی اور جلد یا بدیر ان کے پیچھے چھپ گئے۔ اگر وہ تمام چیزیں جو ہمارے وصل میں بے جا مداخلت کرتی ہیں...... گولیاں چلنا، قتل عام، مرنے والوں کی چیخیں، زمین پر ایک ایک کر کے تڑپنے والے نوجوان...... ہمارے نقلی دانتوں جتنا ٹھوس وجود رکھتے تھے، اگر ان چیزوں کو چھونا ممکن ہوتا، اگر ہم نے کبھی یہ محسوس کیا ہوتا کہ وہ ہمارا اتنا ہی حصہ تھے جتنا کہ کوئی آنکھ، منہ، ناک، بال، گردن یا خون، میرچ تو پھر درد، چبھن، فکریں جو یہ لاتے ہیں، اگر ہم ان سے بالکل اسی طرح تکلیف محسوس کر سکتے جیسا کہ گردوں کے کسی درد سے، تو پھر ہم ان کی اور ان کی اہمیت کی جگہ کسی اور دینے کے قابل نہ ہو پاتے، جیسا کہ ہم نقلی دانت کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں نہیں سوچتی۔ کیوں کہ آپ چاہے جو کچھ بھی جانتے ہو، چاہے جو کچھ بھی، آپ ساتھ والے گھر کی خدیجہ جیسے نہیں ہو سکتے۔ ہم واقف یا باخبر ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہم بدقسمتی سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ ہم نیم واقف ہیں، اتنے کہ جو ہمیں جو کچھ ہم جانتے ہیں اس سے الگ رکھنے کو کافی ہے، اس سے جو ہم جاننے کے قابل ہیں، ان چیزوں سے فرار کے لیے کافی۔ آپ جانتے ہیں، بالکل اتنا ہی۔ ان پر قابو پانے کے لیے کافی نہیں۔ کیوں کہ ہم سوچتے ہیں کہ ان پر قابو پانا ہمارے بس سے باہر ہے اور ہماری زود حسی اور نفاستوں کے باعث ہم اپنے آپ کو ایک طرح سے سزا دیتے ہیں۔ ہم خود کو تکلیف دے کر حتیٰ کہ خوشی حاصل کرتے ہیں۔ ہم اسے اس تکلیف کی جگہ اس کی نقل کو دیتے ہیں، جو ہم محسوس ہی نہیں کر سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ہم کچھ کرتے ہی نہیں، ہم کچھ کرتے ہیں۔ ہم کہنا

چاہتے ہیں کہ ہم کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہم مکمل طور پر زندگی میں ہیں نہ ہی اس سے مکمل طور پر باہر ہیں اور چوں کہ ہماری زندگی کی آگاہی ہمیں مکمل طور پر تاریکی میں ملتی ہے نہ حقیقی روشنی میں، شاید ہم اس زندگی کے لیے ایک قسم کا احساسِ جرم محسوس کرتے ہیں۔ آہ، کاش ہم جان سکتے! کاش ہم صرف جان ہی سکتے! ہماری نیم آگہی ہمارے لیے ہمارے سر اٹھانے یا سر جھکانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں: ہم نہیں جانتے کہ ہم کس چیز کے ذمے دار ہیں اور ہم کس چیز کے ذمے دار نہیں ہیں اور ہم جاننے کے مشتاق بھی نہیں ہیں۔ اگر ہم جانتے ہیں تو ہمیں جاننا پڑے گا کہ اس کی قیمت کیا ہوگی۔ ہم بھاگ جاتے ہیں اور ہم شرمندہ ہیں کہ ہم بھاگ جاتے ہیں۔ اس صورت میں کیا یہ واقعی واضح ہے کہ ہم یقین نہیں رکھتے یا خیال نہیں کرتے کہ ہمیں وصل کا یا حتیٰ کہ چھٹیاں منانے کا بھی حق نہیں؟''

کیا میں نے یہ سب باتیں کہی تھیں؟ کیا میں نے انہیں سوچا تھا؟ میرچ ہل کر رہ گئی تھی۔ چوں کہ وہ ایسی لگی اس لیے مجھے یہ سب باتیں صرف سوچنا ہی نہیں چاہئیں بلکہ ان کی وضاحت بھی کرنی ہوگی۔ میرچ ہلی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے بہت مختصر جواب دیا۔ ایک مزاحمت: ''لیکن کیا ہم ان چھٹیوں کا حق نہیں رکھتے تھے؟''

اس کے چہرے پر کرب تھا۔ وہ تناؤ میں تھی، ہمارے اوپر تنے آسمان کی طرح۔ کس قدر حسین ہوا گر وہ دونوں ہی اس لمحے آزاد ہو جائیں! لیکن Gustav کی یاد دلاتے، میرچ کے خاموش آنسو اپنے آپ میں بے حد حسین تھے۔ وہ تسلی دینے والے آنسو نہیں تھے بلکہ اس کی بجائے ایسے کہ جس پر اس نے نگاہیں...... وان بلیوں کی یاد دلاتی آنکھیں...... دُور کسی مقام کی جانب موڑ لیں اور اسی وقت خود اپنے اندر گہرائی میں جھانکا، اپنے دانت، اپنے بالوں، اپنی گردن سے آگے۔ آنسو ایک اندرونی طغیانی ہیں۔ وہ میرچ کی دنیا میں بالکل نئی غاریں کھود دیں گے۔ وہ اس خالی کھوکھلی جگہ سے بالکل بھی مشابہ نہیں جو اس دانت کے نکالنے سے بنی تھی...... میں نے یہ محسوس کیا۔

...... میں نے میرچ کو یہ باتیں بتائیں۔ اور اب میں نے جو کچھ کہا میں اسے صرف کاغذ پر منتقل کر رہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ میں اب ان سب چیزوں کے بارے میں سوچنے جا رہی ہوں۔ شاید جیسے جیسے میں بتا رہی ہوں، مجھے معلوم ہو رہا ہے......

دو آن مڑا اور ایک سوالیہ تاثر کے ساتھ ہماری طرف آیا...... ایک کوا اپنی بیٹھی ہوئی آواز

میں کائیں کائیں کررہا تھا۔ میرچ نے اپنا اگلا دانت نکالا اور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے دوآن کو گلے لگایا۔ اسے بوسہ دیا اور پھر بوسہ دیا...... وہ ہنس رہی تھی اور رو بھی رہی تھی اور دوآن صبح سے مسلسل چڑھائی چڑھ کر تھکا ہوا تھا۔

اس لمحے میں خود سے سوچ سکتی تھی کہ یہ خود ہماری زندگیوں کی طرح تھا۔ مجھے یہ جاننے پر ہلکی سی تکلیف بھی محسوس ہوئی ہوگی۔ اب کے بعد، تکلیف یا کرب ہماری لغت کا تاج ہوگا، یہ ضرور میرے ذہن سے گزرا ہوگا۔ لیکن اب اس شام کی ابتدا میں جب بادل جمع ہو رہے ہیں، جب جنوب مغرب سے آنے والی ہوائیں انہیں اکٹھا کر رہی ہیں، جب مغرب کی جانب روشنی کی کرنیں ان بادلوں کو روشن کر رہی ہیں، میں کہتی ہوں: شاید ہمارے دنوں اور راتوں کو سجانے والا اسرار ہنسی اور آنسوؤں کے لازم و ملزوم ہونے کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ وہ ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ ایک، دوسرے پر غلبہ یا برتری نہیں رکھتا۔ ہر ایک، دوسرے کے اندر۔ ہر ایک دوسرے کی جلد کے اندر نفوذ کرتے، گھستے ہوئے۔ محبت، شاعری اور موت۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی مغربی، شمالی یا حقیقی مشرقی، ہماری جیسی مسرت سے پیار کرتا، تکلیف اٹھاتا یا دیوانہ ہوسکتا ہے، یہ کہ یہ سب چیزیں ایک ہی لمحے میں فٹ ہوسکتی ہیں، یہ کہ تکلیف جو محبت کی تمنا سے سر اٹھاتی ہے، وہ عداوت نفرت کے بھی پیاسے ہیں، یہ کہ وہ یہ سب اتنی ہی شدت سے یکے بعد دیگرے تجربہ کر سکتے ہیں۔ وہ محبت کو جدا کر دیں گے یا پھر مڑ کر دیکھے بغیر مسرت میں گم ہو جائیں گے، یا مسلسل موت میں مبتلا ہو جائیں گے، وہ اپنی گونج دار ہنسی ہنسیں گے یا پھر زندگی کی مرکزی شریان کے نوحے پڑھیں گے۔ وہ نہیں جان پائیں گے کہ بادل، جنہیں بارش برسانے کی جلدی نہ تھی، انہوں نے بہت سے نیلے، روشن آسمانوں کو پناہ دی تھی، وہ رنگا رنگ جنگلوں اور بالکل ہموار پُرسکون پانیوں کی خفیہ بہنے کی آواز کو اور ان پانیوں کے ہمیں پکارنے کو نہیں جان پائیں گے۔ وہ کبھی ان ندیوں کو نہیں پہچان پائیں گے جن پر بند نہیں باندھے گئے تھے یا پھر وہ خود ان ندیوں سے بے خبر رہیں گے۔ خدیجہ اور یوسف یا ان جیسے دوسروں، تم سے بالکل الگ بالکل مختلف دوسروں کی نگاہیں، جو مسلسل تمہاری نگرانی کرتی ہیں، اس قدر قریب نہیں آئیں گی اور وہاں جھاڑیوں کے پیچھے جنگل کے درختوں کے قریب چیخنے اور سرسرانے کی مسلسل آوازیں نہیں آئیں گی، چٹانوں کے نوکیلے سروں پر اترنے والے رات کے پرندے غلطی

نہ کریں گے کہ ان کی آنکھیں کیا آشکار کرتی ہیں، وہ اپنے سے صرف دو گز دُور سورج کی تمازت سے جھلستے پسینہ آلود بدنوں والے ناتجربہ کار تعمیراتی مزدوروں سے اسی طرح انجان رہیں گے۔ ہمارا اُن نئے تعمیراتی مزدوروں کے بارے میں اس قدر بے خبر ہونا...... اگرچہ وہ ہمارے اس قدر قریب ہیں...... وقت کے کسی اور دورانیے میں، کسی اور جغرافیے میں، ایسی گہری کہر میں اس قدر چھپا نہ ہوتا...... شمال کی جانب، عمودی پہاڑ، کسی قدر دکھائی دیتے، بحیرۂ روم کی کہر سے ڈھکے ہوئے تھے......

ہم پہاڑی سے اتر کر ندی کی جانب گئے۔ راستے میں ہمیں محمت اپنی پشت کے بَل پھیل کر لیٹا دکھائی دیا۔ وہ کسی مردے کی طرح بے حرکت تھا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ کس راستے سے یہاں تک پہنچا تھا۔

حسن نے چپکے سے پکارا، ''محمت!''

محمت نے اپنی آنکھیں نیم وا کیں۔

''کیا تم سو رہے تھے، محمت؟''

''مجھے غیر معمولی آوازیں سنائی دیں، حسن ابی۔ نیچے لیٹ جائیں، آپ سب۔ آپ سب، سنیں، خاموش ہو جائیں۔'' وہ بولا۔

ہم سب ڈھلان پر ایک دوسرے کے قریب اپنی پشت کے بَل لیٹ گئے۔ ہم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی پہلے ہمیں بہت دُور سے بجتی شہنائی کی آواز سنائی دی، شاید ساحل کی طرف سے، وہ صنوبر کے مخروطوں کے پھٹنے کی مسلسل چرچراہٹ میں ضم ہو رہی تھی، جب وہ اپنے پردار بیجوں کو آزاد کرنے اور ہوا میں اڑنے کے لیے چٹختے اور ٹوٹتے ہیں۔ جب ہم پورے چاند کی چاندنی میں ٹیرس پر بیٹھے تھے، ہم شہنائی کی وہی آواز دوبارہ سننے والے تھے جب وہ لہروں کی آواز کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتی۔ ہم خود سے یہ دہرانے والے تھے:

''ہم غیر معمولی آوازیں سنتے ہیں۔''

آوازوں کے فیوژن نے ہمیں دوسری مرتبہ مسحور کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے اس بارے میں سوچا اور مسحور کرنے والے کو بھی دیکھنا چاہا، کپڑے اتار کر ہم پورے چاند تلے سمندر میں چلے گئے۔ ہم نے چٹانوں کے گرد تیراکی کی اور بڑے ساحل پر آ گئے۔ اجاڑ ساحل پر کوئی بھی نہ تھا۔

گیلے ساحل پر پشت کے بل لیٹ کر ہم نے دوبارہ سنا۔ پہاڑی دامن اور گھاٹی سے آتی صنوبر کے مخروطوں کے چٹخنے کی آوازیں اور لہروں کی آوازیں ہمارے بالکل ساتھ تھیں، ہمارے اندر۔ اور شہنائی کی آواز کی بازگشت یا گونج اب سمندر کی گرج کے ساتھ ضم ہوتی ہوئی چٹانوں کی طرف سے آئی، جب اس کی لہروں نے چٹانوں کے درمیان درزوں میں غوطہ لگایا اور واپس پلٹیں۔ ایک بار پھر، یہ غیر معمولی تھا۔

کیا شہنائی کی وجد آفریں وہاں واقعی موجود تھی؟ یا اسے ممت نے ہمیں سنایا تھا؟ میں اب بھی خود سے یہ پوچھتی ہوں۔

☼

آج انہوں نے کنکریٹ ڈالا۔ کنویں کے پمپ کا شور مسلسل جاری رہا۔ ساحل پر اترتی پہاڑی ڈھلان سے یہ شور ٹکرا کر مسلسل گونجتا رہا۔ جھونپڑی کے پیچھے موجود بڑی جھاڑیاں بھی کاٹی جا چکی تھیں، پتھروں کو صاف کر دیا گیا تھا۔ میں نے کھڑکیاں بند کر دیں۔

☼

''ماضی، حتیٰ کہ دس منٹ پہلے کا ماضی، اپنے خوب صورت پہلوؤں کے ساتھ آپ کے اندر زندہ رہتا ہے۔''

یہ حسن کی آواز ہے۔ یہ اچانک میرے کان میں پڑتی ہے۔

اس نے یہ بات کب کہی تھی؟ اس نے بہت پہلے ماضی میں جب یہ کہا تھا تب اس کے ہونٹوں کے گوشے پر ایک قسم کی حقارت ظاہر ہو گئی تھی۔ اب میری تنہائی میں جب وہ یہ بات دہراتا ہے، وہ مہربان ہے۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ ایسا ہے۔ نہیں، صرف مہربان نہیں بلکہ مزاحیہ بھی۔ تو پھر کیا ماضی ہمیشہ میرے اندر اپنے خوب صورت پہلوؤں کے ساتھ زندہ رہے گا، حتیٰ کہ کرب کے وقت میں بھی؟ جب موت ایک یاد میں بدل جاتی ہے تو کیا وہ بھی خوب صورت ہو جاتی ہے؟ میں نہیں جانتی۔ میں سمجھنے کی صرف کوشش کر سکتی ہوں اور بتانے کی...... وہ بتانا جو ہم جی چکے ہیں، جس طرح ہم جی چکے ہیں...... اور کوئی شک نہیں کہ بتانے، مسلسل بتانے سے میں تھک بھی گئی ہوں۔ وقفے، مداخلتیں یا ایسا اتفاق کہ خود کو حال سے کہیں بہت دُور پانا۔ جب ماضی بے حد غالب آ جاتا ہے۔ اس

وجہ سے اس سب بتانے کو اچانک فوراً ختم کر دینے کی خواہش کے ساتھ جیسے کسی مقام پر زندگی کے تقریباً خاتمے کی تمنا...... شہنائی کی وجد آفریں آواز کے اسرار کو حل کرنے کے لیے یا اس کے تعاقب میں جانے کے لیے۔تبھی الکوحل کے گلاس یا ٹیپ ریکارڈر میں پناہ لینے کے لیے......

میں نے ایک مرتبہ پھر جائے تعمیر کے اُس شور کو دبانے کے لیے ہمارے گیتوں میں پناہ لی جو بند کھڑکیوں کے باوجود میری سوچوں یا خیالات میں مداخلت کر رہا تھا...... اور یوں میں نے شہنائی کی اس وجد آفریں آواز کو کھو دیا۔

ٹیپ ریکارڈر کا والیم پورا کھول کر میں نے وہ Suzinak (ترک کلاسیکی موسیقی) گیت سنا، شاید کوئی دس مرتبہ۔اس دھن میں ایسا کیا تھا جو ان ساحلوں پر ہماری زندگی سے موزوں تھا؟ جسے ہم کسی استھائی کی طرح بار بار بڑبڑاتے دہراتے رہے؟

قادر دوبارہ آ گیا۔اس وقت تقریباً اندھیرا چھا چکا تھا۔اس نے ٹوپی پہن لی تھی اور وہ بڑا سا براؤن سکارف اپنی گردن کے گرد دوبارہ لپیٹ لیا تھا، جس سے وہ برف پوش عمودی پہاڑوں سے آنے والا کوئی ڈاکو دکھائی دیتا تھا۔اس کی رائفل اس کے کندھے پر تھی، اس کی سیٹی اس کی گردن میں لٹک رہی تھی۔وہ رات کی ڈیوٹی کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

''آپ چند دنوں سے اکیلی رہ رہی ہیں۔خدیجہ کہتی ہے کہ آپ خوف زدہ نہیں ہیں لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ مجھے پوچھ لینا چاہیے۔''

راتیں سرد ہیں۔میں اب پینٹ شرٹس پہنتی ہوں، اس لیے قادر کو اب مجھے دیکھ کر اپنی نظریں زمین پر نہیں گاڑنی پڑتیں۔لمبے عرصے سے میں اسے ٹیرس پر بلانا اور ایک ڈرنک کی پیشکش کرنا چاہتی تھی۔

''ٹیرس پر آ جاؤ۔میں نے بڑی اچھی پیسٹری بنائی ہے۔میں چائے بھی بناؤں گی، ہم اکٹھے پئیں گے۔''میں نے کہا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

''تم یہاں موجود ہو۔مجھے پھر بھلا کیوں ڈرنا چاہیے۔''میں نے کہا،''ٹیرس پر آ جاؤ۔ہم خدیجہ خانم اور بچوں کو بھی بلا لیتے ہیں......''

کچھ دیر پہلے، اندر، میں جان چکی تھی کہ میں ہماری کہانی کہنے کی کتنی بھی کوشش کرلوں، میں اسے کبھی ختم نہ کر پاؤں گی۔ اور میرے پاس وقت بالکل بھی نہیں بچا۔ میں اپنی خواب سی دنیا، کسی رومال کی طرح تہ کر کے، اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔ یہاں ان ساحلوں پر ہمارا نام ونشان بھی نہ بچے گا۔ کوئی بھی، حتیٰ کہ یوسف بھی یاد نہ کرے گا کہ کبھی اس باڑھ میں گھرے ہم یہاں رہتے تھے۔ وہ ہماری آوازیں، لہجے تک بھول جائیں گے۔ جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا، میری اپنی کہانی کہنے کی آرزو ایک مکمل جنون میں ڈھل گئی۔ اتنا شدید جذبہ یا جنون جیسے میں جب پہلے یہاں آئی تو باقی سب کی منتظر تھی یا جب میں اپنے پھپھوندی زدہ کریٹ سے باہر نکلنے کی بے حد مشتاق تھی۔

قادر بولا، ''نہیں، بچوں کو وہیں رہنے دیں۔ اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو میں یوسف کو بلا لیتا ہوں۔ میں خدیجہ کے ساتھ نہیں دیکھا جانا چاہتا۔ دوسری والی ہمیں ہر جگہ تلاش کر لیتی ہے۔ اس نے ہر جگہ اپنے جاسوس بھیج رکھے ہیں، بہتر ہو کہ ہم باہر کہیں انہیں دکھائی نہ دیں، ورنہ......''

میں الجھ گئی۔ کیا وہ وہاں اکٹھے نہیں رہ رہے تھے؟ کیا مزدور اور ہوٹل کا مالک یہ نہیں جانتا؟ اور دہقان؟ کیا دہقان ان سے مکمل طور پر غیر واقف ہیں؟ وہ بچے کیسے پیدا ہوئے، ایک کے بعد ایک؟

جب میں کچن میں چائے تیار کر رہی تھی تو میرے ذہن میں یہ سب سوال تھے۔ میں خود اپنے آپ سے پوچھتی رہی لیکن قادر سے نہ پوچھ پائی۔

میں پیسٹری کی پلیٹ لے کر باہر ٹیرس پر چلی آئی۔ قادر بینچ پر بیٹھا تھا اور یوسف جنگلہ یا باڑھ پھلانگ کر ہماری جانب آ رہا تھا۔

''یوسف، شدمان کہاں ہے؟''

''شدمان سو گئی ہے۔'' وہ بولا۔

وہ اپنے باپ کے پاس بنچ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا اور جنگل کو دیکھنے لگا۔

''چاند اب دیر سے نکلتا ہے، جب میں سو جاتا ہوں۔ راتیں بہت اندھیری ہو گئی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''پھر تو تم ضرور جلدی سو جاتے ہو گے؟ جہاں تک میری بات ہے اگر بادل چاند کو

ڈھانپ نہ لیں تو میں اسے طلوع ہوتے ضرور دیکھتی ہوں......"

"کیسا ہو اگر جب آپ رات کو اس طرح اکیلی بیٹھی ہوں تو کوئی آپ کو دیکھ رہا ہو؟" یوسف نے کہا۔ اس کی آواز میں، اس کے چہرے پر کوئی پُراسراری بات تھی۔

"اگر تم نہ دیکھو، یوسف، تو مجھے اور کون دیکھے گا؟" میں نے کہا۔

میں نے ضرور الزام دہی پر زور دیا ہوگا کیوں کہ قادر اپنے بیٹے پر غصہ ہوا اور اسے ہلکے سے دھکا دیا۔

"اس کا دماغ ہمیشہ انہی چیزوں میں لگا رہتا ہے، ہمیشہ غلط۔ آپ کیا کہہ سکتے ہیں، یہ ہمارے ساتھ ایک مرتبہ جیل جا چکا ہے اور پھر یہ وہاں کے لوگوں کی باتیں سن کر ایسا ہو گیا......"

میں کچن میں چائے لینے چلی گئی۔ یوسف پیچھے سے پکار کر بولا، "آسمان پر آج رات بہت بادل ہیں۔ چاند اگر نکلا بھی تو آپ دیکھ نہیں پائیں گی......"

درحقیقت، آسمان پر ایک بھی ستارہ نہیں تھا۔

آسمان کئی روز سے ستاروں سے بھرا ہوا رہتا تھا، کائنات کی چھت شام کو ہی ستاروں سے سج جاتی تھی جب آسمان، پہاڑوں پر موجود جنگلات کے اوپر سیسے کا رنگ اختیار کرنے لگتا تھا۔ شام کو چلنے والی تیز ہوا نے بادلوں کے گہرے پردے کو بکھیر دیا تھا۔ ہم نے پہلی مرتبہ Hyades ستاروں کو دیکھا تھا۔ وہ بے حد روشن تھے۔

"خیر، موسم گرما تقریباً ختم ہونے کو ہے۔ آج یا کل سے بارشیں شروع ہو جائیں گی۔" قادر نے کہا۔

کچھ دیر سب خاموش رہے۔ ہم نے اپنی اپنی چائے پی۔

کچھ دیر کے بعد یوسف پیسٹری کا بڑا سا ٹکڑا اپنے دانتوں سے توڑتے ہوئے بغیر کسی وجہ کے بولا، "میرے قادر بابا اس آدمی کو ڈھونڈ لیں گے، آپ جانتی ہیں۔"

قادر اپنے بیٹے کو تھپڑ لگانے کے لیے سیدھا ہوا، پھر پُرسکون ہوتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ گرا لیا۔

میں نے پوچھا، "کون سا آدمی؟"

لڑکا ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اس نے اپنے کندھے اچکا دیئے۔

''کون سا آدمی، قادر آغا؟''

اب میں آگاہ ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ قادر یوں ہلا جلا جیسے اس کے معدے میں کوئی اندرونی درد چکرا رہا تھا۔ ''کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں...... میں نے آپ کو بتایا ناں، اس والے کا دماغ اتنا...... جب اس کا دماغ کسی چیز پر اڑ جاتا ہے تو یہ ایک ہی بات بار بار کہے جاتا ہے۔ دراصل میں جانتا ہوں کہ یہاں کوئی یا کوئی چیز، کچھ عرصے سے رات کو گھومتا رہتا ہے۔ چاہے وہ کوئی آوارہ جانور ہے یا کوئی جو جائے تعمیر کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے یا مسئلہ کھڑا کرنے والی میری دوسری عورت یا اس کے بھائی، میں معلوم نہیں کر سکا......''

اور پھر وہ فریبی انداز میں ہنسنے لگا۔ ''میں وہاں نیچے جاتا ہوں، کتا یہاں بھونکنے لگتا ہے۔ میں یہاں آتا ہوں، وہ وہاں بھونکنے لگتا ہے۔ بھوت، میں کہتا ہوں، یہ پرندہ کیسا پرندہ ہے؟ شاید ایک سے زیادہ لوگ ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔ خیر، میرا یہ خیال ہے۔ کوئی کھیل جاری ہے۔ انہیں کرنے دو نگرانی...... یوں جیسے وہ اندر گھس آئیں گے اور مجھے اور خدیجہ کو ایک ساتھ پکڑ لیں گے! اگر وہ ہمیں گرفتار نہیں کر سکتے، تو ان کے پاس کچھ نہیں ہے......''

قادر اس بارے میں بالکل مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بھی یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس کھیل میں پھنس گیا تھا۔ جب وہ حسن اور فواد سے بات کر رہا تھا، تب بھی وہ ایسا تھا۔ وہ اچانک مکمل مضحکہ خیز ہو جاتا۔ وہ انہیں ہنسائے جاتا۔ فواد نے ایک بار پوچھا تھا، ''کیا ہو اگر تم گرفتار ہو جاؤ، قادر آغا؟''

اس پر قابو پاتے یا اسے بحال کرتے ہوئے جو اس کا خیال تھا کہ اس سے لیا جا چکا تھا یا کم سے کم اس کا عادی ہوتے ہوئے یا شرمندہ یا مایوسی پرست یا خود کو مرد محسوس کرنے کی مزید ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے، اور اس کے ساتھ اپنی نئی زندہ دلی، زندہ دلی جسے ہمیشہ نئے لطیفوں سے سجایا جاتا، حسن نے کہا تھا، ''صحیح اور تم نے دیکھا، نیا بچہ آنے والا ہے۔''

''چاہے سوئی کے ناکے سے ہی میں اپنا راستہ تلاش کر لوں گا، کوئی بھی اتنا عقل مند نہ ہوگا!'' یہ ہمیشہ قادر کا جواب ہوتا۔ یہ اس کا سب سے مشہور جملہ تھا۔

محمت جس کا چہرہ بچگانہ تھا، جو کبھی بڑا نہیں ہوا، اس کی رنگت گلابی سے سرخ ہو جاتی۔ جب کہ وہ ہر کھلی اور عیاں صاف گو بات یا چیز کی تحسین کرتا، اس قسم کی براہِ راست بات اسے ہکا بکا کر دیتی۔ جہاں تک دوآن کی بات تھی، وہ قادر کے اس بارے میں اطمینان سے مرعوب تھا۔

''یہ شخص صرف اس وقت جھوٹ بولتا ہے جب اسے اپنے دشمن کا سامنا ہوتا ہے۔ یعنی جج کے سامنے۔'' دوآن نے کہا تھا۔

میرچ، خدیجہ کا احترام کرتی تھی، مجھے کہنا چاہیے...... ایک رات جب ہم دونوں ایک بڑے سے برتن میں سرکے اور پانی میں وہ کیکڑے ابال رہی تھیں جو ہم نے چٹانوں کے قریب سے پکڑے تھے، وہ بولی، ''آپ کو حیرت ہوگی نویم، لیکن مجھے اب کراہت نہیں ہوتی۔ نہ زندہ کیکڑوں کو ابالتے ہوئے، نہ خدیجہ کے قادر سے تعلق پر۔ اس کے برعکس مجھے خدیجہ پر رشک آتا ہے۔''

ہم سب نے چائے کا ایک ایک کپ اور لیا۔ پھر قادر نے یوسف کو پیسٹریوں کی اس پلیٹ کے ساتھ، جو میں نے اسے دی تھیں، گھر بھیج دیا۔ اور اس نے رائفل دوبارہ اپنے کندھے پر لٹکا لی۔ نیچے جائے تعمیر کی طرف جانے سے پہلے وہ لمحے بھر کو رکا اور بولا، ''جب آپ بستر پر جاتی ہیں تو لیمپ باتھ روم کی کھڑکی میں کیوں نہیں رکھ دیتیں؟ بتی بالکل نیچی کر کے اسے وہاں رکھ دیا کریں۔ کم سے کم کچھ روشنی تو رہے گی۔ آج رات چاند کے ان بادلوں میں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔''

کچھ دیر بعد جب میں آتش دان میں لکڑیاں جلانے کی کوشش کر رہی تھی اور درد محسوس کر رہی تھی، میں نے اس بارے میں سوچا۔ کارواں یا کارواں سرائے کے بارے میں نہیں بلکہ اس بارے میں کہ قادر کیوں چاہتا تھا کہ میں پچھلی کھڑکی میں لیمپ رکھوں اور بتی نیچی کر دوں......

نارنجی روشنیوں نے سفید دیواروں پر سایوں کو بڑا بنا دیا۔ رات گئے، میں رکی اور لہروں کی آوازیں سنیں۔ میں نے مغربی کھڑکیوں پر بجتی صنوبر کی شاخوں کو بھی دوبارہ سنا۔ مجھے اطمینان محسوس ہوا کہ ہوا چلنے لگی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ قادر غلط کہتا تھا۔ شاید ہوا آج رات بادلوں کو منتشر کر دے گی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، شاید سورج نکلنے سے پہلے مجھے ایک مرتبہ پھر تھکے ہارے چاند کا چہرہ دکھائی دے جائے۔ آتش دان میں لکڑیوں کی چرچراہٹ، دل کی دھڑکن کی طرح، مجھے میرے پُرحدت دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ ہماری ہنسی، کراہیں، سرگوشیاں بن جاتی ہے۔ وہ آوازیں، ہماری

نظمیں اور گیت ایک کے بعد ایک کر کے میری کانوں میں ڈھیر لگا دیتی ہیں۔ ایک کے بعد ایک، سرے سے سرا، ابد تک: ''میں غیر معمولی آوازیں سنتا ہوں، حسن ابی!......'' Suzinak گیت کے ساتھ مدغم ہوتی شہنائی کی آواز۔ دوبارہ سرگوشیاں:

''اور ہم ہیں

موت کی ایک پکار

تباہی کی ترغیب

اس لمحے جب سینہ بہ سینہ ہوتے ہیں

سمندر اور پہاڑ......''

عین اسی لمحے مجھے اپنے قریب کچھ گرنے کی دھمک سنائی دی۔ میرے بالکل قریب۔ میں گھبرا کر اچھل پڑی۔ میرا دل میرے حلق میں آ گیا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ آواز کہاں سے آئی تھی، کیا تھی، وہ شور ان تمام آوازوں یا سرگوشیوں جیسا نہیں تھا جن سے میں واقف تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس نے تمام دوسری آوازوں کو جیسے کسی کلہاڑی سے کاٹ دیا تھا اور تباہ کر دیا تھا اور چوں کہ مجھے اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی، میری تشویش بڑھ گئی۔

یہ ابھی ہوا تھا، کچھ دیر پہلے۔ مجھے قادر کی وارننگ یاد آئی۔ یہ جانے بغیر کہ میں کس سے خوف زدہ تھی، کیا ہو رہا تھا، میں نے لیمپ جلایا اور اسے باتھ روم کی کھڑکی میں رکھ دیا۔ سائے لمبے ہو گئے اور کچھ دیر بعد آتش دان کی لکڑیاں راکھ ہو کر بجھ گئیں۔

یہ ابھی ابھی ہوا تھا، کچھ دیر پہلے۔ چوں کہ میرے پیارے، میرے زمینی دیوتا جا چکے تھے، پہلی مرتبہ، اب، خواب جیسے دنوں کی سطح، جو میں نے ان کے ساتھ جیے تھے، اب چند منٹوں سے جیسے ستاروں اور چاند کو ڈھانپے ہوئے بادلوں کی طرح کسی موٹے گہرے کپڑے میں ڈھکی ہوئی تھی۔ یوں تھا جیسے میں ان کے ساتھ کبھی بھی وہاں موجود نہ رہی تھی۔ ہم کبھی بھی بحیرۂ روم سے واقف نہ تھے۔ ہم کبھی بھی اس پر کامیابی کے قابل نہ ہوئے تھے۔

میں نے جلدی سے کمرے پر نگاہ دوڑائی، تبھی میں نے دیکھا۔ میرا دل مسکرا اٹھا، میں خوش ہو گئی۔ ان کے آنے سے پہلے میں نے بک شیلف پر رکھے مٹی کے شمع دان میں پر پل، میرون،

سبز، پیلی اور نیلی شمعیں سجائی تھیں۔ لمبی، روشن شمعیں۔ میں انہیں ہر وقت روشن رکھنا چاہتی تھی۔ دوآن نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا تھا: ''انہیں اپنے رخصت ہونے سے پہلے آخری رات کو جلانا۔ انہیں پورا جلا لینا نویم۔ لیکن ابھی انہیں رہنے دو۔ شمع دان اور شمعیں ایک دوسرے سے اس قدر منفرد طور پر ہم آہنگ ہیں......''

میں دوآن کی درخواست پوری کروں گی۔

کل میری یہاں آخری رات ہے۔ تب میں شمعیں جلاؤں گی۔ انہی موم بتیوں میں سے ایک دھم سے میرے قریب گری تھی۔ یہ آتش دان کی آگ سے گرم کمرے میں نرم ہوگئی ہوگی۔ میں نے موم بتی دوبارہ شمع دان میں لگا دی۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کل جب تمام موم بتیاں جل کر پگھل جائیں گی تو شمع دان کا رنگ کیا ہوگا۔ مجھے امید تھی کہ انار کے مختلف رنگوں جیسا۔

موم بتی کے گرنے کی آواز سے میرے اندر جس خوف نے سر اٹھایا تھا وہ واضح طور پر قادر اور یوسف کی اس شام کہی بات کا نتیجہ تھا، پھر بھی میں نے سوچا کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

کیا میں شہر واپس جانا چاہتی ہوں؟ مجھے جانا ہوگا، یہ اس کا انجام ہے۔ اس لمحے میں اس قدر تھکن زدہ ہوں۔ بالکل اچانک۔ کئی روز سے میں دیر سے سو رہی ہوں۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ کیوں وہ غیر معمولی آوازیں، رنگ، غیر معمولی حساسیت، آج رات بار بار مجھ سے دُور سے دُور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ سب کچھ کسی چرمی کاغذ کی طرح ہے، وہ سب کچھ مٹاتے ہوئے جو ہم لکھ چکے ہیں، لکیریں جو ہم نے ساحل پر کھینچی تھیں، جب لہریں آگے بڑھیں۔

✡

میں نیند سے بار بار جاگتی رہی۔ مجھے مسلسل محسوس ہوتا رہا جیسے میرے اندر کوئی مبہم سی چیز مجھے ٹھوکا دے کر جگاتی رہی۔ جب میں گھر کھولا تھا، فرش پر بکھریں عریاں عورتوں کی تصویریں، میرے داغ دار زیریں لباس، وہ بار بار اس سے زیادہ واضح ہو کر جیسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، میرے سامنے آتے رہے۔ وہ سب کچھ جسے میں نے ہماری مختصر چھٹیوں میں دماغ سے نکال دیا تھا، پوری قوت سے واپس آ گیا۔

میں کافی دیر سے جاگی۔ ساری رات دُور بجلی چمکتی رہی تھی۔

مجھے بادلوں جیسی گرج بھی سنائی دی لیکن میں یہ بتا نہیں سکتی تھی کہ وہ ابھرتی ہوئی سمندری لہروں کی آواز تھی یا بادلوں کی وہ گرج جو بارش سے پہلے سنائی دیتی تھی۔ میں آدھی سوئی، آدھی جاگی ہوئی تھی۔ باتھ روم کے دروازے کے نیچے سے چھن کر آتی روشنی مجھے بار بار بتا رہی تھی کہ صبح ہو چکی تھی، دن نکل آیا تھا۔ پھر بھی میں آگاہ تھی کہ ابھی صبح بہت دُور تھی۔ یوں تھا جیسے رات کبھی ختم نہ ہوتی۔

اب میرا دل گم صم ہے۔ یہ مجھے بتاتا ہے کہ میں نے اس خوشی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا جو پچھلے چند روز سے میری تنہائی کو حصار میں لیے ہوئے تھی، جیسے بہت پرانی وائن آہستہ آہستہ اپنا اثر اور ذائقہ دکھاتی ہے، اسی طرح میں اب اپنے دل میں بہار کے انجام کے نشانات محسوس کرتی ہوں، اس کا زمانہ گزرنے کے خوش گوار احساس کے ساتھ۔

جب میں اس صبح جاگی تو وہ دوپہر کے قریب وقت تھا۔ میں نے جلدی سے لباس بدلا۔ سمندر بالکل خاموش اور پُرسکون تھا۔ یہ وہ سمندر نہ تھا جس کی رات کی جھاگ اڑاتی لہریں ساحل پر چٹانوں سے ٹکراتی رہی تھیں۔ وہ مکمل طور پر پسپا ہو چکا تھا، تھکن زدہ اور زرد، وہ بوجھل آسمان تلے نیند میں غرق ہو چکا تھا۔ میں تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ میں باہر ٹیرس پر چلی گئی۔ ساحل پر قدموں کا ایک نقش، کوئی نشان بھی باقی نہ ہو سکتا تھا۔ دُور سے ساحل گہرے رنگ کا دکھائی دیتا تھا۔

شمالی پہاڑوں کی طرف سے مٹی کی خوش گوار مہک آئی۔ پہاڑوں کے کنارے پر بارش برس رہی تھی۔ روز میری کی خوشبودار جھاڑیوں اور بچھالی کی مہک اپنی تیز باس کھو کر اب کمزور پڑ چکی تھی......

نزدیکی کھوہ سے آنے والا شور کل کی نسبت زیادہ تھا۔ میں اس شور سے بھی جاگ سکتی تھی۔ دو آدمی رستے کی دوسری جانب بجلی کا بڑا سا کھمبا نصب کر رہے تھے۔ وہ ضرور کہیں دُور سے اس تعمیراتی جگہ پر بجلی کا تار لا رہے ہوں گے۔ تعمیر میں تیزی آ چکی تھی۔ اوزاروں کی آوازیں، کنکریٹ ڈالا جا رہا تھا، مٹی کی کھدائی ہو رہی تھی......

میں آخری مرتبہ نیچے ساحل پر جانا چاہتی تھی۔ بہت سردی تھی۔ میں اب تیراکی کر کے وہاں جانے کے قابل نہ ہو پاتی۔ میں ساتھ والے گھر کے سامنے سے آگے بڑھی۔ میں ان تینوں

بچوں کے پاس سے گزری۔ یوسف، عثمان کو اپنی کمر پر اٹھائے ہوئے، شدمان کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ خدیجہ گاؤں جا چکی تھی۔ ہمیشہ سب کچھ بیان کرنے کو بے تاب یوسف اس وقت خاموش تھا۔

میں تعمیراتی جگہ سے، لکڑیوں، سٹیل کے بیم، سیمنٹ کے ڈھیروں میں سے گزری۔ دو مزدور بارش سے بچنے کی تیاری میں سیمنٹ کے کھلے ہوئے تھیلوں کو پلاسٹک کی موٹی شیٹ سے ڈھانپ رہے تھے۔ ایک بڑی مشین، اس کا اوپر کو اٹھا ہوا منہ، میری جانب آئی۔ مزدور عمارتوں میں بکھر چکے تھے۔ وہ پہلے کبھی اتنے زیادہ نہیں تھے۔ یا یوں تھا کہ ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ وہاں مزدوروں کا اتنا ہجوم تھا، جب تک کہ تعمیراتی کام ہمارے بالکل نزدیک نہ آ گیا، جب جھونپڑی کے پیچھے سٹیل کے بیم کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ ہوٹل کا مالک اوز بے بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے قادر کے بہت سے احکامات دیئے تھے، پھر وہ ٹیرس پر آیا اور ہم سے بات کی تھی۔ تفصیل سے اپنے منصوبوں کے بارے میں باتیں۔ پھر اس نے پوچھا تھا کہ آیا ہم یہ گھر اور زمین اس کے ہاتھ بیچ دیتے، چاہے ہم اسے زیرِ غور لائے تھے یا نہیں۔ اس نے براہِ راست حسن سے پوچھا تھا۔

ہم سب نے اپنی سانسیں روک لیں۔ حقیقت میں ہم جانتے تھے۔ حسن اور وہ، دونوں جانتے تھے۔ یہ جگہ صرف گھر یا زمین کا ایک ٹکڑا نہ تھی۔ یہ ایسی چیز تھی جس نے ہمیں بہت کرب دیا تھا اور پھر بعد میں بہت تھوڑے سے عرصے کے لیے ہمیں بے حد خوش بھی کیا تھا۔ یہ ایک پھول تھی، ایک پتا، ایک گیت، ایک فرد، ایک وقت، ایک عہد...... ایک زمانہ......

حسن ہمیں دیکھ رہا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ انتظار میں تھا کہ ہم میں سے کوئی جواب دیتا۔

''ہم اس بارے میں سوچ بھی نہیں رہے ہیں۔ اس جگہ سے ہمارا جذباتی تعلق ہے......''

ہم نے اوز بے کو اس طرح جواب دیا۔ اس شخص کی نگاہیں گھر اور نظرانداز شدہ باغ پر گڑی رہی تھیں، اس کے جرینیم، یاسمین، عطر، گڑھل کے پودے جن کی دیکھ بھال بہار کے اختتام پر صرف مختصر چھٹیوں میں کی جاتی تھی۔ ''ایسا کیا ہے جسے آپ جذباتی تعلق کہتے ہیں جناب؟ ہم کل جہاں کہیں ہوں گے، وہیں ہمارے جذبات ہوں گے۔ کیا ایسا ہی نہیں ہے؟''

فواد نے اپنے لٹکے ہوئے چہرے کے ساتھ راکی کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔ میرچ

نے، جس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے، اسے کچھ Meatballs پیش کیے جو اس نے حسن کے ساتھ مل کر بنائے تھے۔ دو آن، صرف اس سے عداوت میں، ٹیپ پر ہمارے گیت سنتا رہا، اس حقیقت کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہ ہمارے جذباتی روابط یہیں تھے۔ میں حتیٰ کہ اب بھی محمت کی نرم، دوستانہ سی آواز کو جھگڑالو، چڑچڑی آواز میں بدلتے ہوئے سنتی ہوں: ''لیکن ہم جہاں کہیں جائیں، ہم یہیں رہیں گے! ہم ہمیشہ یہاں ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے!''

شاید اس نے یہ مختلف طور پر زیادہ خوب صورتی سے کہا تھا، ''ہم یہیں ہیں، چاہے ہم جہاں کہیں جائیں۔''

یا!

''ہم کل جہاں ہوں گے، وہ جگہ بھی یہیں ہوگی۔''

یا شاید!

''ہم ہمیشہ یہاں رہیں گے، ہم ہمیشہ یہیں رہیں گے، آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے!''

پیارے محمت! آپ یہ سوچیں گے کہ جس سیڑھی سے وہ نیچے صحرا میں اترا تھا، اسی سے وہ جس قدر جلد ممکن ہوتا وہیں واپس چڑھ رہا تھا جہاں سے آیا تھا، آسمان کی جانب۔ اپنے منہ کے ایک گوشے میں صحرائی پھول لیے، وہ واپس جا رہا تھا۔ وہ صحرا میں کچھ غیر معمولی چیزیں دیکھ اور بہت سی غیر معمولی دھنیں سن چکا تھا۔ اس نے دن کو، حال کو، کسی غیر حقیقی شے میں بدل دیا تھا، کل میں، مستقبل میں، کسی بڑے پھول میں۔ اس نے ہوٹل کے مالک سے کہا:

''میں نے یہاں نیچے سے وہاں اوپر تک جو کچھ دیکھا، اسے بیان کروں گا۔ اور پھر جو کچھ میں معلوم کروں گا، اسے آپ کو بیان کروں گا۔''

یقیناً اوز بے کے لیے یہ دیکھنا کہ وہ سیڑھی چڑھ رہا تھا اور وہ سننا ناممکن تھا، جو وہ اوپر چڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اوز بے، جس نے اپنا کان کائنات کے دل سے نہیں لگا رکھا تھا، وہ اپنے معمول کے روزمرہ حقائق میں پھنسا ہوا، خود اعتمادی کے ساتھ مسکرایا۔ ''آپ جو کہیں میں آپ کو پیشکش کر سکتا ہوں۔ جب آپ چاہیں......''

ہم چھے کے چھے ایک ساتھ بولے، ''ہم ایسا نہیں چاہتے۔''

اس نے ضرور یہ سنا ہوگا۔ ہم پُریقین تھے۔ مجھے یقین ہے...... لیکن پھر بھی وہ کل اسی پیشکش کے ساتھ آیا......

جب وہ بڑی مشین کان پھاڑنے والے شور کے ساتھ زمین کھود رہی تھی، مجھے ذرا برابر خوف بھی محسوس نہ ہوا۔ اوز بے اپنے تنکوں کے ہیٹ کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو اسے اتار دیا۔ اس نے یہ میرے خیر مقدم اور مجھے انتباہ کے لیے کیا تھا، ''پیچھے ہٹ جاؤ!''

کتا اس رات بہت بھونکا اور قادر بار بار اور بڑے جوش سے سیٹی بجاتا رہا۔ اس وقت وہ رات کا چوکیدار نہیں رہا تھا بلکہ وہ مزدور تھا، ورکر یا اس کی بجائے قادر فورمین۔

اوز بے نے کہا، ''میں نے ڈسکو کے لیے بنیاد کھدوالی ہے۔ ہمیں جھونپڑا بھی گرانا ہوگا......''

میں اسے بہ مشکل ہی سن پائی۔

''ہمیں بارش شروع ہونے سے پہلے کنکریٹ ڈال دینا چاہیے۔''

قادر نے آسمان کی جانب دیکھا۔ ''یہ جلد ہی ہونے لگیں گی، لیکن قسمت......''

میں نے انہیں بتایا کہ میں ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ اوز بے نے کہا کہ اگلے موسم گرما میں ساحل پر بہت رش ہوگا، یہ کہ وہاں ہر طرف پارٹیاں ہو رہی ہوں گی۔

میں انسانوں اور جانوروں کے سوکھے ہوئے فضلے کے پاس سے گزری، میں ساحل پر پہنچ گئی۔

غیر واضح طور پر، لیکن ہم اب بھی وہیں تھے، آپ نے دیکھا۔ لہریں ہمارے نشانات مکمل طور پر مٹانے میں ناکام رہی تھیں لیکن انہوں نے فواد کی ڈینٹسٹ چیئر کا ایک کنارا اور میرچ کے بڑے سے سوالیہ نشان کا نچلا حصہ مٹا دیا تھا۔ محمت کا لامتناہی کا نشان وہیں موجود تھا۔ حسن کے لکھے گئے "We are ourselves" میں سے صرف "elves" باقی بچا تھا، صرف چند حروف...... اگرچہ لہروں نے ہمارا کوئی نشان نہ چھوڑا تھا، ہم وہیں ہوں گے۔ ہم کبھی جیے تھے۔ ہم نے زندگی گزاری تھی۔ ہم قدیم شہر کے کھنڈرات جتنے حقیقی تھے۔

میں اس مقام پر پہنچی جہاں ساحل جنگل سے جا ملتا تھا۔ لہروں نے دُور فاصلوں سے

دھنیں لاتے ہوئے میرے ننگے پیروں کو چوما:

"Now you're now far away

The heart is full of sorrow...."

میں گونے کے ساتھ ہوں۔

ہم یہ گیت گونے کو سنایا کرتے تھے اور وہ ہمیں سناتا تھا۔ جب ہم گاتے تو ہم افسردہ ہو جایا کرتے۔ جب میں اسے سنتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں اس کی آواز کا لب ولہجہ سن رہی ہوتی، جو غیر سنجیدہ، کسی قدر مسخرے باز، اکثر کسی نہ ختم ہونے والی کتاب کے آخری صفحے کے آخری جملے پر "phew" کہنے والا ہوتا۔ گیت نے اس کی معمول کی ذات سے بالکل مختلف جہتیں اختیار کیں۔ ہم ان نئی جہتوں کو جان لیتے۔ لیکن ہم واضح طور پر یہ جاننے کے قابل نہ ہوتے کہ وہ کیا تھیں...... اسی وجہ سے یہ اکثر دہرائے جاتے ہیں...... گیت کی شدت ہمیں گھیرے میں لے لیتی۔ تلخ پودینے کا ہلکا سا ذائقہ۔ کینر کی ہلکی سی مہک۔ اکٹھے ہوتے ہوئے، جدا ہونے کے لیے۔ جدا ہوتے ہوئے، ملنے کے لیے۔ جس لمحے تم ملتے ہو، تمنا، چاہت۔ بالکل تبھی گونے کی نوعمر اور حقیقی موسیقی، وہ پُرشور دھنیں اچانک پھوٹ پڑتیں۔ ہم ان کا پیچھا کرتے۔ ایک کے بعد ایک، ہم دوسرے گیتوں کی طرف جاتے، لوک گیت، ہمارے سکول کے ترانے، دوسرے سکولوں کے ترانے، ہم جو سیٹیاں بجاتے ان کی بڑی سمفنی، ایک جملے کی بلند پکاریں یا بعض اوقات ایک ٹکڑا اچانک سامنے آتے اور ان سمفنیوں کی ہلکی تال میں جگہ بناتے ہوئے، چیخوں یا پکاروں کو جلدی سے ڈھانپتی ہوئی لوریاں، انہیں سہلاتے ہوئے۔ ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ ہماری ہنسی ہماری نرم آوازوں کو دبا دیتی۔ وہاں نیچے موجود کھاڑی ہماری آوازوں کی گواہ ہے، ہماری گہری خاموشی کی گواہ، ہماری پکار کے بعد ہماری لمحاتی خاموشی کی اور ہمارے اپنے توقف کی۔ سمندر ہمارا گواہ ہے۔

میں واپس چلنے لگی۔ ساحل بالکل ہموار تھا۔ وہ جگہیں جہاں سے میں کچھ دیر پہلے گزری تھی، وہاں صرف میرے نقوشِ قدم تھے۔

راستے پر، بہار کے انجام نے دھوپ کی ان زرد کرنوں کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا جو لمحے بھر کو بادلوں کو چیر کر نکلی تھیں۔

اس کے بعد کرنیں اسی طرح جاں کنی کے عالم میں ختم ہو جاتیں۔ یہاں نہ ختم ہونے والی بارشیں ہوں گی۔ پھر سورج، سمندر کے اوپر تمام دن ٹمٹماتے ہوئے انتہائی غیر متوقع وقت پر فاتح ہو گا۔ پھر شٹرز، کنکریٹ، لکڑی کے جنگلے، پام کے درخت، Devil's Tongues، قدیم شہر کے سنگ مرمر، پہاڑیوں کی ڈھلانیں، کیلے کے درختوں کے چوڑے موٹے پتے اور ہماری زندگیاں، شدید بارشوں کی زد میں آجائیں گی۔ لیکن پھر بھی میرا نہیں خیال یہ یوسف کے دماغ سے بڑے سے بغیر ٹوٹے یا چٹخے ہوئے انار کی تصویر مٹا سکتا ہے، جو ہماری نگرانی کرتا ہے، میری نگرانی کرتا ہے۔ تمنا...... کسی بے نقص اور مکمل سنگ مرمر کی یادگار کی طرح دریافت ہوئی اور محتاط ہاتھوں اور مہربان دلوں کے ساتھ کھنڈرات میں سے لائی گئی...... ان ساحلوں پر نصب کی گئی ہے۔ ان ساحلوں پر نقرئی پروں والے سینکڑوں پرندے نیلے پانیوں پر پَر پھڑ پھڑاتے ہیں جو سارا دن رنگ تبدیل کرتے ہیں۔ سورج طلوع ہو چکا ہے۔ ہماری آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ ہم مسحور ہو گئے ہیں۔ دھوپ کی کرنیں منتشر ہو رہی ہیں۔ پانی کی چادر کی رنگ برنگی ساٹن یا اطلس، پرندوں کے اڑتے ہوئے پَر، انہیں اپنی تاریک اور نرم بانہوں میں جھلاتے ہیں اور انہیں سلا دیتے ہیں۔ طلوعِ آفتاب کے وقت وہ پر آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہیں، ان کی پھڑ پھڑاہٹ رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ وہ ان پر نرم، ٹوٹے ہوئے شیشے سی نیلی اطلس پھینک دیتے ہیں اور بحیرۂ روم کے دروازے Hyades گرلز تک کھول دیتے ہیں۔ سب کچھ دھل چکا ہے۔ جو پیچھے رہ گیا ہے، یوسف کی آنکھوں میں جو راتوں کو ٹائپ رائٹر کی آواز سنتا رہا ہے، وہ چھے Hyades گرلز کی بنائی جانے والی مکمل انار کی تصویر ہے۔

کچھ دیر پہلے جب میں نے اپنے لیے ڈرنک تیار کی، میں نے خیال کیا کہ سیسے کے رنگ کے پہاڑیوں کے قریب سے کوئی گزر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ شخص کچن کی کھڑکی کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں میں کھڑی تھی۔ میری آنکھوں نے اس تیز روشنی میں ضرور کوئی فریب خیال تخلیق کیا ہوگا۔ اوپر گہرے بادل ساحل کے اوپر موج در موج جمع ہو رہے تھے۔ میں نے ایک دوسرے کو پکارتے تیزی سے کام کرتے مزدوروں کو سنا، مشینوں کا شور ہمیشہ سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ آوازیں بادلوں سے اسی قدر دُور تھیں، جتنی میرے قریب تھیں۔ عثان اور شدمان کا رونا اور چیخیں خواب میں سنی گئی آوازوں جیسی تھیں۔ شاید یوسف کو ان کی دیکھ بھال میں بہت مشکل ہو رہی تھی۔

میں باہر باغ میں اور ٹوٹی ہوئی باڑھ کے قریب چلی گئی۔ میں نے یوسف کو پکارا۔ عثمان کو اپنی بازوؤں میں اٹھائے قادر باہر آیا۔ یوسف پرانا مگر صاف ستھرا ٹراؤزر پہنے ہوئے تھا۔ وہ دھوپ میں رنگ اڑی گلابی قمیص کے بٹن بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہم اوپر گاؤں میں اپنی نانی کے گھر جا رہے ہیں۔'' وہ بولا۔

میں بتا نہیں سکتی کہ وہ خوش تھا یا اداس۔ اس کی بجائے، ایسے بچے کی طرح جس کا دماغ پیچھے رہ جانے والی کسی چیز میں اٹکا ہوا تھا، کوئی کھیل، کوئی کھلونا، کوئی ایسی تقریب جس کا اختتام اسے دیکھنا چاہیے۔

قادر، عثمان کا گندا پاجامہ بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ہمیں جانا ہے۔''

اس نے کہا، ''میں آپ کو بتانے کے لیے آنے والا تھا۔ میں پہلے نہیں آسکا کیوں کہ مجھے اوزبے کو بھی خدا حافظ کہنا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ میری دوسری بیوی مجھے آج رات گرفتار کروانے والی ہے۔ میں نے آپ کو نہیں بتایا؟ میں کئی راتوں سے یہ محسوس کر رہا تھا۔ یہ یقینی تھا۔ مجھے اس کا شبہ سا رہا ہے۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں انہیں ان کی نانی کے پاس چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہو بھی تو مجھے دوبارہ بچوں کے ساتھ جیل نہ جانا پڑے......اور یہ گھریوں بھی گرایا ہی جانے والا ہے۔ گاؤں دُور پہاڑ پر ہے۔ میں آدھی رات سے پہلے واپس لوٹ آؤں گا......''

میں بچوں کو تیار کرنے میں قادر کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے ایسا کرنے نہ دیا۔ ان کا سامان ہمیشہ بندھا ہوا اور تیار ہوتا ہے۔ ''آپ جانتی ہیں، میں نے خدیجہ کو آج ہینڈ رڈ گرینڈ مین کی بیوی کے پاس بھیجا تھا۔ میں اسے لے کر چلا جاؤں گا۔ میں بچے اس کے خاندان کے سپرد کروں گا اور واپس آجاؤں گا۔ اب دیکھتے ہیں اگر وہ ہمیں تلاش اور گرفتار کر پاتے ہیں۔ کاش میں صحیح وقت پر واپس آجاؤں اور دیکھوں کہ انہیں کچھ نہیں ملا اور ان کی ہنسی اڑاؤں......''

تین بچوں اور بیوی کے ساتھ اتنا سفر کرنا اور واپس آنا۔ کئی دنوں کی تھکن، راتوں کی بےخوابی......ان میں سے کچھ بھی اسے پریشان نہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی مونچھوں تلے یوں مسکراتا رہا جیسے پولیس کا خالی ہاتھ واپس جانا، وہیں اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ عثمان مسلسل روتا رہا۔ شدمان

اپنے باپ کے گھٹنوں پر چڑھنا چاہتی تھی۔ قادر نے بچے کے رونے پر توجہ کی نہ بچی کی کوششوں پر۔ یوسف پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی کسی بھی چیز کی مدد میں ناکامی کی قادر کو پرواہ نہ تھی۔ یہ سب فطری تھا۔ میں حیرت زدہ تھی۔ کیا جب ہم سب ساتھ تھے، ہم چھے، تو بچے روئے یا چیخے نہیں تھے؟ مجھے یاد نہیں۔ صرف دُور سے ان کے باپ کی ڈانٹ پھٹکار سنائی دیا کرتی، ''ہمسایوں کو تنگ مت کرو! مجھے مجبور مت کرو کہ میں آکر تم سے نمٹوں۔''

یہاں تھا وہ، ان کے ساتھ، شور سے میرا سر گھوم رہا تھا، رونے کی آوازوں پر میرا دل پگھل رہا تھا۔ قادر پُرسکون تھا، یوں جیسے اس کے ہر حکم کی پیروی کی جارہی تھی۔

اس نے بچوں کو لیا اور چلا گیا۔ شام کو مشینوں کا شور رُک گیا۔ مزدوروں نے پہاڑی پر چڑھنا اترنا، سیمنٹ، سٹیل کے بیم، اینٹیں لے جانا بند کر دیا۔ وہ ٹرک میں سوار ہوئے اور چلے گئے۔ دو مزدوروں کو نیچے موجود عمارت میں سونا تھا۔ وہ قادر کی جگہ لیتے۔ قادر نے بتایا تھا...... وہ کون ہیں...... وہ مزدور؟ کاش میں ان سے مل چکی ہوتی!......

اب میں مکمل خاموشی میں گھری ہوئی ہوں۔ دوبارہ ہماری اپنی دنیا میں۔ اب یہاں صرف سمندر کی گنگناہٹ ہے اور صنوبر کے درختوں کی بارش کو دعوت دیتی سرسراہٹ۔ اس سے پہلے کہ مکمل تاریکی پھیلتی، میں نے ہر چیز کو گہرے سبز سے بھورے مائل سرمئی میں لپٹتے دیکھا۔ ساحل نے سبزی مائل رنگ اختیار کر لیا تھا۔

آج رات میں چاند کا جنم نہ دیکھ پاؤں گی...... اس کا زرد بوڑھا پرانا چہرہ...... حتیٰ کہ بادلوں کے بیچ سے بھی نہیں۔ اس کی کرنیں پانی پر روشن راستے نہیں بنائیں گی۔ کھاڑی بھی نہیں جھلملائے گی۔ جل پریاں اپنی دُمیں کہیں گہرائی میں چھوڑتے ہوئے اپنے عریاں وجود پانی کی سطح پر نہیں لائیں گی، ان کرنوں میں گرمائش حاصل کرنے کے لیے وہ چاندی کی کنگھیوں سے اپنے بال نہیں سنواریں گی۔ یہ سب ضرور سمندر کی تہ میں موجود غاروں میں لوٹ گیا ہوگا۔

ہم نے بھی خود کو انہیں کرنوں میں صاف کیا تھا، اپنی غاروں میں واپس جانے سے پہلے۔ زیادہ دیر نہیں گزری...... یہ تقریباً 120 گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ پورا چاند تھا۔ وہ آخری رات جو ہم نے اکٹھے گزاری، اس پر ضیافت کی۔ ہم نے بجری والی جگہ پر بڑی سی میز سجائی۔ ہم نے ملاحوں کی

لالٹینیں روشن کیں۔ ہم صنوبر کی شاخوں سے لٹکے۔ تندور میں انار کے پھولوں کے رنگ کے شعلے۔ اس سرخی مائل جزیرے سے باہر، جہاں ہم تھے، ہر جگہ موتی سی نیلاہٹ میں ڈھکی ہوئی تھی۔ ہماری گلاسوں میں موجود ٹھنڈی سفید وائن نے ماں کے دودھ سا رنگ اختیار کر لیا۔ ہماری عریاں بانہوں، ٹانگوں پر نمک جھلملایا۔

ایک مرتبہ پھر میں نے محمت کی آواز سنی: ''آپ اس قدر خالص پن سے نہ صرف ہمیں بلکہ ہر دوسری چیز سے کیسے محبت کر سکتے ہیں، حسن ابی؟''

تب حسن کا جواب مجھے سادہ اور قابل فہم لگا تھا۔ اب، کم سے کم ایک لمحے کو اس نے مجھے حیران کر دیا، ہلا دیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا اور میں تم لوگوں کو بالکل بھی نہیں جانتا۔''

بلاشبہ وائن کا ذائقہ بالکل تلخ ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں Gustav آیا۔

''لیکن تمہیں ہم سے عمداً محبت کرنی چاہیے۔'' فواد نے کہا۔

کیا وہ زود حس ہو رہا تھا۔ یوں تھا جیسے وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو اسے جانتے تھے ان کے لیے وہ جیسا تھا اس سے اسی طرح محبت کرنا ناممکن تھا۔ وہ اس میں مستقل مزاج تھا۔ اگر وہ اس میں ثابت قدم نہ ہوتا تو مجھے اس ضیافت میں سے صرف انار کے پھولوں کے رنگ کے شعلے، موتی سی نیلی روشنی، ہمارے گیت، ہماری ہنسی ہی یاد ہوتے، لیکن میرے اندر توپ کا ایک گولہ ہے، جس کی نازک طرف کو اگر میں نے چھوا تو وہ پھٹ جائے گا۔

فواد نے یہ کہہ کر اپنے گلاس میں موجود ساری وائن پی لی، ''ہم جو ہیں تمہیں اسے جانتے، پہچانتے اور قبول کرتے ہوئے ہم سے محبت رکھنی چاہیے۔''

اس نے گلاس دوبارہ بھرنے کے لیے محمت کو تھما دیا اور بولا، ''میں تمہارے جتنا عالم فاضل یا وسیع مطالعہ شخص نہیں ہوں۔ اگر میں کسی سے محبت کرتا ہوں، اگر میں انہیں اپنے قریب پاتا ہوں، یہ اتنی ہی محبت ہے جتنی میں جان سکتا ہوں، اتنی قربت جتنی میں جان سکتا ہوں۔ یہ تمہیں کیسے متاثر کرتا ہے؟''

اور پھر ایک ''Huh''۔

''Huh'' جیسے......

جیسے ہم پہلے ہی وہ سب کچھ جی چکے ہیں جو جیا جانا تھا۔

نہیں۔ بے آواز طور پر ہمارے درمیان جو آتا ہے، وہ زندگی نہیں ہے، وہ وقت ہے۔ دوسری صورت میں ہم بس بجری والی جگہ پر تھے۔ ہم چاندنی کی آبشار تلے تھے۔ جھونپڑی میں ہر کوئی سونے جا چکا تھا۔ چھپکلیاں، سمندری مکڑیاں سو چکی تھیں۔ پتنگے خود کو جلا کر بھسم کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ کندھے پر رائفل لٹکائے قادر کو بھی نیچے کہیں اونگھ آ چکی تھی۔ اس کی سیٹی خاموش تھی۔ صرف ہم باقی بچے تھے۔ نہ کہیں ممت کا حسن کو سوال تھا، نہ حسن کا جواب، نہ حتیٰ کہ فواد کا زود حس ہونا...... کسی وجہ سے میں نے اس لمحے اس کا ایسا ہونا تصور کیا تھا۔

میرچ نے کہا تھا، ''میں جانتی ہوں کہ تم خالص، مکمل محبت کی تلاش میں ہو دوآن۔ تم ہر کسی سے اس کی توقع رکھتے ہو۔ تم کسی سے یہی چاہتے ہو کہ وہ ایسی ہی محبت تمہیں پیش کرے۔ تم نہ صرف اس میں اتنی کوشش صرف کرتے ہو یا جس محبت کی تمہیں تلاش ہے اس کے نام پر کام کرتے ہو بلکہ یہ بھی کہ جب تم اسے تلاش کر لیتے ہو، تم اسے کسی کھلونے کی طرح ایک طرف ڈال دیتے ہو۔'' اس نے اسی انداز میں دوآن کو الزام دیا تھا۔ وہاں کچھ اور تبصرے، کچھ اور جذبات تھے...... ممت کو جس نے میرچ کی بات میں مداخلت پر فواد کو بدتمیزی سے گھرکا تھا، میں نے کہا، ''یقیناً کوئی بھی چیز جو خالص نہیں ہے تمہیں پریشان کرتی ہے۔ رشتے میں جو خالص یا پاک صاف نہ بنائے گئے، ایک ثقافت جو خالص نہیں بنائی گئی ہے...... اچھا ہے لیکن میرے پیارے ممت، تمہیں کون اس قدر خالص ہونے کی یقین دہانی کرواتا ہے؟''

کیا وہ میں نہیں تھی، جس نے کہا، ''کیوں کہ تم ہر چیز کو جانتے ہو، اس لیے تم اسے نظرانداز نہیں کر سکتے؟'' اور ایسا کہتے ہوئے، کیا یہ میں نہیں تھی جو ممت کی آنکھوں میں بارشی بادل لے آئی تھی، چاندنی میں مقید؟

کیا وہ حسن نہیں تھا، جو تب چلایا تھا، ''کیا تم ماضی کو بھول نہیں سکتے، وہ ماضی جس کے ہم ذمے دار نہیں ہیں؟''

خیر، میں جانتی ہوں کہ یہ اور ایسے ہی الزامات مجھے اب ایسے لگتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ جو چپکے سے ہمارے درمیان آ گیا وہ وقت تھا، وقت نے حالیہ ماضی کا چہرہ بدل دیا کیوں کہ اب

اور دوبارہ، یوسف، خدیجہ، عثمان اور شدمان اور قادر کے چہرے، مشینوں کا شور، ہتھوڑوں کی آوازیں، یوں جیسے دُور سے آتے ہوئے، اس دَور میں جگہ بنا چکی ہیں...... یہاں یہ ہے، چاہے یہ دس منٹ پہلے ہی تھا، اس کا مطلب ہے کہ میرے اندر صرف خوب صورت چیزیں ہی باقی نہیں بچی ہیں، حسن! یہ صرف کوئی گم شدہ جنت نہیں ہے جو میرے اندر رہ گئی ہے۔ لیکن ہماری آخری رات کے کھانے میں جہاں ہم تھے وہاں کوئی غم نہ تھے۔ وہاں کوئی کسی دوسرے کو احتساب کے لیے نہ بلا رہا تھا، کوئی الزامات نہیں اور سامنے آتے ہوئے کوئی زود حس رویے نہیں...... کیا وہاں تھے؟...... پورا چاند، ایک خوب صورت آگ، ہمارے گیت، ہمارے رقص...... ہاں، ہم نے رقص کیا۔ اور حتیٰ کہ فواد نے ہمیں بہت خوب صورت افریقی رقص دکھایا جو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ سیکھ چکا تھا۔ ہم سب نے باتیں کیں، ہنسے، اپنی تلخ وائن پی، اپنے اپنے گیت گائے، ہمارے رقص، اپنی آخری رات پر، باڑھ میں گھرے ہوئے۔ ہماری ضیافت بہار کے انجام کی تقریب بن گئی۔ جب پورا چاند کھاڑی کے پار گزرا اور مغرب کا رخ کیا، ہم ٹیرس پر رکھے بنچوں پر لیٹ گئے۔ ہم فرش پر، کنکریٹ پر لیٹ گئے۔ ہم دیر تک چپ رہے، ایک مرتبہ پھر ساحل سے آتی شہنائی کی وجد آفریں آواز کو سنا۔ وہ موسیقی کے قطعے کے بلند ترین سُر سے شروع ہوئی جو مہینوں سے ہمارے ساتھ گھسٹتا رہا تھا، برسوں سے، پھر سُر ایک دوسرے سے لڑلڑ کر تھک گئے۔ بڑی چیخ کسی بھی ایک سُر کے الگ پہچانے بغیر رُک گئی اور قطعے یا Passage کا اختتام سسکیوں پر ہوا۔

بالکل تبھی دوآن کھڑا ہوا اور کسی سے ایک بھی لفظ کہے بغیر ڈھلان سے نیچے اتر گیا۔ جہاں لہریں چٹانوں سے ٹکراتی تھیں، وہاں اس نے کپڑے اتارے اور سمندر میں اتر گیا۔ جب وہ کم گہرے پانی میں کھڑا ہوا، ہم نے اسے ملمع چڑھے مجسمے کی طرح دیکھا۔ سادگی میں جڑے سنگ مرمر کے ٹکڑے کی لکیریں رات کے اُفق پر نصب تھیں۔

میرچ اس کے پیچھے نیچے چلی گئی۔ اس نے اپنا لباس ایک طرف پھینکا اور ساحل پر کھڑی ہو گئی۔ ان میں سے ایک سمندر میں، دوسرا ساحل پر، وہ دونوں ایک ایسی یادگار تھے جسے صرف نگاہوں سے چھوا اور پیار کیا جا سکتا تھا، جسے آپ چھونے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ ہمارے ماضی کے کیلنڈر سے وقت مٹایا جا چکا تھا۔ ہم میں سے ہر کسی کے جسم یوں جیسے جسم کی قید سے آزاد، ماضی اور

مستقبل کے بوجھ سے آزاد تھے۔

محمت نے خاموشی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی کی، ''مجھسے کبھی بھی اتنے حقیقی، اتنے خواب جیسے نہیں رہے!''

اس نے فواد، حسن اور میرے ہاتھ تھام لیے۔ ایک التجائیہ نگاہ کے ساتھ جس سے گریز ناممکن تھا، وہ ہمیں کھینچ کر نیچے ساحل پر لے گیا۔ ہم بھی پوری طرح عریاں ملمع شدہ پانی میں تھے۔ ہم تمام چھے کے جسم Phosphorescent تھے۔ ہمارے بال، ہمارے چہرے، ہمارے ناخنوں تک ہمارے جسم کا ہر حصہ ان جھلملاتے پانیوں میں ملمع سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے الگ بتانا ناممکن تھا۔

گھنٹوں بعد، جب چاند مزید مغرب کی جانب چلا گیا، ہم چھے کھاڑی کو گھیرنے والی چٹانوں کے سرے پر بیٹھ گئے۔ ہم اس رات کا حصہ تھے، چٹانوں اور سمندر کا۔ ہم تاریکی تھے اور تاریکی میں بہتی ہوئی زرد روشنی بھی۔

اور صرف پانی کی چھپ چھپ ہی سنی جا سکتی تھی۔ شہنائی کی آواز رک چکی تھی۔ وہ آواز، پانیوں کی گنگناہٹ کی طرح، کسی قدر ہماری بازگشت تھی۔ زیادہ تر ہم ان تنہا ساحلوں پر شہنائی کی بازگشت تھے۔ ان ساحلوں نے ہمیں اٹھایا، ہمیں انار کے رنگوں کی اطلس میں لپیٹا اور پورے چاند کی رات ہمیں 9 ملمع شدہ لفظوں میں کندہ کر دیا:

''موت اب ایک شکاری ہے
اور زندگی ایک غزال۔''

میں نے کچن کے دروازے کی آہستہ سے اندر باہر جھولنے کی آواز سنی۔ میں ہماری کہانی کہتے رک گئی اور سنا۔ مجھے دروازے کی چیخنی کا تذکرہ قادر سے کرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا، جو اپنے مسئلوں میں گم تھا۔

اب وہ دروازہ اپنی چیخنی کے ساتھ جنوب کی ہوا میں بج رہا ہے۔ جو کچھ بھی میں بتانے کی کوشش کر رہی ہوں، یہ اس میں دخل دے رہا ہے۔

جب قادر آئے گا تو میں اس سے کہوں گی۔ میرے جانے کے بعد وہ دروازے کی مرمت

کر دے گا۔

میرے جانے کے بعد......

میرا خیال تھا کہ میرا قیام کبھی ختم نہ ہوگا، میرا وقت کبھی ختم نہ ہوگا کہ وہ جو جا چکے تھے ان کی کہانی کہہ کر میں انہیں ابد تک زندہ رکھوں گی۔ خوش قسمتی سے محمت کی لامتناہی کی علامت اب بھی ریت پر موجود ہے۔ وہ اب بھی وہاں ہے۔

میرے جانے کے بعد......

یہ جاننے کے باوجود کہ مجھے چند دنوں میں، چند گھنٹوں میں چلے جانا تھا، یہ کہ مجھے جلد یا بدیر جانا تھا، میں نے مزاحمت کی صورت کی طرح کہانی کہنے میں پناہ لی۔ بہار کے انجام کے جو دھوپ بھرے دن باقی تھے، ان میں یوں تھا جیسے بادل جو بے حد قریب تھے کبھی بارش نہ برسائیں گے۔

میں نے کھڑکیوں پر برستی بڑی بڑی بوندوں کی آواز سنی۔

مجھے علم تھا کہ اگر لہریں نہیں تو بارش، جلد یا بدیر ہمارے نام، وہ لکیریں جو ہم نے کھینچیں تھیں، چیزوں جو ہم نے لکھی تھیں، مٹا دے گی، جو سمندر کی ابھرتی لہریں بہت سی راتوں سے مکمل طور پر مٹانے کے قابل نہ ہو پائی تھیں۔ یہ کہ ایک بالکل نیا موسم ان دنوں کو ڈھانپ لے گا جو ہم نے جیے تھے۔ لیکن میں نے اس کا یقین نہ کیا تھا، یوں جیسے یہ منظر مجھ سے بہت دُور تھا۔

بارش میں تیزی آگئی ہے۔ مٹی کے تیل کا لیمپ کھڑکی کے پیچھے رکھ کر میں نے نیچے سمندر کی طرف دیکھا۔ پانی کی سطح پر تیز روشنیاں جھلملا رہی ہیں۔ میں نے ابلتے ہوئے پانی سے بھری ہنڈیا کی طرح لہروں کو جھاگ اڑاتے دیکھا۔ جھاگ رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔ اور لہریں، ان کے منہ ہر اس چیز کو نگلنے کے لیے تیار، جو بارش اپنے ساتھ لاتی ہے......

پانی کھڑکیوں سے بہ کر اندر آرہا تھا، بجلی کی چمک نے میری آنکھیں چندھیا دیں اور سمندر لمحہ بھر کو غائب ہوگیا۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتی ہوں۔ کوئلے سی سیاہ رات۔ کمرے میں، مدھم روشنی، جو کچھ میں لکھ چکی ہوں، اسے مبہم طور پر روشن کرتی ہے۔ دیواروں پر، بڑے بڑے سائے۔ آتش دان میں، شعلوں کی چنگاریاں، جلد ہی راکھ بننے والی جلانے کی لکڑی، نارنجی ہو چکی ہے۔ دبی دبی چرچراہٹ۔ یوں لگتا ہے جیسے کھڑکیوں سے آنے والی کراہیں، چیخیں میرے کانوں کو بھر رہی ہیں،

جن کے مخالف بارش بڑھ بڑھ کر تازیانے لگاتی ہے...... دیوانہ وار برستی بارش آتش دان کی لکڑیوں کی چر چراہٹ پر غلبہ پا لیتی ہے۔

یوں ہے جیسے میں دوبارہ کبھی ان ساحلوں کو نہ دیکھوں گی۔ یوں جیسے بحیرۂ روم کے علاقے کی یہ لگا تار بارشیں ان ساحلوں کو بھی گھسیٹ لے جائیں گی اور انہیں دوسرے سمندروں میں بہا دیں گی۔ میں اس سوچ پر ہل گئی ہوں۔ میرے ذہن میں قادر آتا ہے۔ وہ اس موسم میں یہاں کیسے لوٹ پائے گا؟ پہلے تو، مجھے حیرت ہے کہ وہ پہاڑ کے کنارے اس دُور افتادہ گاؤں، خدیجہ اور ان تین بچوں کے ساتھ پہنچ بھی پایا تھا یا نہیں۔ شاید انہوں نے درخت تلے پناہ لے لی ہو، یا کسی بڑی چٹان کی کسی کھوہ میں۔ شاید قادر دیر گزری واپس آ بھی چکا ہو۔ ہوسکتا ہے وہ یہیں ہو، تعمیراتی جگہ کے قریب۔ اگر ایسا ہوتا تو میں نے اس کی سیٹی کی آواز ضرور سنی ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور کسی نہ کسی طرح مجھے بتا دیتا کہ وہ واپس لوٹ چکا تھا۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ کوئی بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ دو مزدور جو تعمیراتی جگہ پر اس رات سو رہے ہیں، وہ اس بارش میں اپنی ناک تک باہر نہیں نکال پائیں گے۔ وہ بھی یہاں نہیں ہیں۔ یہاں صرف بارش کی ٹپ ٹپ کی آواز ہے اور جھاگ اڑاتی لہروں کی ساحل سے اور چٹانوں سے ٹکرانے کی آواز، متواتر گرجتی آوازوں کے ساتھ، دُور متواتر چمکتی بجلی کے کوندے سے روشن۔

کچن کا دروازہ تیز ہوا سے کھلتا ہے۔ آپ جانتے ہیں، یہ کھلا۔ بارش اندر آتی ہے۔ یہ اندر آئی۔ کیا وہ بارش ہے یا رات کا بھیگا پرندہ؟ کاش مجھے معلوم ہوتا، آہ، کاش مجھے معلوم ہوتا!

رات کا بھیگا پرندہ......

❄❄❄

IV

دیکھو، پرندہ جس کا تم نے تذکرہ کیا ہے
اب جا چکا ہے، آہستہ آہستہ پسپا ہوتے ہوئے

''سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے اسے ہونا تھا، میم۔''

جس لمحے مجھے بالکل توقع نہ تھی، میں نے دوبارہ اس نیلی آنکھوں سنہری بالوں والے نوجوان کو دیکھا جس سے میں ایک شام موٹل کی بار میں ملی تھی اور جس کے ساتھ سمندر کے رُخ پر اس کے براؤن بالوں والے دوست کے ساتھ بیٹھ کر میں نے بات کی تھی۔ اس نے مجھ سے دوبارہ وہی بات کی تھی، وہی بات، بشمول ''میم''۔

وہاں، بحیرۂ روم کے ساحل پر، موٹل میں، جہاں میں تھی۔

ساری رات بارش برستی رہی۔ بارش کے شور کے درمیان جس کمرے میں مَیں سوئی، میں ساری رات نوین کی آواز سنتی رہی، جو اب مجھے بہت مانوس لگتی تھی۔

جب دن نکل رہا تھا، میں اٹھ بیٹھی۔ بارش اب بھی کھڑکیوں اور سمندر پر برس رہی تھی۔ میں کمرے میں ٹہل رہی تھی، یہ فیصلہ کرنے کے ناقابل کہ اس موسم میں کیا کرنا چاہیے۔ اس دوران میں اپنی نوٹ بک پر وہ سب چیزیں بھی منتقل کرنا چاہتی تھی جو اس مانوس آواز (جس کی مالکہ کو ہم

نوین کہتے ہیں) نے مجھے رات بھر بتائی تھیں لیکن میں ایسا نہ کر پائی۔ اس لیے کہ میں خود نوین نہیں ہوں اور کیوں کہ میرا تخیل اتنا دُور تک نہیں پہنچ سکتا جتنا کہ اُس کا۔ یوں بھی خوابوں کو بعض اوقات بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاسکتا ہے، اس سے کہیں آگے جیسا ان کو دیکھا گیا۔ بعض اوقات جب ہم جاگتے ہیں، سب کچھ، ہر تفصیل بے حد واضح ہوتی لیکن کسی طور آپ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر پاتے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ بیشتر اوقات، خواب بھول جاتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس معاملے میں مَیں بھول گئی تھی۔

میں خود سے کہہ رہی تھی کہ جب میں شہر واپس جاؤں گی...... کیوں کہ مجھے واپس جانا ہے، میری چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں...... میں انہیں دوبارہ تلاش کروں گی۔ میں خود اپنے آپ سے کہہ رہی تھی کہ میں ان کے بارے میں سوچوں گی، ان کی آوازوں کو دوبارہ شکل دوں گی، ان کے چہروں کو، ان ساحلوں، ہر چیز کو۔ رات کا بھیگا پرندہ، اس کا اسرار...... یہ بالکل وہی مقام تھا کہ نوین سمجھ جاتی، وہ بالکل خاموش ہوگئی۔ میں نے دوبارہ اس کا چہرہ دیکھا نہ ہی آواز سنی۔ لیکن میں ایک عجیب سحر کے اثر میں تھی، جس کا منبع پہچانا نہ جاسکا۔ وہ سب کچھ جو میں نے لحہ بہ لحہ دیکھا یا جو میں نے سوچا کہ میں نے دنوں تک دیکھا تھا، میرے اندرونی مشاہدات، وہ سب اب بظاہر مجھے دیکھ رہے ہیں۔ جہاں تک بارشوں کی بات ہے، وہ ابھی جاری ہیں۔

چاروں جانب کھڑکیوں والے ڈائننگ ہال میں، میں سمجھ گئی کہ میں نے خود کو ایک حبس زدہ گرم، روشن جگہ چھوڑ دیا تھا۔ مجھے مزید نہ دیکھا جا رہا تھا۔ میری نگرانی نہ کی جا رہی تھی۔ مجھے یہ عجیب لگا۔ میں بے حد، بے حد اکیلی تھی۔ میرا ان ساحلوں پر، اس موٹل میں ہونا بے معنی دکھائی دیا۔ باقی سب، رفتہ رفتہ اسے خالی کرتے ہوئے جا چکے تھے۔ میرے آس پاس، میرے قریب کوئی نہیں ہے۔ میرے اندر بھی۔ میرے اندر ذرا سا شور بھی نہیں ہے۔ میں خلا ہوں، خالی۔ صرف یوسف، شاید......
جب میں ڈائننگ ہال میں آ رہی تھی۔ (یقیناً میں اتنے سے فاصلے پر جانے میں ہی بھیگ گئی تھی)۔

مجھے وہ سیڑھیوں کے نیچے ملا، وہیں میز پر، دوبارہ مسلسل ٹائپ رائٹر کے بٹن دباتے ہوئے۔ اس نے اپنا سر نہیں اٹھایا۔ اس نے مجھے دیکھا تک نہیں۔ اجاڑ سنسان گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ لیکن ساری رات نوین نے مجھے بتایا تھا ان ملمع

شدہ مجسموں کے بارے میں جو گویا کسی دوسرے زمانے کے ثبوت کے طور پر ان ساحلوں پر قطار میں رکھے تھے۔ وہاں ضرور چھپے ہوں گے۔ وہ کہاں ہیں؟

کوئی نشان نہیں ہے۔ (ان لوگوں نے ہر چیز میں مبالغہ آرائی کی، بہر حال......) مجھے اپنے کمرے میں واپس جانا، اپنا سامان باندھنا اور چلے جانا ہوگا۔

مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں بے مچھلی جھیل کے کنارے کتنی ہی دیر بیٹھی رہوں، میں ایک بھی پکڑنے کے قابل نہیں ہو پاؤں گی۔ میں یہ کہتی ہوں لیکن میں نے کچھ دیر بعد اس جھیل کی تہ میں حرکات محسوس کی تھیں۔ زندگی کی آواز۔ فرض کرو کہ یہاں ایک جھیل ہو اور یہ کہ اس میں زندگی کے آثار نہ ہوں، کیا یہ ممکن ہے؟

اس میز کے پاس جہاں میں بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی، میں نے اس لمحے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے نوجوان کو دیکھا ضرور تھا۔ (وہ محمت سے کس قدر مشابہ تھا!) اس مرتبہ وہ اکیلا تھا۔ اس کا بھورے بالوں والا دوست اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ جدا کیوں ہوئے، مجھے حیرت ہے؟ یہ والا واپس کیوں آیا؟ اب کس بارے میں متجسس ہے؟ اچھا، کیا وہ اپنی سیڑھی آسمان تک لگا کر اس پر چڑھ نہیں گیا تھا، کیا وہ چلا نہیں گیا تھا؟ (نہیں، وہ محمت تھا جسے نوین نے بیان کیا تھا)۔

میں نے یہ ساری باتیں اپنے آپ سے پوچھیں۔ جہاں تک اس کی بات ہے، اس نے اجازت چاہی اور کرسی گھسیٹ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا ہے۔

وہ کہتا ہے، ''یہ لیں، بارشیں شروع ہو گئیں، چھٹیاں ختم ہوئیں، وہ جو سوئے ہوئے تھے، جاگ اٹھے، جو جاگے ہوئے تھے، سو گئے، گھر جنہوں نے خود کو اپنی تنہا دنیاؤں میں سمیٹ لیا تھا، توڑ دیئے گئے ہیں اور وہ جگہ جو گھر کے طور پر استعمال نہ ہوتی تھی اسے موٹل میں شامل کر لیا گیا جو اس کے قریب تھا، سب کچھ ویسے ہوتا جیسے اسے ہونا ہوتا ہے۔''

سو پھر آخر میں، اجاڑ سنسان گھر موٹل میں شامل کر لیا گیا ہے؟ کسی نے اس بارے میں بات نہیں کی اور میں نے سوچا کہ نیلی آنکھوں سنہری بالوں والا شخص اور اس کا براؤن بالوں والا دوست ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ اکٹھے وقت سے آگے نکل گئے تھے،

وہ وقت کے ایک ہی دورانیے میں بہتے رہے تھے اور ایک ہی سمندروں کو پہنچ گئے تھے۔ میں ٹھیک سے سمجھ نہ پائی، لیکن میرا خیال ہے کہ بھورے بالوں والے نے خود اپنے وقت کے دورانیے میں پیروی کی تھی، وہ اپنے منصوبے کے مطابق شہر لوٹ گیا تھا اور سنہری بالوں نیلی آنکھوں والا دوبارہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں یہاں آیا تھا جیسے وہ بھلا چکا تھا اور اسے ہر صورت تلاش کرنا چاہتا تھا۔ (کیوں نہیں، شاید وہ دونوں ساتھ والے گھر کو موٹل میں شامل کرنے کے منصوبے پر متفق نہیں ہو پائے تھے)۔ لیکن سنہری بالوں نیلی آنکھوں والا اس بارے میں زیادہ متفکر دکھائی نہیں دیتا۔

''یہاں ہمیشہ کچھ ایسا ہے جو آپ بھولتے ہیں اور پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر آپ واپس جا کر اسے تلاش نہیں کرتے تو آپ کو زندگی بھر کے لیے کوئی کمی محسوس ہوتی رہ جاتی ہے۔ آپ کچھ بھی کریں، آپ ''کاش'' سے شروع کرتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ یہ لے کر نہیں چلنا چاہتا، ''کاش''، ''شاید''، ''کیا ہوتا اگر''۔ درحقیقت، میں نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے جو میں بھول جاتا ہوں۔ میں جو جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں کچھ بھول چکا اور پیچھے چھوڑ چکا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ وہ یقیناً پُریقین تھا۔ یہ ڈھونڈتے ہوئے کہ وہ کیا بھول چکا ہے، وہ اسے پالے گا۔

میں نے اپنی چائے ایک طرف رکھ دی۔ ہم نے سفید وائن کی بوتل آرڈر کی۔

یہ ضرور اس لیے تھا کہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ گھر، موٹل میں شامل کیا جا رہا تھا کہ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ میں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ نوین نے مجھے بتایا تھا یا جو میرا خیال تھا کہ میں نے دیکھا تھا، جس کا میں نے مشاہدہ کیا تھا، وہ سب کچھ۔ ایک عورت کی آواز میں بولتے ہوئے جواب میرے لیے بہت مانوس ہو چکی تھی پچھلے کچھ دنوں اور راتوں سے اور تقریباً انہی چہرے کی لکیروں، ہاتھوں کے اشاروں سے بولتے ہوئے میں نے اپنے قریب بیٹھے سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے شخص کو بتانے کی کوشش کی، کھڑکیوں سے دکھائی دیتی بارش کے پیچھے بیٹھے وائن کی چسکیاں لیتے ہوئے، اس سب کچھ کے بارے میں جو واضح طور پر وہاں تھا، خود اس عورت کے بارے میں، ماضی کے بارے میں، بہار کے اختتام پر ان مختصر چھٹیوں کے بارے میں، ان کا اپنے دوستوں سے کہنا، ''ہمارا یہاں سے جذباتی تعلق ہے''۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہم جہاں کہیں بھی جائیں گے، ہم یہیں ہوں گے۔''

ان کے دیوتا اور دیویاں اور حتیٰ کہ گرم مصالحوں سے لدے کارواں۔

اور جب میں نے وہ سب کچھ ختم کیا جو میں بیان کر سکتی تھی یا جب میں نے سوچا کہ میں ختم کر چکی تھی، میں نے اس سے کہا، ''لیکن اس برساتی رات...... وہ بالکل گزشتہ رات جیسی رات تھی، تم جانتے ہو، تم ضرور اس بارش میں آئے ہو گے...... جب ہوا کھڑکیوں کے کواڑ متواتر بجا رہی تھی، جب پانی چٹانوں، درختوں، کھڑکیوں سے شور سے ٹکرا رہا تھا، میں نے مبہم طور پر کچن کا دروازہ دیکھا، اس چٹخنی کے ساتھ جو ٹھیک سے لگتی نہ تھی اور کسی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔''

نوین اور باقی دوسروں کی طرح مجھے بھی معذور لڑکے کا خیال نہ آیا، جو حقیقتاً وجود رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر گھومتا رہا تھا، میں اس کی دنیا تک اس حد تک رسائی حاصل نہ کر پائی تھی جس طرح میں دوسروں کی دنیا تک رکھ سکی، اگرچہ میں نے دُور فاصلے سے، باہر سے ہر اس چیز کو دیکھ رہی تھی جو نوین نے بیان کی تھی، یا جو میں دیکھ چکی تھی یا بلکہ مجھے محسوس ہوا کہ میں دیکھ چکی تھی۔ اور ہر موقع پر اپنا چہرہ دکھانے کی کوشش کی مگر ہمیشہ جاسوسی پر مامور یوسف نے، اس کی جگہ لے لی اور ان ساحلوں سے اس کا چہرہ مٹا دیا۔ اب جب کہ میں وہ سب بتا چکی ہوں کہ جو اس سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے شخص کو مجھے بتانا تھا، وہ ابہام آہستہ آہستہ واضح ہوتا ہے۔ میں نے پہچانا کہ کچن کے دروازے سے آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوتی شے...... کسی طوفان کی نقیب یا خود طوفان (تباہی) کی طرح...... رات کا بھیگا پرندہ نہ تھی (یا کیا وہ اس پرندے کا ساتھی تھا جو چمنی سے اندر آیا اور آرام کرسی پر مر گیا تھا؟) لیکن خود وہ معذور لڑکا تھا۔ یاد کرتے، بیان کرتے ہوئے، دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے، آپ جانتے ہیں، میں پورے یقین سے جانتی ہوں، یہ وہی تھا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ وہی تھا، جو بارش کی طرح، کسی جھکڑ کی طرح، طوفان کی طرح، تاریک رات میں آیا۔ لیکن مجھے معلوم نہ ہو پایا کہ اس نے گھر میں گھسنے کے بعد کیا کیا نہ ہی مجھے نوین کا ردِعمل معلوم ہے۔ پھر بھی میں پیچھے مڑ کر بار بار دیکھتی رہی، میں اسے جان نہ پائی۔ یہ اس کا سب سے مبہم حصہ ہے جو میں دیکھ پائی ہوں۔

اس نیلی آنکھوں سنہری بالوں والے شخص کے چہرے کی مسکراہٹ ختم ہو چکی ہے۔ ہم نے بے سروپا باتیں کیں۔ روشن رات میں حساسیت کے جذبات، اس کے اور اس کے بھورے بالوں والے دوست کے درمیان پُریقینی کی فضا عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے۔ سنہری بالوں والا شخص اب

تناؤ میں ہے۔ وہ مسکراہٹ اپنی جگہ اب کسی قدر تلخ ہو چکی ہے، اشتعال اور بے اعتنائی کا امتزاج۔
وہ ہمیشہ یہی بات کہتا ہے لیکن وہ اسے ہمیشہ مختلف لہجوں میں کہتا ہے!

''سب کچھ ویسے ہوتا ہے جیسے اسے ہونا چاہیے میم......''

بارش اب بھی کھڑکیوں، ساحل، چٹانوں پر برس رہی ہے۔ وہ برستی ہے، کنیر اور جرنیم کی پتیاں بکھیرتی ہے۔ یوں ہے جیسے اس کی بوچھاڑ میرے اندر برس رہی ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہے: ''میں آپ کو نوین کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ میں آپ کو اس کے تکلیف دہ ماضی کے بارے میں بتا رہی ہوں جو دعویٰ بھی نہ کر پایا جو اس نے برداشت کیا، دوسروں کی زندگیوں کے بارے میں جنہیں کبھی خوشی نہ مل سکی اور ان ساحلوں کے بارے میں جہاں انہوں نے یوں پناہ لی جیسے کسی چھوٹی کشتی میں پناہ لی ہو، ان سب کچھ کے ہو چکنے کے بعد۔ میں آپ کو طلوعِ آفتاب، غروبِ آفتاب، عندلیب کے گیت، کنیروں کے زہریلے ذائقے، قدیم شہر میں جڑے سنگ مرمر کے بارے میں بتا رہی ہوں جسے اب آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا آپ نے یہ سنا؟ برستی بارش جب کہ کمرے کے آتش دان میں راکھ بنتی ہوئی آگ......ٹوٹی ہوئی باڑھ جسے نظر انداز کیا گیا، جس کا بار بار تذکرہ کیا گیا، جسے بار بار چھوا گیا اور اس سے چشم پوشی کی گئی اور پھر ایک بار بھی دوبارہ نہ دیکھا گیا، کچن کا دروازہ جسے نظر انداز کیا گیا اور اس کی دوبارہ مرمت نہ کی گئی...... میں آپ کو نوین کی رفتہ رفتہ بڑھتی تنہائی کے بارے میں بتاتی ہوں، اس کا یادوں میں پناہ لینا، اس تنہائی میں اس کے خواب...... دھندلے تاریک پانیوں میں تیراکی، کسی چھوٹی سی گم شدہ کشتی کی تلاش میں...... میں نے حتیٰ کہ قادر کو اس کے خاندان کے ساتھ دُور دراز پہاڑی گاؤں بھیج دیا۔ میں نے آپ کو ان دھوپ بھرے، نیلے دنوں کے بارے میں بتایا جنہیں نوین نے بچاؤ کی واحد امید کے ساتھ گلے لگا یا تھا۔ اس تنہائی میں، لیمپ کی زرد روشنی میں...... میں کہتی ہوں جہاں تک سورج اور پانی ہے، وہاں تک نیلاہٹ بھی ہوگی۔ دوسری جانب تم بار بار میرے سامنے وہی بات دہراتے ہو......''

(اپنی نوٹ بک میں، میں نے لکھا کہ میں نیلی آنکھوں سنہری بالوں والے سے دوبارہ ملی، لیکن اس بار وہ مجھے بالکل پسند نہ آیا، مجھے وہ نرمی نہ ملی جو مجھے اس روشن رات جب ہم پہلی بار ملے تھے تو دکھائی دی تھی)۔

''کیوں کہ آپ نے بھی اس کا بار بار تذکرہ کرنے کے باوجود اسے نظر انداز کیا۔آپ نے اس پر بالکل زور نہ دیا جو لازمی طور پر دیکھا جانا تھا۔آپ نے اسے گہرائی سے نہ دیکھا جو دیکھنے کی ضرورت تھی۔آپ ہمیشہ ان باتوں سے بھاگتی رہیں۔حتیٰ کہ تب جب آپ مجھے ان بچے لوگوں کے بسر کیے گئے خواب سے دنوں کو سنا رہی تھیں، آپ نے دونوں گھروں کو الگ کرنے والی ٹوٹی ہوئی باڑھ کو نظر انداز کر دیا، اگرچہ آپ نے اس کا تذکرہ کیا۔مشینوں کے شور کا تذکرہ کرنے کے باوجود جو دُور سے سنائی دیتا تھا، آپ نے انہیں نظر انداز کیا، ہتھوڑے کی طرح بجتا ہوا شور۔آپ کبھی ان کے قریب نہ گئیں۔آپ نے تذکرہ کرنے کے باوجود انہیں نظر انداز کیا، پلے بوائے گرلز جو نوین کو گھر کھولنے پر فرش پر بکھری ملیں، ان کی صورتِ حال، نوین کے کپڑوں کی صورتِ حال۔آپ معذور لڑکے سے ہمیشہ فاصلے پر رہیں، جو نوین کی نگاہوں کے سامنے آتا اور غائب ہوتا رہا...... آپ نے اسے رات کا پرندہ کہا، آپ اب بھی اسے رات کے پرندے کے طور پر بیان کرنے پر مصر ہیں، باوجود اس حقیقت کے کہ اب آپ جانتی ہیں کہ وہ کون تھا...... آپ ...... بالکل دوسروں کی طرح...... آپ نے بھی اس معذور لڑکے کو وہ توجہ نہ دی جو آپ نے نوین کو دی، اس تکلیف کو جو اس نے اپنے بیٹے کی وجہ سے محسوس کی جسے وہ نوجوانی کی عمر میں کھو چکی تھی، وہ حساسیت جو وہ پانی کے اس والو کے لیے محسوس کرتی تھی، جسے بند کرنا بھولا نہ گیا تھا، اس کے سابقہ شوہر سے متعلقہ اس کی خوشیوں اور غموں کو، اس کے دوستوں، اس کے بھائی کو، دوسروں کی خوشی کی داخلی تلاش کو، ان آنسوؤں کو جو ان نظموں اور گیتوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔نوین نے اس سے چشم پوشی کی۔آپ نے بھی اس کو اہمیت نہ دی۔آپ نے بھی وہی کچھ کیا۔آپ نے صرف وہ دیکھا جو آپ کو دکھایا گیا، اس حد تک جو آپ کو دکھایا گیا۔آپ نے صرف اس راستے پر چلیں جو آپ کے سامنے کھلا تھا۔آپ نے اس برساتی رات اچانک اندر داخل ہوتے معذور لڑکے کی بنیاد پر سب کچھ خود ہی ترتیب دے لیا...... کل جیسی ایک رات...... لیکن ایک خاص آغاز کے باعث، جو کچھ ہوا، وہ جیسے ہونا چاہیے تھا، آپ نے چھوڑ دیا!''

وہ لمحہ تھا جب بارش میں اچانک کمی آئی اور وہ اپنے پیچھے ہلکی سی بوندا باندی چھوڑتے ہوئے تھم گئی۔بادل آہستہ آہستہ بکھر رہے تھے، سورج اپنے زرد چہرے کے ساتھ بادلوں کے پیچھے سے، یوں جیسے اپنے سر پر سے پانی جھٹکتے ہوئے نمودار ہو رہا تھا۔

''جو کچھ حقیقت میں ہوا، میں بتا نہیں سکتی۔ حقیقت میں میری آنکھوں کے سامنے سب کچھ بہت واضح ہے۔ میں عملی طور پر ان کے ساتھ جی رہی تھی۔ میں خدیجہ، قادر، یوسف حتیٰ کہ عثمان اور شدمان کے ساتھ بھی رہی جنہوں نے بسکٹوں کو چورا چورا کر دیا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ کچھ دیر پہلے، مجھے دوبارہ یوسف ملا، اب تین یا پانچ برس کا، اب کسی چیز پر جھکے ہوئے، وہی پرانا ٹائپ رائٹر جس کی اسے اس قدر نگرانی کے بعد ملکیت مل گئی تھی؟ تب میں نے مکمل طور پر جو ہم جیسے تھے اور جو ہم جیتے رہے تھے اس کی حقیقت پر مکمل طور پر یقین کیا...... شاید وہ جو میں بظاہر جیسی تھی۔ بارش کسی سیلاب کی طرح برس رہی تھی۔ میں نے دوآن، میرچ، محمت، فواد اور بہت سے دوسروں، ان جیسے دوسروں، ان سب کو جانا۔ حتیٰ کہ مزدور...... ہاں، فاصلے سے...... کیوں کہ وہ موٹل کی دیواریں مکمل کر کے جا چکے تھے...... لیکن میں ان کے ساتھ زندہ رہی۔ اگر چہ کسی طور مجھے اس معذور لڑکے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا، جو اچانک داخل ہوا تھا، اپنا ہاتھ نوین کی طرف بڑھایا تھا، کھڑکیوں پر برستی بارش کی طرح اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو، جو غالباً کسی بند جگہ قید ہونے جا رہا تھا چاہے اپنی مرضی سے یا نہیں، وہ اندر داخل ہوا، اپنے پیچھے ایک گہرا داغ چھوڑتے ہوئے آرام کرسی پر گرنے اور مر جانے کے لیے...... اور اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا...... ایسا کیا تھا جو ہوا، جو ایسا ہی ہونا تھا......''

نیلی آنکھوں سنہری بالوں والے نوجوان نے اپنا چہرہ کھڑکی کی جانب موڑ لیا۔ سورج نے اپنے بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے، پانی کے قطرے یہاں وہاں بکھرائے۔ ساحل پر، چٹانوں پر...... ان چٹانوں کے کناروں پر، نیم عریاں نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان آدمی بیٹھے تھے۔ شاید ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ شاید وہ حال ہی میں، اسی صبح موٹل آئے تھے۔ جہاں کھاڑی کا تنگ ساحل اور چٹانیں ملتی تھیں، ان دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ ہم وہاں نہیں ہیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ فطرت بھی وہاں نہیں ہے۔ گرم ہوا، گیلی ریت بھی وہاں نہیں ہے۔ صبح کی ٹھنڈک جو بارش کے بعد ہڈیوں تک کو ٹھٹھراتی ہے، وہاں نہیں ہے۔ صرف وہ ہیں...... لامحدود آزادی!...... وہاں ان کے اور اُن بادلوں کے پیچھے سے اپنا زرد چہرہ دکھاتے سورج کے جنہیں اس نے زبردستی جدا کیا ہے اور کوئی نہیں ہے...... اُن کا وصل، ایک ایسی دنیا میں جہاں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے، وہ تنہا اکیلا جوڑا اس دنیا کو نئے انسانوں سے بھرنے کا امیدوار ہے۔ لیکن اس

راستے کے پار چٹانوں میں تھوڑا آگے، سیاہ شلوار پہنے ایک ٹین ایجر ہے۔ اس کے لیے بھی اس دنیا میں اس جوڑے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ نہ یہ موٹل نہ ہم، جو کھڑکی کے پیچھے حقیقت اور خواب میں آ اور جا رہے ہیں، نہ یوسف جو اپنے ٹائپ رائٹر کا شوق کھو چکا ہے، نہ ویٹرز، نہ متلاطم موجیں...... ٹین ایجر اس لڑکی اور لڑکے کو یوں جیسے مسحور دیکھ رہا ہے، حتیٰ کہ رات بھر بارش اور طوفان سے لڑنے کے بعد تھکن زدہ، کھلے سمندر سے واپس آتی مچھیروں کی کشتی کی آواز بھی اس ٹین ایجر کی اس ایک دوسرے میں گم جوڑے پر جمی نگاہ میں مخل نہ ہو پائی۔

ہم سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے نوجوان کے ساتھ موٹل کے باغ میں گئے۔ کیروں سے اٹھتی ایک زہر بھری بھیگی بو میرے نتھنوں کو جلاتی ہے۔ اوپر سے، گاڑی کے پیچھے پہاڑیوں سے، اپنے خیموں اور چیزوں کے ساتھ ایک ہجوم نیچے آرہا ہے۔ اونٹوں، گدھوں اور بچوں کے ساتھ ایک رنگارنگ ہجوم۔ وہ ساحل کی جانب اترے۔ سرما کی نقل مکانی شروع ہوگئی ہے۔

کچھ دیر پہلے میں نے تنگ ساحل پر موجود جوڑے سے اپنی نگاہ ہٹائی۔ اب بار بار پلکیں جھپکتے ہوئے میں سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں کہ پہاڑیوں سے نیچے ساحلوں پر اترتا یہ ہجوم حقیقی ہے یا نہیں۔

سنہری بالوں نیلی آنکھوں والا نوجوان کہتا ہے، ''ہم بھاگتے ہیں۔ ہم مسلسل دور بھاگتے ہیں۔ یوں ہے جیسے نقل مکانیاں، نئی دنیا کی جانب آنکھیں کھول کر دیکھتے چٹانوں پر اترتے ٹین ایجر حقیقت نہیں ہیں...... صرف ہم۔ صرف ہماری دنیا۔ ہماری دنیا کے مصائب، ہم آہنگی، دوستیاں، محبتیں جو ہم آپس میں تلاش نہیں کر پاتے، لیکن کسی وجہ سے بھی ہمیں ہمیشہ یقین ہے کہ ہم تلاش کر سکتے، کسی سیلاب کے دوران ایک دوسرے کو گلے لگاتے لوگوں کی طرح...... جب ہم ساحلوں کا تذکرہ کرتے ہیں...... اور کسی وجہ سے خاص طور پر بحیرۂ روم کا...... صرف یہی چیزیں...... ٹوٹے ہوئے شیشے کے کنارے پر نیلاہٹ...... یہ شکایت کا رنگ ہے۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا؟ ٹوٹے ہوئے شیشے کی نیلاہٹ...... تقریباً ایک غیر واضح بنیاد کی تباہی اور شکایتیں......''

''شکایتیں، ہاں۔ لیکن آپ ان لوگوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے جو شہروں میں قتل عام اور گھٹن کا سبب ہیں۔ چاہت، جو وہ بھی دھوپ بھرے ساحلوں کے لیے رکھتے ہیں، ساحلوں پر لمبے

بھر کے لیے آرام کی خاطر۔ یہ بہاس......"

میں ایسا کہتی ہوں، میری نگاہیں زمین پر جمی ہوئی ہیں، اس جگہ جہاں میری نگاہیں جمی ہوئی ہیں، جرنیم کے پاس، مصنوعی رنگین پتھروں سے بنی بارش میں دھلی اینٹوں پر کئی جگہ تارکول کے نشان ہیں۔ ان جگہوں پر، آپ دیکھتے ہیں...... بدقسمتی سے سرخ جرنیم کی پتیوں کے درمیان نہیں...... میں اچانک ڈائنامائٹ کے دھماکے سے معذور لڑکے کو اس سے کہیں زیادہ واضح طور پر دیکھتی ہوں، جتنا کہ میں تب تک دیکھ پائی تھی۔ نوین والے معذور لڑکے کی طرح، آدھا حاضر، آدھا غیر حاضر، غیر واضح نہیں: جو ایک شام دھند لکے میں پروپین کے ٹینک اوپر لایا تھا یا اس طرح جب اس نے کھردری آواز، خمیدہ ٹیڑھے چہرے والے معذور کو ایک دوپہر کے وقت اپنے مین ڈور پر کھڑے اسے ایک نیلی گرام پکڑاتے دیکھا تھا یا وہ لمحہ جب اس نے ایک گنجے سر والے کو اوپر راستے سے گزرتے دیکھا تھا، پتھروں کی دیوار کے پیچھے سے، جب وہ ساحل پر سیر کے بعد واپس آ رہی تھی۔ میں اسے بالکل واضح طور پر دیکھتی ہوں۔ میں نے اس کی پوری وضاحت کے ساتھ وہ جذبہ دیکھا، وہ تمنا جو بے پناہ طور پر سیاہ شلوار والے ٹین ایجر کے چہرے سے عیاں تھی، جو چٹانوں پر بیٹھا، نیچے ساحل پر موجود اس ایک دوسرے میں مگن جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ دوبارہ بہت مختصر لمحے کو......

جیسے ہی سنہری بالوں نیلی آنکھوں والا نوجوان کہتا ہے، "ٹوٹے ہوئے شیشے کی نیلاہٹ"، مجھے تارکول والے حصے پر رفتہ رفتہ چوڑا ہوتا ہوا سیاہ آنکھوں والے لڑکے کا امیج دکھائی دیتا ہے، قریبی گھر کے نیچے، لکڑی کے گودام کے دروازے پر۔ وہاں، وہ اندر اندھیرے میں نوین کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نوجوان نوین ہے جو اپنا نہانے کا لباس تبدیل کر رہی ہے۔ میں چھے سال کے بچے کو دروازے کی درز سے اس نوجوان نوین کو دیکھتے پاتی ہوں...... پھر میں اس بچے کی بہت سی تصویریں دیکھتی ہوں۔ بالکل واضح، دن کی روشنی میں کھینچی گئی، ہر تفصیل کے ساتھ، اس کے دل کی دھڑکن تک کے ساتھ۔ سیاہ آنکھوں والے لڑکے، جو بڑے ہوتے ہیں، مہینوں برسوں میں بڑھتے جاتے ہیں...... وہ ان جگہوں کو چھوتا ہے جنہیں نوین نے چھوا تھا، ٹیرس کے لکڑی کے جنگلے کو۔ وہ ان جگہوں سے نوین کے پیروں کے نشانات کو چومتے ہوئے گزرتا ہے جہاں سے وہ گزری تھی۔ دوبارہ زیادہ گہرائیوں میں غوطہ لگاتے ہوئے وہ ان پانیوں میں غوطہ لگاتا ہے جہاں نوین نے تیراکی

کی تھی۔ وہ ان گہرائیوں میں بڑھتا پھلتا پھولتا ہے۔ وہ نوین کی کپڑوں کی الماری سے چپکے سے چرائے گئے کپڑوں کو اپنے ساتھ لگاتا اور چومتا ہے، وہ پلے بوائے میگزینوں کی لڑکیوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی نوین بن جاتی ہے۔ ان میں سے ہر کوئی ہر سیاہ آنکھوں والے لڑکے کے لیے نوین بن جاتی ہے۔ وہ خود کو حسن کی جگہ رکھتا ہے...... حسن جو نوین سے قریب ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو، ان چٹانوں پر یا پانی کی گہرائیوں میں۔ ہر سیاہ آنکھوں والا لڑکا حسن بن جاتا ہے۔ پھر وہ دوآن بن جاتا ہے جو اپنی بانہیں نوین کی کمر میں ڈال دیتا ہے، پھر اس کا بھائی فواد بن جاتا ہے جو نوین کا بوسہ لیتا ہے، محمت اور میرچ بن جاتا ہے جو اپنے سر نوین کے کندھے پر ٹکاتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی باری پر۔ میں بالکل واضح طور پر دیکھتی ہوں۔ میں اسے ہر لمحے نوین کو دیکھتے ہوئے، ہر گوشے سے، حتیٰ کہ قادر کے علم میں بھی لائے بغیر دیکھتے دیکھتی ہوں، قادر کے علم میں لائے بغیر جو اس لفظ کے ہر معنی میں اس کا غلام ہے۔ اپنے سب سے بڑے شوق کو خود اپنے تک رکھتے ہوئے، جب کہ اس کی آنکھیں ہر لمحے نوین پر ہیں...... یوسف کی طرح جواب تیراکی کے لیے آنے والی عورتوں کو دیکھ دیکھ کر سیر ہو چکا ہے، نوین کا، میرچ کا نہیں، نہ ہی اس جوڑے کا پیچھا کر رہا ہے بلکہ ٹائپ رائٹر کے پیچھے ہے، کچھ جس سے وہ واقف نہ تھا، صرف کس مخصوص نکتے یا مقام تک دیکھا جاسکا...... اس تک رسائی کی اپنی مسلسل خواہش کے ساتھ، صرف ایک بار اس پر ہاتھ رکھنے کے لیے، اس کی اس کے بٹن صرف ایک بار دبانے کی خواہش، سفید کاغذ کے ٹکڑوں پر چند نشانات بنانے، ایک جملہ لکھنے کی خواہش...... ایسے شوق کے ساتھ جو اس جیسا ہے یا اس سے کہیں آگے ہے جو اس ٹائپ رائٹر سے قریب ترین ہے، اس کا مسلسل پیچھا کرتے ہوئے...... اور اسی وجہ سے ہم نے خیال کیا وہ یوسف تھا جو نوین کا پیچھا کر رہا تھا......

یوسف آخر اس مشین کو چھونے کے قابل ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں، اس صورت میں، میں نے دیکھا کہ وہ سیاہ آنکھوں والا لڑکا، وہ لڑکا جس نے اس شوق کے لیے اپنی نوجوانی قربان کر دی، نوین کو چھونے کے لیے بے تاب ہے۔ میں پوری وضاحت سے اس کے بچپن کے دنوں سے شروع ہونے والا اس معذور لڑکے کا شوق دیکھتی ہوں۔ اتنی وضاحت سے جو وہاں ہے، جیسا میں نے جیا یا اپنی چھٹیوں میں جیا، جس میں نوین زندہ رہی یا ان ساحلوں پر یوں لگا کہ وہ زندہ رہی، کہ کیسے

وہاں لوگ تھے...... سنہری بالوں نیلی آنکھوں والا نوجوان...... ہماری زندگیوں میں آتا اور جاتا کسی ٹیپ کے مصرعے کی طرح، جو وجود رکھتا ہے اور جو تصور کیا گیا ہے، اس کے درمیان پھنسا ہوا۔ وہی لڑکا، ہر موقع پر جب وہ سوچ سکتا ہے کہ کوئی اسے نہیں روک سکتا، ان مواقع کو دیکھنے سے، ان لمحات کو، وہ ایک ممنوعہ کھانے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یا اس آگ کی جانب جسے وہ ابھی نہیں جانتا کہ اسے جلا دے گی۔ وہ اس تک پہنچتا ہے۔ اور پھر آخر کار وہ اس دروازے سے داخل ہوتا ہے جو اسے نیم وا ملتا ہے، ایک ایسے موقع پر جس کی اسے عرصے سے خواہش یا توقع تھی۔ بارش اور ہوا کے ساتھ وہ اندر داخل ہوتا ہے۔ نوین مٹی کے تیل کے لیمپ کی زرد روشنی میں کہانی کہتے رکتی ہے کہ اس کے اور ان کے ساتھ کیا بیتی۔ اسے رکنا پڑا۔ وہ مڑتی ہے۔ وہ معذور لڑکے کو دروازے سے داخل ہوتے دیکھتی ہے جو اس کے خیال میں ہوا نے کھولا تھا۔ آپ جانتے ہیں، کوئی ایسا جس کا چہرہ مزید مسخ، مزید ڈراؤنا لگتا ہے، اس بھیگی ہوئی نیم روشنی میں اس کی جانب آتا ہوا۔ دیکھو، وہ نوین کی جانب آتا ہے، اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے، کسی قدر جھجکتے ہوئے، کسی قدر بہادرانہ، کسی قدر جذباتی، کسی قدر بھیک مانگتے ہوئے۔ وہ اس کھانے کو چھوئے گا یا آگ کو۔ وہ کھلونا جو اسے دکھایا گیا ہے اور پھر اس سے چھینا جا چکا ہے...... بس۔ چھونا، پہچاننا، جاننا...... بس۔ رکو نوین، چیخو مت، دھکا مت دو! پُرسکون رہو۔ اس کے شوق کو اور ہوا نہ دو، اس کے خوف کو مت بھڑکاؤ...... رکو، سنو، دیکھو۔ یقین کرو۔ یقین کرنے کی کوشش کرو! وہ سب سمجھنے، تسلیم کرنے کی کوشش کرو جو تم نظر انداز کرتی رہی ہو، بالکل اسی طرح، کوشش کرو...... یہ تمہاری ناک کے نیچے سچی حقیقت ہے۔ یہ اٹلس کی چھے بیٹیوں کے ساتھ انجامِ بہاراں کی تقریب سے کہیں زیادہ حقیقی ہے۔ دُور مت بھاگو۔ اسے دھکا مت دو نوین! اسے آنے دو۔ وہ تمہیں صرف چھو کر دیکھے گا۔ دیکھو، وہ تمہاری جانب ایسے بڑھ رہا ہے جیسے سب سے پُرکشش، سب سے زیادہ کھلے ہوئے گلاب کو توڑنا چاہتا ہو، ہمسائے کے باغ کے درخت سے سب سے زیادہ سرخ انار کو۔ اسے دُور دھکا مت دو، بھاگو مت! بالکل جیسے تمہیں قربتوں کی تلاش کی تمنا تھی، انہیں چھونے کی...... برسوں سے...... جیسے تم نے محسوس کیا کہ تم نے ان خوب صورت چیزوں کو قید کر لیا تھا اور خوشی کو جو تم سے چھینی جا چکی ہے، معذور لڑکا جو چاہتا ہے، وہ کچھ اس کی اپنی حقیقت جیسا ہی ہے۔ شاید، بس یہی۔ تمنا۔ برسوں۔ ایک سراب، سب کچھ جو تب ختم ہو جاتا ہے جب آپ اس کے قریب پہنچتے ہیں۔ آپ

جانتے ہیں جب وہ آپ کے اس قدر قریب ہوتا ہے، وہ اسے صرف ایک بار چھونا چاہتا ہے۔ اس کے اس قدر قریب آنا جتنا وہ خواب دیکھتا ہے۔ اور وہ صرف تمہیں چھو لینے کے سوا کیا خواب دیکھ سکتا تھا۔ تمہارے وجود رکھنے کو اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کرنا۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ تم اسے سب سے زیادہ سمجھ سکتی ہو نوین۔ تم، سب سے زیادہ۔ خوف زدہ مت ہو۔ بھاگو مت۔ بالکل جیسے تم اپنی چاہتوں یا تمناؤں سے خوف زدہ نہ تھیں، مت ڈرو۔ بالکل جیسے تم اپنے خوابوں سے دُور نہ بھاگی تھیں، اس مرتبہ بھی مت بھاگو! جلدی مت دکھاؤ، نوین!......تم اسے سب سے زیادہ سمجھ سکتی تھیں۔

نوین، مجھے نہیں سنتی ہے۔

(میں لرز رہی ہوں۔ میں اپنی نوٹ بک میں لکھ چکی ہوں، سنہری بالوں نیلی آنکھوں والا شخص، پہاڑوں سے ساحلوں پر نیچے اترتے رنگا رنگ ہجوم پر نظریں جمائے ہوئے، اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ میں نے سیاہ تارکول کے نشانوں کے بیچ کیا دیکھا تھا)۔

نوین ایک سیکنڈ کو بھی مجھے نہیں سنتی۔ اس کی وہ خوف ناک چیخ۔ یا وہ میری چیخ ہے؟ تمام چیخیں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئی ہیں۔ وہ لہروں، چٹانوں، گرج چمک کے درمیان دبی ہوئی ہیں۔ اب بارش، جھکڑ، طوفان، آپ اپنے چہرے کے سامنے اپنا ہاتھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کوئی کسی کو نہیں بتا۔ اور معذور لڑکا...... میرا خیال ہے میں اسے صیحة (قدیم عربی میں اس نام کے معنی ہیں، چیخ) کہوں گی، شاید میں نے پہلے ہی کہہ دیا، ان چیخوں میں، یہ ہنگامہ، اپنی پتنگ، اپنے جہاز، اپنے غبارے یا اپنے پرندے کے لیے، اسے لہروں میں ڈوبنے اور غائب ہونے سے بچانے کے لیے، تاریکی میں غوطہ لگاتا ہے جو اس نے برسوں اپنے خوابوں میں سجایا اور اسے پروان چڑھایا تھا۔

کسی نے کسی کو دوبارہ نہیں دیکھا۔ نوین نے جو آخر میں دیکھا وہ رات کا پرندہ تھا۔ تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے، چٹانوں پر لنگڑا کر چلتے ہوئے۔ اور اسے بھی گھسیٹ کر ندیدی لہروں میں لے جاتے ہوئے......

کوئی بھی دوبارہ کسی کے قریب نہ آیا۔

میں نے ان سب کو اپنی چھٹیوں میں اکٹھے دیکھا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ، میں ان کے بے حد قریب آ گئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ جانتا تھا۔ یوسف نہ خدیجہ...... وہ موٹل میں لانڈری کا کام کرتی

ہے، کمروں کی صفائی کا دھیان رکھتی ہے، جب وہ ہنستی ہے تو اس کے منہ میں سونے کا دانت چمکتا ہے اور وہ یوسف کے جیل میں بنائے گئے دوست کو موٹل نہیں آنے دیتی۔ نہ قادر مجھے جانتا ہے۔ میں ان ساحلوں پر ایک اجنبی کے طور پر آئی، ایک اجنبی کی طرح میں واپس لوٹ جاتی ہوں۔

تارکول کے ٹکڑے سے اپنی نگاہیں بہ مشکل ہٹاتے ہوئے، میں ایک گہرا سانس لیتی ہوں، سو یہ سب یوں تھا، وہ آئے اور چلے گئے......

ہم اپنی نئی جینز کے پائینچے اڑسے ہوئے قادر کے قریب سے گزرے، جو بارش سے گرنے والی جریتیم کی شاخوں کو چن رہا تھا اور انہیں باغ میں دوبارہ لگا رہا تھا۔

''میں کباڑیوں کے انتظار میں تھا۔ معلوم نہیں شاید وہ بارش کی وجہ سے لیٹ ہیں، وہ آئے نہیں۔'' اس نے کہا، ''ہم اس گرتے ہوئے مکان کو گرانے والے ہیں۔ اوز بے نے یہ گھر خرید لیا ہے اور انہیں یہ کافی سستا ملا ہے۔''

سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے نوجوان نے اپنا سر ہلایا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔

''واحد چیز، واحد شخص، جو عارضی نہیں ہے، جو آج غائب نہیں ہوا، وہ یوسف ہے، میں سوچتی ہوں...... دیکھو، وہ موجود ہے...... ہمیشہ اسی ایک شوق کے ساتھ...... اور یقیناً یہ موٹل جہاں ہم رکے تھے، اس میں چھٹیاں گزارنے کے لیے، تم...... مجھے معلوم نہیں، شاید اس لیے کہ تمہیں رکنا پڑا۔ ٹوٹی ہوئی شاخوں والے جریتیم...... ایک پرانا گھر جو جلد ہی بہت شور کے ساتھ گرا دیا جائے گا...... یہاں صرف کنکریٹ حقائق باقی رہ جائیں گے......''

''کیا یہ ختم ہوا؟'' سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے نے کہا۔

(تب، اپنا سامان باندھتے ہوئے میں نے یہ باتیں بھی اپنے نوٹس میں لکھ لیں)۔

''میرا نہیں خیال۔'' میں نے اس سے کہا، اس مرتبہ میری نگاہیں ساحلوں پر مسلسل اترتے خیمے اور چیزیں اٹھائے ہجوم پر تھیں۔

ہر کوئی آتا اور چلا جاتا ہے۔ جو واقعی ختم نہیں ہوتا ہے، وہ گہرا نیلا سمندر، آنکھیں چندھیاتی روشنی، قرمزی غروبِ آفتاب ہیں، جو ہر شے کو خواب اور حقیقت کے درمیان چاقو کی دھار پر رکھے ہوئے ہیں، ساحلوں اور سنگ مرمر کو دھوتی راتوں کی دودھیا روشنی، پھر بارشیں، پھر

بادلوں کو دوبارہ چیرتا سورج، بادل چیر کر مسلسل سامنے آتا اور لوگوں کو گرم ساحلوں پر بلاتا سورج۔

"لیکن ہم دوبارہ نہیں آئیں گے۔" میں نے سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے سے کہا۔ یوں ہے جیسے یہ واحد چیز ہے جسے میں واضح طور پر سمجھ سکتی ہوں: "ہم دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔"

سنہری بالوں نیلی آنکھوں والا نوجوان خاموش ہو گیا۔ وہ زیادہ دیر نہ بولا۔ ہم موٹل کے داخلی دروازے پر پانی کے فوارے کے قریب آئے تھے۔ مین روڈ سے ایک ایک کر کے گاڑیاں گزریں۔ میرے کانوں میں موٹر بائیکس کی سائیں سائیں کی آواز گونجی۔ بالکل تبھی بڑی سی زرد مشین ڈھلانی چڑھائی چڑھتے ہوئے جزیرہ نما کے کونے پر آ گئی۔ اب نیلی آنکھوں سنہری بالوں والے کی آواز، جو دوبارہ اچانک بے حد مخلص، بے حد حساس ہو گئی تھی، ان سائیں سائیں کی آوازوں کے ساتھ مل گئی۔ اس کے چہرے کا وہ برہم، اہانت آمیز تاثر مٹ گیا، اس نے مجھے یہ شعر سنائے:

یہی وقت ہے جب سرد سخت زمین
ساحل کی طرف بہتی ہے
وقت جب زندگی کھو جاتی ہے
پہاڑی وادیوں میں۔
مویشی، ڈرم، خیمہ، تھیلا اور رائفل
مکھن بلونے کی آواز، خانہ بدوشوں کا کام
موت اب ایک شکاری ہے
زندگی ایک غزال
اور ہم ہیں
محبت اور عداوت کی کراس فائر میں
موت کی ایک پکار
اشتعال اور تباہی
اور وہ لمحہ جب سینہ بہ سینہ آتے ہیں

سمندر اور پہاڑ۔

میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں الجھن زدہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اشعار دوآن کے تھے، اگر دوآن کے نہیں تو نوین کے یا حتیٰ کہ میرے، میرے لیے۔ شاید میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ ایسے پہلے باترتیب لفظ تھے جو یوسف ٹائپ رائٹر پر لکھ سکا تھا، لیکن میں جھوٹ کیوں بولتی؟ یہ ایسی بات تھی جو مجھے سب سے کم قائل کرنے والی لگی تھی۔ سب سے زیادہ توقع یہی تھی کہ وہ اشعار میرے تھے، میرے۔

جب سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے نوجوان نے یہ نظم ختم کی...... ہماری نظم...... وہ فاصلے پر چلا گیا، وہ بے حد فاصلے پر اجنبی بن گیا۔ ہماری ناک کے نیچے موجود حقیقتوں جتنی دُوری پر۔

پانی کے فوارے کے سامنے، جو بھیگی سڑک پر مغرب اور مشرق سے آنے والی سنسناہٹوں میں گرا ہوا تھا، مجھے دُور کھینچا جا رہا تھا۔ بالکل خزاں کے پتوں کی طرح، جنہیں خزاں کی ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں۔

اگر میں سنہری بالوں نیلی آنکھوں والے نوجوان کو دوبارہ دیکھ پاتی، میں اسے بتاتی کہ ہم اسے دُور سے دیکھے بغیر جان نہیں سکتے کہ وہ کیا ہے جسے ہونا تھا یا وہ کیسے ہوا۔ لیکن وہ مجھے فوارے کے سامنے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ میں اگرچہ اس جگہ پر تھی لیکن ان سنسناہٹ کی آوازوں نے میرا دھیان بٹا دیا تھا۔ اس مقام پر جہاں کبھی ایک عورت اچانک بس سے اتری تھی، اس فوارے کے سامنے۔

(یہ آخری تحریریں ہیں جو میں نے اپنی نوٹ بک میں لکھیں)۔

☼

اب یہ ساحل جو مجھ سے دُور رہے، میری آنکھوں کے سامنے اچانک لمحے بھر کو آتے اور غائب ہوتے چہرے، میرے کانوں میں متواتر آتی ہوئی آوازیں اور پھر دُور فاصلے پر مدھم ہوتی ہوئیں، ہنسی، سسکیاں یا شہنائی کی وجد آفریں آواز، حتیٰ کہ Tyche کا مجسمہ، حتیٰ کہ الانیا کے انار، اپنی کمروں پر گلابی کمربند باندھے لڑکے، سیاہ شلواریں پہنے اور ریڈ ٹاور یا سرخ مینار، قلوپطرہ، جل پریاں، سب کچھ، جب وہ سب مجھ سے دُور رہا، یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کیا تھا جسے نوین مسلسل خوب صورتی بخشتی اور کئی راتوں تک مجھے بتاتی رہی...... بالکل جیسے مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی،

میں یہ بھی نہیں جانتی کہ اس نے مجھے کیا بتایا، لیکن اب اس سے مزید فرق نہیں پڑتا...... اور رات کے پرندے کو ذہن میں رکھتے ہوئے، چاہے شکاری یا شکار، تمنا کی جستجو میں، ساحل کو چاٹنے والی لہروں کو دماغ میں رکھتے ہوئے، لہروں کے مٹاتے ہوئے قدموں کے نشان، تحریریں، نام، نوین، دوآن، فواد، حسن، میرچ اور ممت کے مختصر ماضی ذہن میں رکھتے ہوئے، اس مختصر تاریخ میں ان کے تعلقات، یقیناً گھروں کے درمیان ٹوٹی ہوئی دیوار کو نہ بھلاتے ہوئے، نیچے تعمیراتی جگہ سے آنے والا ہتھوڑے برسنے کا سا شور، ایک گیت اور کئی گیت Now you're far away۔ عندلیب کے گیتوں کو بھولے بغیر...... خوشی اور غم...... سورج نکلنے پر جنگل کے درختوں سے چھن کر آتی روشنی، نیلے پتوں والے بڑے سے آکاشیا یا کیکر کی زمین کو چھوتی شاخیں، سب کچھ، وہ سب، خزاں کی مسلسل بارشوں کو بھولے بغیر...... اور ایک نوٹ بک، اس نوٹ بک کی تحریریں بھی، جو میرے سامنے رکھی گئی ہیں، میں یہ جاننے کی کوشش کرتی ہوں کہ وہ کیا ہے جو ہونا چاہیے تھا، جو ہونا تھا۔

شہر میں سرد، بے ترتیب، گندے دن، میں نے اپنے سامنے مووی سکرین لگائی۔ اور ایک پروجیکٹر۔ رنگین فلموں کا پروجیکٹر۔ سو یہ ہے، مسلسل روشنی کے جھماکوں میں سفید سکرین پر ایک کے بعد ایک کر کے سامنے آتی رنگین تصویریں۔ دوبارہ:

چڑھائی کے آغاز پر، مسافر بس رکتی ہے۔ ایک عورت نیچے اترتی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹائپ رائٹر، اس کی کمر پر ایک بیگ۔

آسمان گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ سمندر آگے چوڑے ساحل کو آہستہ سے چھوتا ہے۔ دھوپ کی شعاعیں آنکھوں کو چندھیا دینے والی ہیں۔ نیلاہٹ، غروبِ آفتاب پر اناروں کے رنگوں میں ڈھکی چٹانیں، صنوبر کے درخت، بے حد خوب صورت جھلملاتے ساحل، عمودی پہاڑ جو یوں تاثر دیتے ہیں جیسے وہ کہر کے بادل کے پیچھے گم ہیں۔ مہندی کے پودے، پال، کنیر۔ خصوصاً کنیر اور سفید دیوار سے چمٹی ہوئی ایک بڑی سی رھوڈ زفلا وریا بوگن ویلیا کی بیل۔

ایک بڑے سے سر والی چھپکلی۔

دہلیز پر حشرات الارض کے کوکون، کھڑکی کی پھپھوندی۔ پانی کے پمپ کا شور، مٹی کھودتی ہوئی کھدائی کی ایک مشین، جیسے وہ گھر کے قریب آتی ہے اور......

انتظار۔

فطرت کا انتظار، سمندر کا، بارش سے بوجھل آسمان کا، آہستگی سے نرمی سے سانس لیتے ہوئے۔تمنا کے کھنڈرات میں......

مسلسل شمالی پہاڑوں کی جانب اٹھتی ہوئی سمندر کی رطوبت یا نمی۔

وہ لمحہ جب سمندر اور پہاڑ سینہ بہ سینہ آتے ہیں۔

دُور کہیں ایک، چبھتا تکلیف دیتا گیت:

You`re now far away.....

یوں جیسے بارشیں کبھی نہ آتیں۔

❄❄❄

عدالت آغولو، ترکی کی انتہائی معروف ادیبہ ہیں جن کی تحریروں کو نہ صرف قارئین کی ایک بڑی تعداد بلکہ ادبی ناقدین بھی سراہتے ہیں۔ گریجویشن کے بعد وہ ترکی کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے وابستہ ہوگئیں اور ڈرامہ نگاری کے ساتھ ساتھ پروگرام پروڈیوس بھی کرتی رہیں۔ بعد ازاں وہ ناول نگاری کی جانب آئیں اور اس میں اپنا منفرد مقام بنایا۔

''انجامِ بہاراں'' اُن کے 1980ء میں شائع ہونے والے ناول "Yazsonu" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس المناک ناول کا آغاز نوین نامی عورت کے جنوب مغربی ترکی کے بحیرۂ روم کے کنارے ایک قدیم شہر سیدہ (Side) پہنچنے پر ہوتا ہے، جس کا بیٹا گونے کئی برس قبل استنبول یونیورسٹی کے پہلے سال میں ایک سیاسی جھڑپ کے دوران ہلاک ہوگیا تھا۔ یاد رہے کہ ''گونے'' کو اس کے لفظی مطلب ''جنوب'' میں استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ تفصیلات مبہم ہیں لیکن اس ذاتی غم کو 1970ء کی دہائی کے اواخر کے ترکی کے سیاسی حالات کے استعارے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی میں دائیں اور بائیں بازو کی بنیاد پر پُرتشدد رجحانات اپنے عروج پر تھے۔ عدالت آغولو کے تخلیق کردہ کردار زماں و مکاں کی قید سے آزاد دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہو پاتا کہ شعور کی رَو کا سہارا لے کر کہانی بیان کرتی ہوئی عورت خود نوین ہی ہے۔ ان کا یہ منفرد اسلوبِ تحریر ان کے ڈرامہ نگاری کے ہنر کی دین ہے۔ یہ ناول موت اور زندگی کے تضاد، سماج کے پارہ پارہ ہونے کے عمل اور فطرت کے نامیاتی اتحاد کو شدت سے بیان کرتا ہے۔ اس ناول میں جہاں معاشی اور سماجی تفریق کو موضوع بنایا گیا ہے، وہیں اربنائزیشن کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو قارئین کے لیے یہ ناول ترکی کے سیاسی اور سماجی حالات سے مزید واقفیت کا سبب بنے گا۔ ''انجامِ بہاراں'' ایک طرف اردو ادب میں ترجیح کی بنیاد پر اپنا مقام بنائے گا تو دوسری طرف ترک ادب کے زاویوں سے بھی متعارف کروائے گا۔

فرخ سہیل گوئندی